۲۸

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

۹۱

دسمبر ۱۹۶۱ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے ۲۵ روپے

فی پرچہ
تین روپے

ادارہ فروغِ اُردو — لاہور

فہرست

طلوع

افسانے، ڈرامے

نظمیں، غزلیں

مضامین

محمد طفیل ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوع

انسان جو کچھ چاہتا ہے ضروری نہیں کہ وہ ہو بھی جائے۔ قدرت اچھے بُرے سبھی قسم کے کاموں میں روڑے اٹکا سکتی ہے ۔ بے نیاز جو ٹھہری۔ زیادہ محتاط لفظوں میں — ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے ۔

اس عاجز نے ناک چوٹی زور لگایا کہ اب کے لاہور نمبر ہی کو اپنی سعی و کوشش کا حاصل بنا کر، نذر کر دوں مگر یوں ہو نہ سکا۔ اپنی "علالت کی پچھاڑی" کے باوجود میں نے اپنی جان کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی۔ سبھی پاپڑ بیلے، کوچۂ رقیب میں بھی جانا پڑا تو سر کے بل گیا — مگر "بی منزل" دور کھڑی مسکراتی رہیں۔

تاریخ میرا موضوع نہ تھا۔ بیٹھے بٹھائے روگ لگا بیٹھا۔ اب بھگت رہا ہوں اُسے — ادب میں تو یہ ہوتا ہے نا کہ افسانے کا پلاٹ اگر یوں نہ سہی تو نہ سہی، کام چل گیا۔ مضمون پٹڑی سے اُتر گیا ہے تو اُتر جائے، بات رہ جائے گی۔ نظم سمجھ سے بالاتر ہو گئی ہے تو ہو جائے۔ بڑی نظم قرار پا جائے گی — مگر تاریخ کی نزاکتیں ہی اور ہیں۔ اس میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر کوئی شخصیت فلاں سن اور فلاں تاریخ، اللہ کو پیاری ہوئی ہو تو ہم لاکھ کوشش کر لیں۔ اُسے ایک دو دن اِدھر اُدھر نہیں مار سکتے۔

ستم پہ ستم یہ کہ دس بیس، سو پچاس برسوں کی (لاہور کی) تاریخ پیش کرنا ہوتی تو اتنی مشکل پیش نہ آتی۔ ہم نے کام کا آغاز اس وقت سے کر دیا ہے۔ جب سے لاہور کا سراغ ملنے لگتا ہے۔ یعنی کہ جب لاہور لکھور تھا۔ اس عرصہ میں ہزاروں ہی شخصیتیں سامنے آتی ہیں۔ ہزاروں ہی کارنامے انجام پائے۔ سینکڑوں ہی آثار تاریخ کے باب بنے۔ ان سب کی جستجو اور ان کے بارے میں صحیح معلومات، ایک مہم ہے اور اس میں پار اُترنا، ایک معجزہ۔ خدا اگر توفیق دے، تو عجب نہیں کہ اس چودھویں صدی میں، معجزے گنہگاروں سے بھی سرزد ہونے لگیں — شاید کچھ ایسی ہی عادت ہے، مجھے اپنی ولایت کا ابھی سے یقین ہونے لگا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آئندہ پرچہ لاہور نمبر ہی ہو تاکہ روز روز کی معذرتوں کا تو ٹنٹا ختم ہو۔

آپ تو لحاف میں بیٹھ کے مزے سے یہ پرچہ پڑھیں گے۔ مگر آپ کو کیا علم کہ یہ چھوٹا سا پرچہ بھی پیش کرنے کے لیے میرے کیسے کیسے پسینے نہ چھوٹے۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ لاہور نمبر کام کے پھیلاؤ کی وجہ سے، اس ماہ نہ آ سکے گا تو سٹی گم ہو گئی۔ دوستوں کو مدد کے لیے پکارا۔ اپنی بے وقوفی اور مصیبت سے انھیں آگاہ کیا۔ سبھی ہنسے، مگر قلم دوات لے کر بیٹھ گئے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو یہ پرچہ چپ چاپ کیسے آ جاتا۔

مجھے اپنے اس شمارہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہنا۔ جو کچھ لاہور نمبر کے بارے میں کہہ چکا ہوں۔ اُسی سے کچا پن جھلکے ہے ۔

محمد طفیل

جُولی

کرشن چندر

"وہ لوگ جُولی گیکاں کی لاش کو لارہے ہیں۔!"

اولڈ پاٹ کلب کے پانٹوں کے کنارے کھڑے ہوئے مرد اور عورتوں کے جمگھٹے میں کسی نے کہا۔ اور لوگوں کی نظریں دُور سامنے سمندر سے لوٹنے والی دو موٹر کشتیوں پر جم گئیں۔ کنور پاورسنگھ کا چہرہ فق تھا۔ اور اُس نے اپنے دل کی بے چینی کو چھپانے کے لیے دوربین اپنی آنکھوں سے لگا رکھی تھی۔ دُوربین اور ہاتھ نے اُس کے چہرے کو کافی حد تک چھپا رکھا تھا۔ پھر بھی اُس کی چھوٹی باریک کتری ہوئی مونچھوں کے نیچے اُس کے ہونٹ بار بار کانپ اُٹھتے تھے۔ اُس کے قریب راجکماری نرملا اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اور بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس لیے کہ اتنے بڑے جمگھٹے میں بے ہوش ہونے کے لیے جگہ کہاں تھی۔؟

پھر کنور پاورسنگھ نے دوربین اپنے چہرے سے ہٹالی۔ راجکماری نرملا کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔ پھر پلٹ کر کلب کے اندر جانے لگا۔ راجکماری نرملا بھی اپنے بے حد نفیس کٹے ہوئے بالوں کو ہولے ہولے سہلاتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

کچھ لوگوں نے پلٹ کر اُن دونوں کی طرف دیکھا۔ راجکماری نرملا کے حُسن و جمال کا شہرہ دُور دور تک تھا۔ ایسی چھوٹی پیاری سی ناک تھی اُس کی کہ سارے بمبئی میں کسی خوش جمال عورت کے پاس نہ ہوگی۔ اور اُس کی شفاف زیتونی رنگت کے نیچے جیسے پگھلی ہوئی دھوپ بہہ رہی تھی۔

مگر اِس وقت راجکماری بہت اُداس تھی۔ رہ رہ کر اُس کی پیاری کلاسیکی ناک کے باریک سیپی کی طرح نازک نتھنے کسی نامعلوم جذبے سے پھڑک اُٹھتے اور ہیرے کی کیل لرزلرز جاتی۔

۲

یہ سوچ کر کتنی حیرت ہوتی ہے کہ ابھی دو گھنٹے پہلے جولی گیکاں زندہ تھی۔

وہ اور کنور پاورسنگھ دونوں پانٹوں پر کھڑے کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ دھیمے سُروں میں اور کسی

قدر غصّے کے ساتھ مگر شدید سنجیدگی سے وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اور جولی گیبکاں کی چوٹی بار بار کسی لہراتی ہوئی ناگن کی طرح اُس کی پیٹھ اور کولھوں پر لہراتی تھی۔ جولی کلب کی واحد یورپین عورت تھی۔ جس کے بال کٹے ہوئے نہیں تھے۔ اور سب سے لمبے تھے اور سنہرے تھے۔ اور اتنے ملائم کہ دھنکی ہوئی روشنی سے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ جولی کا رنگ بے حد صبیح تھا۔ ہونٹ بھرے ہوئے اور رسیلے۔ اور جب وہ فرانسیسی زبان میں بات کرتی تھی تو اُس کی زبان کی سلاست، اُس کی آنکھوں کی گویائی اور ہاتھوں کی مرصع جنبشیں مل کر ایک ایسا تاثر پیدا کرتی تھیں جس سے بچ نکلنا ناممکن تھا......

اب سے دو گھنٹے قبل کسی کے دل میں یہ خیال آ سکتا تھا کہ جولی یوں مرجائے گی۔ چمکتے ہوئے خوشگوار دن میں نازک پھول کی طرح۔ روشنی دھوپ میں وہ سیاہ و سبز مخملیں جمپر اور گلابی بلاؤز میں کھڑی بانٹوں پر کنور پاور سنگھ سے بات کر رہی تھی۔ وہ لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اور کلب کے ایک ممبر نے جس سے کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ گھڑی دیکھ کر بعد میں بتایا تھا۔ کہ جولی اور پاور دونوں پورے پچیس منٹ تک بانٹوں پر کھڑے بات کرتے رہے تھے۔ پھر جولی غصے میں اپنی چوٹی لہراتی ہوئی کنور پاور سنگھ کا بازو جھٹک کر ایک موٹر لانچ میں بیٹھ کر سمندر میں گھومنے کے لیے چلی گئی تھی۔ اور کنور پاور سنگھ اُسے بلاتا ہی رہ گیا تھا۔

جولی موٹر لانچ کو دُور تک سمندر کے پانیوں میں لے گئی مگر کسی وقت بھی اولڈ پاٹ کلب کا کھلاؤ اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ کشتی کو بہت دُور لے جا کر اُس نے دوربین سے دیکھا۔ تو اُسے اولڈ پاٹ کلب میں سے بہت سے لوگ دوربینیں لگائے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے نظر آئے مگر کنور پاور سنگھ اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کنور پاور سنگھ کی پیٹھ اُس کی طرف تھی۔ اور اُس کے سامنے راجکماری نرملا بیٹھی تھی۔ اور اُسے دیکھتے ہی اُس کے دل کے اندر رُکے ہوئے سارے آنسو اُس کی آنکھوں میں اُبل آئے۔ اور وہ ایک چھلانگ لگا کر موٹر بوٹ پر کھڑی ہو گئی۔ اور دُور کلب کی طرف ہاتھ ہلا کر پانی میں کود گئی۔

اُسے پانی میں کودتے دیکھ کر بہت سے ممبر چونکے۔ اور دوربینیں چھوڑ کر اپنی کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اِدھر اُدھر بے بسی سے دیکھنے کے بعد پھر دوربین اُٹھا کر دُور سمندر کے پانیوں میں دیکھنے لگے۔ جہاں موٹر بوٹ ایک سفید کاغذ کی کشتی کی طرح ڈول رہی تھی۔

وہ چونکا دینے والی کیفیت دم بدم بے تابی میں بڑھتی چلی گئی۔ جب سیکنڈ اور منٹ وقت کے پہیے سے اُترتے چلے گئے۔ اور جولی پانی سے باہر نہ نکلی۔ گھڑی کی آواز کبھی ایسی صاف اور ہولناک نہ تھی۔ اور اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا۔ وقت کی گھڑی کے ساتھ دل کی گھڑی کی دہشت ناک آواز بھی شامل ہوتی جا رہی تھی۔

چند عورتیں چیخ مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ اور سٹوارڈ چرن سنگھ اُسی وقت دو ملازم لے کر دوسری موٹر لانچ لے کر جولی کو بچانے کے لیے بھاگا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اور اب وہ لوگ جولی کی لاش کو موٹر بوٹ میں رکھ کر لا رہے تھے۔

۳

قومیت کے بہت سے اصول ہیں۔ کچھ اچھے ہیں کچھ بُرے بھی ہیں۔ اُن میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ باہر کے لوگوں پر

کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اُصول یہ بھی ہے کہ باہر کی عورتیں کبھی باوفا نہیں ہوتیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم باہر سے آنے والی ہوائی مہک کیوں سونگھتے ہیں۔ اور باہر سے آنے والی بدلیوں کو اپنے وطن میں کیوں برسنے دیتے ہیں۔ ؟

جولی بھی ایک ایسی ہی بدلی تھی۔ رس اور جوانی اور برس کر سیراب کر دینے کی تمنا سے بھری ہوئی۔ جو باہر سے چندر نگر میں اپنے شوہر کے ساتھ وارد ہوئی تھی۔ موسیو گیکاں ایک ضروری کام سے پیرس سے چندر نگر بھیجے گئے تھے۔ چھ ماہ کے عرصے ہی میں اُنھوں نے اپنے کام کو جس خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ اُس سے متاثر ہو کر پیرس نے اُن کی خدمات مستقل طور پر ہندوستان میں ہی منتقل کر دیں۔ دو سال چندر نگر میں رہنے کے بعد وہ بمبئی بھیج دیئے گئے۔ جہاں چار سال کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد چند سال جولی کے لیے اور نہ صرف جولی کے لیے بلکہ اُس کے چاہنے والوں کے لیے بھی بڑے پُراسرار سال ہیں۔ جولی یکایک بمبئی سے لاپتہ ہو گئی۔ وہ اپنے وطن فرانس نہیں گئی۔ مگر یورین کلب یا اولڈ ہاٹ کلب یا اسی طرح کسی عمدہ کلب میں بھی وہ دیکھی نہ گئی۔ اِدھر اُدھر کی افواہیں سننے میں آجاتیں۔ کہ وہ یہیں پر کہیں ہے۔ مگر کہاں ہے کسی کو پتہ نہ چلتا تھا۔ پھر کسی نے بتایا کہ جولی نے کسی اینگلو انڈین سے شادی کر لی ہے جو ریلوے میں انجن ڈرائیور ہے۔ اور جو اُسے شراب پی کر پیٹتا ہے مگر کسی کو اس قسم کی افواہوں پہ اعتبار نہ آیا۔ پھر سُنا گیا کہ وہ اینگلو انڈین انجن ڈرائیور در اصل اینگلو انڈین نہ تھا۔ آدھا ہندوستانی آدھا فرانسیسی یہودی تھا اور ملازمت ختم ہوتے ہی جولی کو چھوڑ کر برازیل چلا گیا۔ پھر اُس کا کیا ہوا؟ جولی کا کیا ہوا۔ ؟ اب ان باتوں پر مزید غور کرنے کی ضرورت کسے ہے۔ ؟ یورین کلب میں لوگوں کی آس اُسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک آدمی سطح آب سے اُوپر سر نکالے تیرتا ہے۔ بلکہ اگر ہو سکے تو موٹر لانچ میں گھومتا ہے۔ جو لوگ غریبی کی سطح کے نیچے ڈوب جاتے ہیں وہ بھی تو مچھلیوں کی طرح فرائی کرنے کے کام میں آتے ہیں۔

اس لیے کلبوں میں لوگ بھول گئے۔ گھروں میں بھول گئے۔ پکنکوں میں بھول گئے اور ڈانس پارٹیوں میں بھول گئے۔ کہ جولی گیکاں ایسی من موہنی مورت بھی بمبئی میں کبھی موجود تھی۔ نئی نئی صورتیں۔ نت نئے عشوے اور ادائیں لے کر دلوں کو بھرمانے لگیں۔ اور لوگ جولی گیکاں کو بھول گئے۔

پھر یکایک ایک روز جولی گیکاں کلب میں وارد ہوئی۔ اکیلی۔ تنہا کسی ساتھی کے بغیر۔ مگر بے حد خطرناک جولی سنبھلی ہوئی گہری۔ نازک اندام۔ خوش جمال۔ مگر بے حد سنجیدہ اور خطرناک۔ ہر نگاہ طرح دیتی ہوئی۔ ہر جنبش کتراتی ہوئی۔ ہر نگاہ سازش کرتی ہوئی۔ اب وہ کھلے دل کی فرانسیسی عورت نہ تھی۔ ایک خطرناک ہندوستانی عورت بن گئی تھی۔

اتنے سال وہ کہاں رہی؟ اُس نے بتایا کہ وہ المورٹے کے آگے چلی گئی تھی۔ اور سادھوؤں کے ایک مٹھ میں شامل ہو گئی تھی۔ وہ یوگا سیکھنا چاہتی تھی۔ اور وہ پرانا فلسفہ جس سے تڑپتی ہوئی روحوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس سے پہلے جولی پیرس کے نائٹ کلب سے لے کر پیرس کے نئے فیشن تک بات کر سکتی تھی۔ اب وہ یوگ، فلسفہ نروان سیکھ کر اور بھی خطرناک ہو گئی تھی۔ اب مردوں کے لیے یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ اپنی عورتوں کی موجودگی کے باوجود جولی سے دُور رہ سکیں۔!

مگر جولی اب وہ پہلی سی جولی نہ تھی۔ بدلی برس کر تھم گئی تھی۔ اب وہ اِدھر اُدھر ہواؤں میں اُڑنا چاہتی تھی۔ اُس کی نگاہیں

کلب کے کہستانی سلسلے میں برف کی ایک چوٹی کی تلاش میں تھیں۔ صرف ایک آغوش ایک سہارا۔ ایک ساتھی۔ جسے وہ اپنا سب کچھ سونپ دے اور اُس سے سب کچھ لے لے۔ اب وہ پہلے کی طرح ہر کسی پر بھروسہ کرنے والی عورت نہ تھی۔ جسے نہ ماضی کی فکر ہو نہ مستقبل کی۔ اب اُس کی ساری جبلتیں مکمل بیدار تھیں۔ اب وہ کبھی غلطی نہ کرے گی۔

نئے دَور میں جتنے لوگ اُس کے قدموں میں گرے تھے اُن میں سے اُس نے کنور پادر سنگھ کو چن لیا تھا۔ ریاست چل گڑھ کی امیر اور پرانی خاندانی ریاست کا واحد چشم و چراغ۔ خوبصورت اور دلکش وجیہہ اور باوقار۔ شکار کا شوقین اور خوبصورت عورت کی ادائیں سمجھنے والا۔ خوش لباس اور خوش اطوار۔ نہ اس قدر فیاض کہ صدیوں کی دولت دو دن میں لٹا دے نہ ایسا کنجوس کہ جوہری کی صورت دیکھ کر ہی غش کھا جائے۔!

کنور پادر سنگھ کو بھی جولی بے حد پسند آئی تھی۔ خوبصورتی کے علاوہ کنور پادر سنگھ یورپ کے حکمران طبقے میں شادی کرنا بے حد پسند کرتا تھا۔ جولی خوبصورت تھی۔ ایک فرانسیسی افسر کی بیوی تھی۔ یورپ کی بہترین ڈپلومیٹک سوسائٹی دیکھے ہوئے تھی۔ خود جولی کا اپنا خاندان کنور پادر سنگھ کے خاندان کی طرح چند سو برس پرانا تھا۔ جولی فرانس کی پہاڑیوں کی طرح پرانی تھی اُس کی انگڑی وادیوں کی طرح شاداب اور حسین۔ کنور پادر سنگھ نے جولی پر مرمٹنے کا اعلان کر دیا۔ اور راجکماری نرملا سے ہاتھ کھینچ لیا جس سے چند دنوں میں اُس کی منگنی ہونے والی تھی!

جولی اور پادر سنگھ کا شعلہ عشق چند ماہ ہی میں جنگل کی آگ کی طرح بھڑک اُٹھا۔ اور یہ آگ اتنی تیز اور روشن تھی کہ دُور سے دیکھنے والے کو بھی نظر آ سکتی تھی۔ جولی اور پادر ہر جگہ اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ جولی اور پادر نے اپنی منگنی کا اعلان کر دیا تھا۔ مہاراجہ چل گڑھ نے خود اُن کی منگنی میں شرکت کی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ اور عمدہ طریقے سے چل رہا تھا۔ اور اگلی بہار میں اُن دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ جولی بے حد خوش تھی۔ چاروں طرف کھلا روشن آسمان تھا۔ کہیں پر کالے ابر کا سایہ نہ تھا۔

پھر ایک سایہ نمودار ہوا۔ چڑیا کی آنکھ کے برابر۔ اولڈ پاٹ کلب میں گھپلا بھائی ملتانی نمودار ہوا۔ اُس کے کان لاؤڈ سپیکر کے ہارن کی طرح لمبے اور اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اُس کے ہونٹ لمبے چوڑے اور تھوک سے بھرے ہوئے تھے۔ اُس کی آنکھیں بے چین وحشت ناک اور چالاک تھیں۔ ایسی آنکھیں جن کو دیکھ کر خیال آتا ہے کسی لومڑ کا یا سانپ کا کبھی کسی جھیل کا خیال نہیں آتا۔ پانی ٹھنڈے گہرے نیلے، کنول کے پھول کھلے ہوئے۔ لہریں بچوں کے تبسم کی طرح کھلکھلاتی ہوئیں۔ اِس دنیا میں ایسی آنکھیں بہت جلد انسان کے چہرے پر مرجاتی ہیں۔ اور اُن کے بجائے جو آنکھیں آتی ہیں وہ گھپلا بھائی ملتانی کی آنکھوں کی طرح ہوتی ہیں جنھیں دیکھ کر جنگل میں کسی گھرے ہوئے جانور کا خیال آتا ہے۔

گھپلا بھائی ملتانی ایک فلم پروڈیوسر تھا۔ اور اپنے کروڑپتی فنانسر بچو بھائی کے ہمراہ مہمان ہو کر پاٹ کلب میں وارد ہوا تھا۔ بچو بھائی نے ابھی اُس کی پکچر کے لیے فنانس نہیں کیا تھا۔ اس لیے ابھی گھپلا بھائی ملتانی بچو بھائی کی تعریف میں قلابے ملانے پر مجبور تھا۔ بچو بھائی اُس کی مجبوری کو سمجھ کر ہی اُسے پاٹ کلب میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ تاکہ وقت بے وقت اپنی تعریف لوگوں کو سناتا رہے۔ گھپلا بھائی ملتانی تعریف کرتا تھا اور بچو بھائی یوں سنتا تھا جیسے وہ تعریف کو وسکی کے گلاس میں ڈال کر ہولے ہولے چسکی لے رہا ہو۔ عمدہ تعریف ہو تو بالکل سکاچ وسکی کی طرح ملائم معلوم ہوتی ہے۔ مگر گھپلا بھائی ملتانی بے حد بھونڈا

بھی تھا جس ملائمت سے وہ بچو بھائی کی تعریف کرتا تھا۔ اُسی شدت سے وہ اُن لوگوں کی مخالفت کرتا تھا جن سے اُسے کسی طرح کا فیض نہ پہنچا تھا۔

خاص طور پر اُس کی زبان عورتوں کے سلسلے میں بے حد کالی تھی۔ ایک چھچھورے آدمی کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ کبھی عورت کی عزت نہیں کر سکتا۔ اور ملتانی زندگی کے جس شعبے سے آیا تھا وہاں (SEX) سیکس بوچڑ خانے کے گوشت کی طرح بکتا تھا۔ اس لیے ملتانی کبھی یہ سمجھ نہ سکا کہ ایک عورت اور دوسری عورت میں کیا فرق ہے۔ اُس کے لیے سب عورتیں گوشت کے ٹکڑے تھیں۔

"جولی گیکاں ہے ——— جولی گیکاں؟" ایک روز اُس نے بچو بھائی کی آدھی بوتل ختم کرنے کے بعد کہا "میں جولی گیکاں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔!"

"تم کیسے جانتے ہو۔؟ بچو بھائی نے اُس سے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا "وہ تو تمھیں منہ نہیں لگاتی۔!"

وہ نہ لگائے۔ مگر اُس کے منہ کا مزا تو مجھے معلوم ہے۔ گھپلا بھائی ملتانی ذرا بلند آواز میں بولا۔

"ششش!" بچو بھائی اور دوسرے لوگ اُس کی ٹیبل کے اردگرد اُدھر اُدھر متحرک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ بے ہودہ باتیں مت کرو۔ گھپلا بھائی ملتانی! وہ سن لے گی۔!"

"سن لے! میں کوئی اُس سے ڈرتا ہوں!" گھپلا بھائی ملتانی گرج کر بولا "جولی گیکاں؟ ...... جولی گیکاں مائی فوٹ! جولی گیکاں تو میری فلم میں ایک ایکسٹرا لڑکی کا کام کر چکی ہے۔ آج بڑی نواب زادی بن کر ایک راجہ سے شادی رچانے چلی ہے۔ مگر ہے تو فلم کی ایک ایکسٹرا لڑکی!"

"تمھارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے۔؟" بچو بھائی نے دلچسپی لیتے ہوئے ملتانی سے پوچھا۔

ملتانی نے اپنی ٹیبل کے چاروں طرف دیکھا۔ لوگ حیرت اور سکتے میں آگے جھکے ہوئے چاروں طرف سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اتنی بڑی کلب میں اتنی امیر اور شاندار کلب میں آج وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ اپنی سانس روکے ہوئے لوگ اُس کے ایک ایک لفظ کو غور سے سن رہے تھے۔ ایسا اہم لمحہ گھپلا بھائی ملتانی کی زندگی میں کبھی نہ آیا تھا۔

اُس نے اپنا گلاس ختم کیا۔ مسکرا کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اپنا بٹوا نکالا۔ بٹوا نکال کر اُسے بڑی احتیاط سے کھولا اُس میں سے دو تصویریں نکالیں۔ اور حاضرین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولا " یہ لیجیے حضور۔ میرا ثبوت حاضر ہے۔!"

لوگ ہاتھوں ہاتھ تصویریں لیتے گئے۔ دیکھتے گئے۔ ایک دوسرے کو دیتے گئے۔ واقعی جولی کی تصویریں تھیں ایک فلمی ناچ کے لباس میں دوسرے ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی کھڑی تھی وہی جولی۔ جو اب کلب کے ایک کونے میں اپنے منگیتر کنور پادم سنگھ کے ساتھ بیٹھی ہوئی بڑے باوقار انداز میں مارٹنی پی رہی تھی۔

لوگ تصویریں دیکھتے اور پھر حیرت سے گھپلا بھائی کو دیکھنے لگتے۔ گھپلا بھائی ملتانی خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ اپنے ہاتھ میں نیا جام لے کر کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوا اور بولا۔

"گھپلا بھائی ملتانی"

" پیش کرتا ہے۔
" جولی گیکاں کی کہانی
اِس وقت وہ ایسے محسوس کر رہا تھا جیسے بجو بھائی نے اُس کی پکچر کے لیے سرمایہ دے دیا ہے۔ پکچر سنسر ہو چکی ہے۔ اور اب فل ہاؤس کے سامنے اُس کی نمائش ہونے والی ہے۔ لہٰذا اُس نے ایک بار پھر چیخ کر کہا۔
" گھپلا بھائی ملتانی
" پیش کرتا ہے
" جولی گیکاں کی کہانی
اُس کے دونوں ہاتھ فخریہ لہجے میں اُوپر اُٹھے ہوئے تھے جب ایک زور کا طمانچہ اُس کی گال پہ پڑا اور وہ دم بخود ہو کر کرسی پر گر پڑا۔ اور اُس کی چالاک سہمی ہوئی آنکھوں نے دیکھا۔ کہ اُس کے سامنے جولی گیکاں کھڑی ہے۔ جو اپنے کونے سے اُٹھ کر اُس کے سامنے چلی آئی تھی۔ اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ اور اُس نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔

پستول کو دیکھتے ہی گھپلا بھائی نے دونوں آنکھیں بند کر لیں اور فوراً بے ہوش ہو کر کرسی کے نیچے گر پڑا۔

اُسی وقت کنور پاور سنگھ نے آ کر جولی کے ہاتھوں سے پستول چھین لیا۔ مگر جولی اپنا ہاتھ چھڑا کر وہاں سے بھاگ گئی۔

۴

دوسرے دن کنور پاور سنگھ راجکماری نرملا کو لے کر سیلنگ پر چلا گیا۔ اُس کی غیر حاضری میں جولی کلب میں آئی۔ لوگوں نے اُسے دیکھا مگر کسی نے اُس سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ ہاں جب کنور پاور سنگھ سیلنگ کر کے واپس آیا تو وہ اُسے پانٹون بریج پر مل گئی۔ راجکماری نرملا تو کترا کر جولی کے قریب سے گذر گئی۔ مگر کنور پاور سنگھ کا راستہ جولی نے روک لیا۔
" ہیلو ؟
" ہیلو ؟؟

. . . .

" کیا یہ سچ ہے۔ ؟" کنور نے پوچھا۔
" سب سچ ہے " جولی نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔
" تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ؟" کنور نے کسی قدر غصے سے پوچھا۔
" کیوں کہ تمھارے سماج میں عورت کو غلطی کرنے کا حق نہیں ہے۔ !
" ہاں یہ ٹھیک ہے !" کنور پاور سنگھ نے سر جھکا کر کہہ دیا۔

" تم بتاؤ اگر میں تم کو بتا دیتی۔ تو کیا تم مجھ سے محبت کرتے۔؟"

" محبت تو کرتا مگر دُور دُور رہ کر۔!"

" اور اب؟"

" اب میں منگنی توڑنے پر مجبور ہوں!"

" کیوں۔؟"

" مہاراج کہتے ہیں جس کی فلم لوگ چار چار آنے میں دیکھ سکتے ہیں وہ میرے محل میں کیسے آئے گی۔ وہ میری بہو کیسے کہلائے گی۔؟ ——اور اُس سے میرا پوتا پیدا ہوگا؟"

" جو عورت بھی جنم دے سکتی ہے وہ ماں ہے۔ وہ کسی محل میں بھی راج کر سکتی ہے۔"

" جولی نے شعلہ رو ہوتے ہوئے کہا۔ رہا راجاؤں کا سوال تو ڈارلنگ تمھیں تو یاد ہوگا۔ ہمارے ملک نے اپنے بادشاہوں کو پھانسی بھی دی۔ اُنھیں معزول بھی کیا۔ اُن سے ہوٹل میں بیرا گیری کروائی، اور موچی کا کام بھی لیا ہے۔

" تم میرے باپ کی بے عزتی کر رہی ہو؟" کنور نے زور سے بھڑک کر کہا۔

" نہیں۔ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں!" جولی نے رُک رُک کر اپنے آنسو روک کر سسکتے ہوئے کہا " میں نے صرف اس لیے اپنی چند برس کی غربت تم سے چھپائی تھی۔ کہ کہیں تم مجھ سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ اس نفرت کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ غریبی تو انسان کا پہلا حق ہے۔!"

" مگر دوسروں کے لیے!" کنور نے اِس پوری بحث سے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

" تمھارے اور میرے درمیان اب سارے رشتے ختم ہیں!" کنور نے فیصلہ کُن لہجے میں کہہ دیا۔

" سینٹ ایملائن کے قصبے میں ہمارا ایک خوبصورت گھر ہے جس کے پتھر کے زینے دریائے رائین تک جاتے ہیں۔ آج میرے باغ کی بیلوں میں انگور کے گچھے لٹک رہے ہوں گے۔ میری وادی میں چلو میرے یار!"

" گڈ بائی جولی"

" گڈ بائی!"

....

" اور اب وہ لوگ اُس کی لاش کو لا رہے تھے۔"

۵

جو لوگ اِس منظر کی تاب نہ لا سکے اُنھوں نے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ کچھ لوگ سر جھکائے مؤدب کھڑے ہو گئے۔ اور جولی کی لاش کو راستہ دینے لگے۔ جسے چرن سنگھ سٹیو والڈ نے اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھا رکھا تھا۔ جولی کا گلابی بلاؤز اُس کے جسم سے چپک گیا تھا۔ اور سیاہ سبز مخملیں جمپر پانی میں بھیگ کر بھی بے حد ٹائٹ تھا۔ اور اُس کے سر کے بال بالکل کھلے تھے۔ اور فرش کے

ماپتے تک آ رہے تھے ۔ اور اُن میں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اور غلیچے کو بھگوتا جا رہا تھا۔ معاً ہر شخص نے گھیلا بائی ملتانی کو کئی گز کے فاصلے سے اکیلا چھوڑ دیا ۔ کوئی شخص اُس کے قریب جانے کو تیار نہ تھا ۔ جیسے وہ انسان نہ ہو ، کوئی خارش زدہ کتا ہو ۔ اس وقت سب کی آنکھیں پاورسنگھ اور راجکماری نرملا پہ لگی ہوئی تھیں ۔ جو اندر لاؤنج کے ایک کونے میں سب کی نظروں سے چھپ کر بیٹھ گئے تھے ۔ مگر لاش کو لیڈیز کلاک روم میں لے جانے کے لیے سٹیوارڈ کو اندر کے لاؤنج سے گزرنا پڑتا تھا ۔ اس لیے وہ نہایت خاموشی سے جولی کی لاش کو اٹھائے ہوئے اندر سے گزر گیا ۔ اور جو جہاں بیٹھا تھا وہیں پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھا رہ گیا ۔

کنور پاورسنگھ نے آنکھوں کے گوشوں سے چرن سنگھ کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا ۔ ایک لمحے کے لیے اسے جولی کے سفید ہوتے ہوئے چہرے پر گہری سبز آنکھیں کھلی ہوئی دکھائی دیں ۔ دوسرے لمحے میں بالوں کا گھنا جال اُس کے قدموں پر آنسوؤں کی لکیر بناتا ہوا گزر گیا ۔ یکایک اُس کے دل میں ایک بھنور سا پھرنے لگا ۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس وقت سارے کلب کی نگاہیں اُس پر ہیں ۔ اس لیے اُس نے اپنے آپ کو سنبھال کر ہر قسم کے جذبے سے عاری لہجے میں راجکماری نرملا سے پوچھا ۔

” آپ کیا پئیں گی ۔ پورٹ یا شیری ؟“

اس سوال پر پروفیسر ملکانی سوچنے لگا ۔ کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ بے رحم ہے ۔ گھیلا بائی ملتانی یا کنور پاورسنگھ ؟ جب وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو اُس نے اپنے ساتھی سے کہا ۔” ہم لوگ ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہیں ۔“ مگر جب اُس کے ساتھی نے بھی کوئی جواب نہ دیا تو اُس نے بھی اپنے سماجی فلسفے کو ترک کر دیا ۔ اور موت کے سامنے ایک معمولی بشر کی طرح سر جھکا دیا ۔

جب سٹیوارڈ جولی کی لاش کو لیے لیڈیز کلاک روم میں داخل ہوا تو ایک ایک کر کے سب لیڈیز وہاں سے بھاگ گئی تھیں کلاک روم میں اکیلی کاشی بائی رو رہی تھی ۔ کیونکہ کلب میں اکیلی وہی عورت تھی ۔ جو محبت کا درد سمجھتی تھی ۔

سٹیوارڈ نے جولی گیکاں کی لاش کو دیوان پر لٹا دیا ۔ پھر ایک لمبا سانس لے کر کاشی بائی کی طرف متوجہ ہو کر بولا ۔

” یہ جولی میم صاحب کو کیا ہوا ۔ ؟“

کاشی بائی نے چند لمحے سٹیوارڈ کو گھور کر دیکھا ۔ اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ سٹیوارڈ کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی ۔ تو اُس نے آہستہ سے افسوس سے سر ہلا دیا ۔ اور دھیرے سے آہ بھر کر کہا ۔

” کچھ نہیں سٹیوارڈ ! جولی میم صاحب بہت دُور سیلنگ کو نکل گئی ہیں ۔ !“

واپسی کا ٹکٹ

خواجہ احمد عباس

۱

انسان نے انسان کو ایذا پہنچانے کے لیے جو مختلف آلے اور طریقے ایجاد کئے ہیں اُن میں سب سے خطرناک ہے ———ٹیلی فون!

سانپ کے کاٹے کا منتر تو ہو سکتا ہے مگر ٹیلی فون کے مارے کو تو پانی بھی نہیں ملتا۔

مجھے تو رات بھر اس کمبخت کے ڈر سے نیند نہیں آتی کہ صبح سویرے نہ جانے کس کی منحوس آواز سنائی دیگی۔ دو ڈھائی بجے آنکھ لگ بھی گئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ساری دنیا کی گھنٹیاں اور گھنٹے گھڑیاں یک وقت بجنے شروع ہو گئے ہیں۔ مندروں کے بڑے بڑے پیتل کے گھنٹے، پولیس کے تھانے کا گھڑیال، دروازوں کی بجلی والی گھنٹیاں، سائیکلوں کی ٹرنگ ٹرنگ فائر انجنوں کی کلانگ کلینگ۔ اور جب آنکھ کھلتی ہے تو معلوم ہوتا ہے ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ اس غیر وقت رات کو کس کا فون آیا ہے؟ ضرور ٹرنک کال ہوگی۔ پل بھر میں نہ جانے کتنے وہم دل دھڑکاتے ہیں۔ ایک دوست مدراس میں بیمار ہے۔ ایک رشتے دار لندن اور بمبئی کے درمیان ہوائی جہاز میں ہے بھتیجے کا میٹرک کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔

میں فون اٹھا کر کہتا ہوں "ہلو"

دوسری طرف سے گھبرائی ہوئی آواز آتی ہے ——"چمنی بھائی۔ کیم چھو"

میں کہتا ہوں کہ یہاں نہ کوئی چمنی بھائی ہے نہ کھیم چھو۔

مگر وہ کہتا ہے —— چمنی بھائی۔ ٹاٹا ڈیفرڈ ڈار پر جا رہا ہے۔

میں کہتا ہوں —— جانے دو ——

وہ گجراتی میں گالی دے کر کہتا ہے —— کیسے جانے دیں —— برٹش الیکٹرک کے سودے میں پہلے ہی گھاٹا کھا چکے ہیں۔

میں سمجھاتا ہوں کہ دیکھو بھائی میں چمنی بھائی نہیں ہوں۔

"اوہ!" —— اُدھر سے آواز آتی ہے جیسے ایک دم ٹائر میں سے ہوا نکل گئی ہو ——"تم چمنی بھائی نتھی چھو"

میں پوچھتا ہوں آپ کو کون نمبر چاہیئے -
وہ کہتا ہے - ایٹ ــــ سیون ــــ ایٹ ــــ سکس ــــ سکس -
میں کہتا ہوں ــــ یہ تو ایٹ سکس - ایٹ سیون سیون ــــ ہے -
وہ کہتا ہے - ڈانٹ کر "تو پہلے ہی کیوں نہیں بولتے رونگ نمبر ہے"
میں کہتا ہوں " اچھا بھئی - میرا ہی دوش ہے - اب شما کرو "
اور فون رکھ دیتا ہوں - اور نیند کو واپس بلانے کے لیے بھیڑیں گننا شروع کر دیتا ہوں -
اور پھر صبح اٹھ کر تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا سلسلہ ہی شروع ہو جاتا ہے -
• آپ مجھے نہیں جانتے - آپ کے پرانے وطن پانی پت کے قریب جو قصبہ ہے دیوالڑی وہاں سے آیا ہوں - فلم کمپنی میں ہیرو بننے . . . . "
" مجھے آپ سے اپائنٹ منٹ چاہیئے - اپنی کہانیاں سنانا چاہتا ہوں "
" اگلے اتوار کو ہماری انجمن کا سالانہ جلسہ اور مشاعرہ ہے - آپ کو آنا ہی پڑے گا ــــ آپ کے نام کا ہم اعلان پہلے ہی کر چکے ہیں . . . . . "
پرچہ پریس میں رکا پڑا ہے - صرف آپ کے مضمون کے انتظار میں . . . . . "
" دیکھیے - آپ مجھے نہیں جانتے - لیکن کیا آپ مجھے کرپاکر کے راج کپور کا ایڈریس دے سکتے ہیں - ؟"
کل سویرے کی بات ہے کہ یہی سلسلہ چل رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی ــــ میں نے ہمت کر کے فون اٹھایا -
" ہیلو ــــ " میں نے کہا ــــ حالانکہ ٹیلیفون کی ڈائرکٹری حکم دیتی ہے کہ " ہیلو " مت کہو -
" ہیلو " دوسری طرف سے بڑے ہی یورپین انداز کی آواز آئی - میں سمجھا کہ کوئی امریکن یا انگریز بول رہا ہے -
پھر اس نے انگریزی میں پوچھا
" کیا میں خواجہ احمد عباس سے بات کر سکتا ہوں "
میں نے انگریزی ہی میں جواب دیا " میں عباس ہی بول رہا ہوں - کہیئے کون صاحب بول رہے ہیں "
دفعتاً فون کے دوسرے سرے پر انگریزی ہندوستانی میں بدل گئی مگر لہجہ ولایتی ہی رہا - جیسے کوئی انگلستان سے پڑھ کر دس برس بعد حال ہی میں لوٹا ہو " کیوں بھائی میری آواز پہچان سکتے ہو ؟ "
میں نے تکلفاً جھوٹ بولا " آواز تو آپ کی جانی بوجھی معلوم ہوتی ہے لیکن معاف کیجئے گا . . . . . . "
اس نے میری بات کاٹ کر کہا - بڑے بے تکلف انداز میں مگر لہجہ وہی ولایتی رہا - ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انگریزی فوج کا کرنیل ہندوستانی بول رہا ہو ــــ " چھوڑو یار - تم میری آواز پورے پچیس برس بعد سن رہے ہو - آخری بار ہم لکھنؤ میں ملے تھے - انیس سو چھتیس میں "
نہ جانے کیسے میرے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی - میں نے کہا " برجیندر کمار سنگھ ؟ برجو ؟ "

اُدھر سے آواز آئی "رائٹ - برجو"
"برجو" میں نے خوشی سے چلّا کر کہا "کبھی اتنے دن کہاں رہے کیا کرتے رہے؟ آج کل کیا کرتے ہو؟"
ٹیلی فون پر بھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دوسری طرف جواب دینے سے پہلے اُس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی ہو۔
جب وہ بولا تو اُس کی آواز بالکل ہی بدلی ہوئی تھی جیسے ایک دم کسی گہری فکر میں ڈوب گئی ہو "یہ سب ایک لمبی کہانی ہے۔ کیا میں تم سے ابھی ملنے آسکتا ہوں؟"
میں نے کہا "میں تو شہر سے بہت دور جوہو میں رہتا ہوں۔ مگر ہر روز دوپہر کو میں شہر آتا ہی ہوں۔ ایسا کیوں نہ کریں۔ کسی ریستوران میں اکٹھے لنچ کھائیں۔ اب یہاں بمبئی میں بھی تمھارے لکھنؤ کی طرح ایک مے فیر (MAYFAIR) ریستوران کھل گیا ہے"
"مے فیر؟" اُس نے ریستوران کا نام ایسے دہرایا جیسے کسی نے دفعتاً اُس کے چٹکی لے لی ہو "نہیں نہیں۔ میں تم سے کسی ریستوران میں نہیں ملنا چاہتا۔ وہاں بہت لوگ ہوتے ہیں۔ ہم اطمینان سے بات نہیں کر سکیں گے"
"اچھا" —— میں نے کہا "تو تم یہاں ہی آجاؤ۔ میں تمھارا انتظار کروں گا۔ کتنے بجے آؤ گے؟"
"جتنی دیر ٹیکسی کو چرچ گیٹ سے جوہو پہنچنے میں ٹائم لگے گا"
"کوئی چالیس پینتالیس منٹ۔ میں اپنے برآمدے میں کھڑا ملوں گا"
پھر مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے کہا "ارے بھئی للکشمی بھی ساتھ ہے تو اُسے بھی لیتے آنا۔ بھابی کے درشن ایک بار پھر ہو جائیں" پچیس برس کے بعد ایک جملہ میرے دماغ میں پھر گونجا اور میں نے کہا "ہم تمھارے رقیب نہیں ہیں۔ یار ——" مگر اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا۔ ٹیلیفون کا سلسلہ پہلے ہی کٹ چکا تھا۔

۲

اگلے پینتالیس منٹ تک پچیس برس پرانی تصویریں میرے دماغ میں اُبھرتی رہیں۔

برجو۔

برجیندر۔

برجیندر کمار سنگھ۔

کنور برجیندر کمار سنگھ۔

برجو۔

ہمارا یار برجو۔

"برجو دی بیوٹی فل"

"برجو دی پریسیڈنٹ"

برجو جو خوبصورت تھا، قدآور تھا، ذہین تھا، ٹینس کا چمپین تھا اور یونین میں بہترین مقرر تھا۔

برجو جس کے پیچھے درجنوں لڑکیاں دیوانی تھیں۔

ہائی کورٹ کے جج جسٹس سر رمیش سکسینہ کی بیٹی آشا سکسینہ جو آئی ٹی کالج میں پڑھتی تھی۔

ڈاکٹر ستیش بنرجی کی لڑکی کرونا۔ جس کی خوبصورت بنگالی آنکھیں جیمنی رائے کی کسی تصویر سے چرائی ہوئی لگتی تھیں۔

پروفیسر حامد علی کی چھوٹی بہن۔ ثریا حامد علی جس نے کرامت حسین گرلز سکول کا پردہ دار ماحول چھوڑ کر یونیورسٹی میں اسی سال داخلہ لیا تھا اور جو ہر ڈبیٹ اور ڈرامے میں یونین ہال میں سب سے آگے بیٹھتی تھی تا کہ برجو کو دل بھر کر دیکھ سکے۔

سرلا ماتھر جو ہندی میں ایم اے کر رہی تھی اور کویتا لکھتی تھی اور جس کی ہر کویتا میں برجو کا روپ جھلکتا تھا۔

درپنا جیپال سنگھ جو نہایت خوبصورت تھی اور ایک چھوٹے موٹے جاگیردار کی بیٹی تھی اور جس نے صرف برجو کی وجہ سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔

سلویا تھامسن جو اسٹیشن ماسٹر کی لڑکی تھی اور ریلوے کلب کے ہر ڈانس میں برجو کو دعوت دینے خود اس کے ہاسٹل جاتی تھی۔ حالانکہ وہاں لڑکیوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

برجو۔

واقعی وہ کتنا قابلِ رشک نوجوان تھا۔

پہلی بار جب میری ملاقات اس سے ہوئی تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی آل انڈیا ڈبیٹ میں حصہ لینے لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے آیا تھا۔

چھبیس برس بعد بھی مجھے اس سے وہ پہلی ملاقات اچھی طرح یاد تھی۔ میں اپنی یونیورسٹی یونین کی طرف سے آنے والے مہمانوں کا استقبال کرنے سٹیشن گیا تھا۔ اس ٹرین سے لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، کانپور کے کالجوں کے ڈبیٹر آئے تھے۔ کل ملا کر وہ سب شاید بارہ یا چودہ تھے۔ لیکن ان سب میں ایک سب سے نمایاں تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ قدآور تھا اور بند گلے اور پوری آستینوں کے سوئیٹر میں اس کا کسرتی بدن اپالو کے بت کی طرح گٹھا ہوا اور سڈول تھا۔ بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اور جب میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو اس کے شیک ہینڈ میں بڑا اخلاص تھا اور گرمجوشی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگوں سے مل کر اسے واقعی بڑی خوشی ہوئی ہے۔ اسی ایک پل ہی میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں بڑے پرانے دوست ہیں۔ اور برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

پھر آل انڈیا ڈبیٹ ہوئی۔ موضوع زیر بحث یہ تھا کہ۔

" سماجی انقلاب کے بغیر سیاسی آزادی کافی نہیں ہے "

میں اس موضوع کے خلاف بولا اپنی تقریر میں میں نے سامراج کے خلاف اور قومی آزادی کی تحریک کی حمایت میں نہایت جذباتی تقریر کی اور ان لوگوں کو خوب لتاڑا جو جنگ آزادی کی قربانیوں اور خطروں سے بچنے کے لیے سماج سدھار کے "گوشۂ عافیت" میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ میری تقریر ختم ہوئی تو خوب زور کی تالیاں بجیں اور میں یہی سمجھا کہ میں نے میدان مار لیا ہے۔

میرے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے برجیندر کمار سنگھ" کا نام پکارا گیا۔ اب وہ سفید فلالین کی پتلون پر بند گلے کا سیاہ جودھپوری کوٹ پہنے ہوئے تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لباس میں وہ بڑا ہی جچ رہا تھا۔ ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ اوپر گیلری میں جہاں چکوں کے پیچھے گرلز کالج کی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں دلچسپی کی ایک سرسراہٹ سی دوڑ گئی اور چکوں کے بیچ میں سے سیاہ خوبصورت آنکھیں اور رنگین آنچل جھلملانے لگے۔

"مسٹر پریذیڈنٹ" اُس نے نہایت شستہ انگریزی لہجے میں تقریر شروع کی "مجھ سے پہلے میرے دوست نے جب اپنی تقریر ختم کی تو سب نے پُر جوش تالیاں بجائیں۔ میں نے بھی تالیاں بجائیں۔ وہ تقریر واقعی لاجواب تھی۔ میرے خیال میں بہترین تقریر کے لیے انعام میرے اس دوست ہی کو ملنا چاہیئے۔ اس لیے کہ اتنے کمزور دلائل کو اتنی خوب صورتی اور اتنے زور شور سے پیش کرنا واقعی بڑا کارنامہ ہے"

اور اس سے پہلے کہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ وہ واقعی میری تعریف کر رہا ہے یا مذاق اُڑا رہا ہے۔ اس نے میری طرف مُڑ کر دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ میرے دوست ایک بہت کامیاب وکیل ثابت ہوں گے" اور اس پر سارے ہال میں اتنے زور کا قہقہہ پڑا کہ اس کی لہروں میں میرے تمام زوردار دلائل بہہ گئے۔

اُسے ڈیبیٹ میں اوّل انعام ملا۔ مجھے دوسرا۔ وہ تین دن علی گڑھ میں ٹھہرا۔ پہلے دن وہ "مسٹر برجیندر کمار سنگھ" تھا۔ دوسرے دن "برجیندر" ہو گیا۔ تیسرے دن صرف "برجو" رہ گیا۔ جب دلوں اور دماغوں دونوں کی ہم آہنگی ہو تو غیریت کے فاصلے کتنی جلدی دُور ہو جاتے ہیں۔

سٹیشن پر جب میں اُسے چھوڑنے گیا تو میں نے اُس سے پوچھا تھا "برجو یہ بات کہ سماجی انقلاب سیاسی آزادی سے زیادہ ضروری ہے تم نے ایسے ہی ڈیبیٹ کی خاطر اتنے زور شور سے کہی یا تم واقعی اس میں اعتقاد رکھتے ہو؟"

پچیس چھبیس برس کے بعد بھی اس کا جواب میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اُس نے کہا تھا "سُنو۔ ملکوں اور قوموں کی آزادی ضروری ہے لیکن اتنی مشکل نہیں۔ سماجی انقلاب جو ہمارے دماغوں کو صدیوں کے تعصبات اور واہموں سے آزاد کرے وہ مشکل کام ہے۔ اور جب تک ہمارے دماغ آزاد نہیں ہوں گے ہمارے ملک کی سیاسی آزادی غیر مکمل رہے گی"

پھر اُس نے اور بڑی پتے کی باتیں کہی تھیں "فرض کرو ہندوستان آزاد ہو گیا اور ہمارے تمہارے دماغ مذہبی جنون اور فرقہ وارانہ تعصب اور نفرت کے بندھنوں سے آزاد نہ ہوئے تو ذرا سوچو کیا ہو گا۔ اتنے برسوں کی تعلیم اور سماج سدھار کی باتیں کرنے کے بعد بھی ہم پڑھے لکھے ہندوؤں میں سے کتنے ہیں جنھوں نے اپنے ذہنوں کو پوری طرح ذات پات کے بندھنوں سے آزاد کر لیا ہے؟ تم مسلمانوں میں کتنے ہیں جو سیّد شیخ مغل پٹھان جلاہے کمہار کو برابر سمجھتے ہیں؟"

میں نے اس سے پوچھا تھا "اور برجو تم؟ کیا تمہارا دل اور دماغ ان بندھنوں سے آزاد ہے؟ کیا تم بڑے خاندان کے راجپوت ہو کر ایک اچھوت لڑکی سے بیاہ کر سکتے ہو؟ یا کسی طوائف زادی کو اپنی پتنی بنا سکتے ہو؟"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا "اگر مجھے اس سے محبت ہو تو ضرور کر سکتا ہوں اور وقت آیا تو کر کے

دکھا دوں گا۔

اور پھر اس کی ٹرین آ گئی اور وہ لکھنؤ واپس چلا گیا۔

اس کے بعد ہم ایک اور آل انڈیا ڈیبیٹ کے سلسلے میں بنارس میں ملے تھے۔ اور سارناتھ کے کھنڈروں میں ساتھ گھومے تھے اور برجو نے مجھے مہاتما بدھ کے حالات زندگی سنائے تھے اور کہا تھا "اگر دھرم اور مذہب کے خیال ہی سے میں بیزار نہ ہوگیا ہوتا تو ضرور بدھ مت اختیار کر لیتا۔"

جانتے ہو مہاتما بدھ کا دیہانت کیسے ہوا؟ ۔اس نے میوزیم میں مہاتما بدھ کی شانت اور مسکراتی ہوئی مورتی کے سامنے کھڑے ہوئے مجھ سے کہا تھا "وہ ایک غریب اچھوت کے ہاں بھیک مانگنے گئے اور اس بیچارے کے پاس گھر میں صرف سڑا ہوا سؤر کا گوشت تھا وہی اس نے جھولی میں ڈال دیا۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ گوشت سڑ کر زہریلا ہو چکا تھا انھوں نے اسے کھا لیا۔ جان دے دی مگر کسی غریب اچھوت کا دل نہیں توڑا۔"

پھر جب ہم یہی باتیں سوچتے ہوئے تانگے میں شہر واپس ہو رہے تھے ہم نے دیواروں پر "دیوداس" فلم کے اشتہار لگے دیکھے تھے اور برجو نے کہا تھا "اور ایک بھائی دیوداس تھے کہ بارونی کو تو منجدھار میں چھوڑا ہی تھا چندرا کا دل بھی توڑ دیا۔ اور شراب کے سمندر میں ڈوب گئے۔ مگر سماج نے انسانوں کے درمیان جو کھائیاں کھود رکھی ہیں اُن کو پار نہ کر سکے۔"

میں نے کہا تھا "دیوداس کوئی فرضی فلمی ہیرو نہیں تھا۔ شرت بابو نے ایک معمولی انسان کا کردار دکھایا ہے جو سماج کے مقابلے میں ہماری تمھاری طرح کمزور تھا۔"

اور اس نے ہنس کر کہا تھا "تمھاری طرح کمزور ہوگا۔ اگر یہ صورتِ حال مجھے پیش آئی تو میں کمزور ثابت نہیں ہوں گا۔"

اس رات کو ہم لوگ بنارس سے رخصت ہو رہے تھے لیکن ہماری ٹرینیں آدھی رات کے بعد روانہ ہونے والی تھیں۔ میری ٹرین ڈیڑھ بجے اور برجو کی پونے تین بجے۔ ڈیبیٹ کے لیے اور جتنے طالب علم مختلف یونیورسٹیوں سے آئے تھے وہ سب جا چکے تھے۔ صرف میں اور برجو رہ گئے تھے۔ اور ہماری دیکھ بھال کرنے کے لیے بنارس یونیورسٹی کا ایک ایم اے کا طالب علم تھا گووند سکسینہ۔

کھانے کے بعد ہم باتیں کر رہے تھے کہ گووند نے کہا "ریل میں تو ابھی کئی گھنٹے ہیں۔ چلیے آپ لوگوں کو گانا سنوا دیں۔"

میں نے اس وقت تک کبھی کسی طوائف کا گانا نہیں سنا تھا مگر بنارس کی گانے والیوں کی بڑی تعریف سنی تھی۔ کہ پکے گانے، دادرا اور ٹھمری میں اُن کا جواب نہیں۔ سو میں نے کہا "یہ اچھا خیال ہے۔ چلو۔ برجو۔"

مگر اس نے کہا "چھوڑو جی۔ اچھے خاصے یہاں گپ شپ کر رہے ہیں وہاں کوئی کالی موٹی بھدی بائی جی پان کھا کھا کے پکا گانا سنائیں گی اور ہمیں بور کریں گی۔"

اس پر گووند بولا "تم لکھنؤ والے سمجھتے ہو کہ لکھنؤ کے چوک کے باہر حسن کہیں ہے ہی نہیں۔ ہشے ایک بار ہم گنگنی کو دیکھ لوگے

تو نہ جانے لکھنؤ کی کتنی بیلیں نکل جائیں گی۔"

مگر برجو نہیں مانا۔ "تمہاری لکشمی بائی تم بنارس والوں کو مبارک۔ اور سچی بات یہ ہے کہ کوٹھے والیوں کا گانا سننے میں اپنے کو کوئی دلچسپی نہیں۔

اور مجھے کہنے کا موقعہ مل گیا۔ "کیوں سماج سدھارک جی ویشیا کے گھر جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے کیا؟"

برجو کو کہنا ہی پڑا۔ "ڈر تو مجھے شیطان کے گھر جاتے ہوئے بھی نہیں لگتا۔" اور سو ہم لوگ تانگہ لے کر لکشمی کے کوٹھے کے لیے روانہ ہو گئے۔

اتنے برسوں کے بعد بھی لکشمی کی صورت کو میں نہ بھولا تھا۔

چھوٹا سا بوٹا سا قد۔ گدرایا ہوا جسم۔ گوری تو نہیں مگر سنہری رنگت۔ گھنے لمبے بال جن کو دو چوٹیوں میں گوندھا ہوا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اور بوجھل لمبی پلکیں۔ لال لال سے ہونٹ جن پہ ایک عجیب سی اداس سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ چھوٹی سی مگر بڑی خوبصورت سی ناک جس میں ہیرا جڑی ایک چھوٹی سی نتھنی پڑی ہوئی تھی۔ گووند نے میرے کان میں کہا: "اس نتھنی کو اتارنے کے لیے ایک جاگیردار صاحب پچاس ہزار تک پیش کر چکے ہیں۔"

مجرا شروع ہوا۔ ہمیں ماننا پڑا کہ لکشمی جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی سریلی اس کی آواز ہے۔ ٹھمری کے بعد دادرا اور دادرا کے بعد غزل۔ گووند کی فرمائش پر ایک آدھ فلمی گیت بھی ہوا۔ محفل میں کتنے ہی رنگ تھے جو بھوکی نگاہوں سے لکشمی کو گھور رہے تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ خود لکشمی کی نگاہیں برجو کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں۔

سو آہستہ آہستہ محفل بکھرتی گئی۔ اپنی اپنی جیبیں خالی کر کے لوگ اٹھتے گئے۔ پھر صرف ہم لوگ رہ گئے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے کہا "میری گاڑی کا تو وقت ہو گیا۔ چلو بھئی گووند۔"

گووند میرے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا لیکن جب برجو نے اٹھنا چاہا تو لکشمی نے اپنا مہندی لگا چھوٹا سا نرم سا ہاتھ اس کے سخت ٹینس کھیلنے والے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "آپ کو ہماری قسم ہے، کنور صاحب۔ لکھنؤ کی گاڑی میں تو ابھی بہت دیر ہے۔"

برجو نے حیران ہو کر پہلے میری طرف دیکھا پھر گووند کی طرف اور پھر لکشمی کی طرف جس کا ہاتھ اب تک اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ ہمارے ساتھ اٹھنا بھی چاہتا ہے اور لکشمی کو مایوس کرنا بھی نہیں چاہتا۔

میں نے انگریزی میں کہا۔ شام کی گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے۔ THIS MEAT IS POISONED ۔ "اس گوشت میں زہر ہے۔"

برجو نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"جانتا ہوں مگر کسی کا دل دکھانے سے زہر کھا لینا بہتر ہے۔"

"چلو گووند ہم چلتے ہیں"میں نے کسی قدر چڑ کر کہا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرا ایک عزیز دوست ایک گندی نالی میں گر پڑا ہے اور وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا۔

"اچھا تو پھر اگلے سال لکھنؤ کی ڈبیٹ میں ملیں گے۔" برجو نے مجھ سے صلح کرنے کے لیے آواز دی مگر میں نے کوئی جواب

نہ دیا۔ برجو کا جو خیالی مجسمہ میں نے اپنے من میں بنایا تھا اُس لمحے میں وہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سماجی انقلاب پر تقریر کرنے والا برجو، مہاتما بدھ کے پوتر مارگ پر چلنے والا برجو، ایک معمولی رنڈی باز نکلے گا۔

غصّے سے بھرا میں زینے سے اُتر ہی رہا تھا کہ آواز آئی "سنیئے" مڑ کر دیکھا تو کلثوم تھی۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور اس کے لبوں کے کنارے کانپ رہے تھے۔

"میں نے آپ کے دوست کو روک لیا" وہ بولی "اس کے لیے میں آپ سے شما مانگتی ہوں"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور مڑ کر جانے لگا۔ اس بار اُس کی آواز میں تیر کی سی تیزی تھی "جانے سے پہلے یہ سنتے جائیے کہ میں اتنی بڑی نہیں ہوں۔ اگر میں زہر بلا گوشت ہوں تو کبھی یہ بھی سوچیئے گا کہ میرے جیون میں یہ بِس کس نے گھولا ہے"

میں کوئی جواب نہ دے سکا اور وہاں سے چلا آیا۔

۳

اگلے برس جب میں لکھنؤ آل انڈیا ڈیبیٹ کے لیے گیا تو میں اس واقعہ کو تقریباً بھول چکا تھا۔ یونیورسٹی کے طالب علموں کا کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سننے جانا یا وہاں رات بھر کے لیے ٹھہر بھی جانا کوئی ایسا غیر معمولی سانحہ نہیں کہ اُس پر برسوں سوچ بچار کی جائے۔ برجو کا رویّہ اُس وقت مجھے ضرور بُرا لگا تھا مگر بعد میں میں نے یہ سوچ کر اُسے معاف کر دیا تھا کہ جوانی میں ایک آدھ بار کس کے پیر نہیں لڑکھڑاتے۔

وہ اسٹیشن پر مجھے لینے آیا تھا اور اگلے تین دن تک تقریباً ہر وقت وہ میرے ساتھ ہی رہا۔ وہ بی۔ اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر چکا تھا اور اب ایم اے میں پڑھ رہا تھا۔ کہنے لگا "میرے ماں باپ تو چاہتے ہیں۔ میں آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے میں شریک ہوں لیکن میں سرکاری نوکری کرنا نہیں چاہتا"

میں نے پوچھا "تب کیا کرو گے؟"

بولا "ایم اے کر کے کسی چھوٹے موٹے کالج میں لیکچرر ہو جاؤں گا یا ایل ایل بی کر کے وکالت کرونگا۔ ورنہ تمہاری طرح میں بھی جرنلزم کے میدان میں آ کودوں گا"

اُس نے مجھے پورے لکھنؤ کی سیر کرائی۔ اور اس بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑکیوں میں کتنا مقبول ہے۔ یونیورسٹی یونین کے کیفے میں چائے پی رہے تھے کہ کرونا بیزجی مل گئی اور کہنے لگی "دیکھو مسٹر برجیندر کمار اما رے بنگالی کلب کے پروگرام میں ضرور آنا۔ ہم گرودیو کا ناٹک رکتو کروبی کر رہے ہیں"

اور جب برجو نے کہا "کرونا۔ میرا آنا تو مشکل ہے۔ یہ میرے دوست علی گڑھ سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کو لکھنؤ کی سیر کرا رہا ہوں" تو وہ بولی "اپنے فرینڈ کو بھی لے آئیے نا۔ پلیز!" اور اس کی جیمنی رائے کی تصویر جیسی بنگالی آنکھوں میں پیار ہی پیار بھرا ہوا تھا۔

وہاں سے وہ مجھے لائبریری دکھانے لے گیا تو سرلا ماتھر سے ملاقات ہو گئی جو برجو کو کری سمیلن میں مدعو کرنے کے لیے

تلاش کر رہی تھی۔ وہ بولی: "برجندر جی۔ یہ میں نے ایک نئی کوتا لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر بتلائیے گا کیسی ہے۔ میں کوی سمیلن میں یہی پڑھنے والی ہوں۔" جب وہ چلی گئی تو برجو نے کوتا مجھے دکھائی۔ عنوان تھا "میرے سپنے" اور دو ہی سطریں سن کر میں جان گیا کہ اس بے چاری کے سارے سپنوں کا مرکز برجو ہی تھا۔

شام کو ٹینس کلب میں آشا سکسینہ سے ملاقات ہوئی جن کا اصرار تھا کہ برجو ٹینس ٹورنامنٹ میں مکسڈ ڈبلز کے لیے ان کا پارٹنر بن جائے اور جس انداز سے وہ آہستے "پارٹنر پارٹنر" کہہ کر بلا رہی تھیں اس سے صاف ظاہر تھا کہ انھیں برجو کو زندگی بھر کا "پارٹنر" بنانے میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔

مے فیر ریسٹوران میں چائے پینے گئے تو وہاں ایک نہایت ہی خوبصورت اور سمارٹ لڑکی "ہیلو برجو" کہہ کر دوڑی اور جب برجو نے اس کا تعارف کرایا تو معلوم ہوا وہ ہے موہنا جسپال سنگھ۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی کاجل لگی آنکھوں میں برجو کو دیکھتے ہی ایک عجیب سی آگ چمک اُٹھی ہے اور نہ جانے کیوں مجھے اُن بھوکی اسلگتی ہوئی آنکھوں سے ڈر سا لگا۔

اگلے دن میں نے برجو سے پوچھا: "ارے یار تم تو بڑے خوش قسمت ہو کہ یہ سب لڑکیاں تم پر مرتی ہیں مگر آج تک یہ نہ پتہ چلا کہ تم کس سے دلچسپی لیتے ہو۔ یا سب سے ہی فلرٹ کرتے ہو؟"

وہ بولا: "میں کس میں دلچسپی لیتا ہوں۔ وہ کوئی اور ہی ہے۔ اور اُس سے میں بہت جلد شادی کرنے والا ہوں!"

میں نے کہا: "اگر ان سب حسین اور سمارٹ لڑکیوں کو چھوڑ کر تم نے کوئی اور پسند کی ہے تو وہ واقعی کوئی خاص چیز ہوگی۔ ہمیں بھی ملاؤ۔"

اُس نے مسکرا کر کہا تھا: "خاص چیز تو ہے وہ۔ اسی لیے میں نے اُسے پردے میں رکھ چھوڑا ہے۔"

میں نے کہا: "ہم مسافروں سے کیا پردہ۔ ہم تمھارے رقیب نہیں ہیں یار۔"

"تو پھر آج شام کو چار بجے مے فیر ریسٹوران میں چلے آئیو اور اُس سے ملو۔"

"کون۔ موہنا؟"

"نہیں موہنا تو بور ہے۔ اگرچہ میرے ماتا پتا اس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک جاگیردار کی بیٹی ہے۔ لیکن جس سے میں تمھیں ملانا چاہتا ہوں وہ کوئی اور ہی ہے۔"

چار بجے میں مے فیر میں داخل ہوا تو دیکھا ایک کونے کی میز پر برجو کے پاس سفید ساڑھی میں ملبوس ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ میں بالکل قریب پہنچ گیا تب بھی اُس کی صورت نہ دیکھ سکا۔

"تم تو ان سے مل چکے ہو؟" برجو نے کہا اور سفید ساڑھی والی لڑکی نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

وہ لکشمی تھی!

"نمستے!" اُس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

"نمستے!" میں نے نہایت بددلی سے جواب دیا۔ اور کرسی پر بیٹھ کر بینڈ کی دھن سننے لگا۔

اُس شام کو گومتی کے کنارے گھومتے ہوئے گھنٹوں میں اور برجو اس مسئلے پر باتیں کرتے رہے۔

میں نے کہا "برجو۔ تم پاگل ہو گئے ہو کہ موہنا جے پال سنگھ اور آشا سکسینہ اور کرونا بنرجی اور سرلا ماتھر جیسی خوبصورت
ں بڑے خاندانوں کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس طوائف سے شادی کر رہے ہو۔"

"لکشمی طوائف نہیں!" اُس نے غصے سے کہا تھا۔

"طوائف نہ سہی طوائف زادی سہی" مگر اُس میں تم نے کیا دیکھا ہے جو ساری دنیا کی لڑکیوں کو چھوڑ کر تمہیں پسند
ے؟"

"وجہ تو ایک ہی ہے، میرے دوست۔ میں اُس سے محبت کرتا ہوں اور وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ میری خاطر اپنے
وں کو، اپنے پیشے کو، اپنے ماضی کو چھوڑ کر یہاں چلی آئی ہے۔ اگلے مہینے ہم شادی کرنے والے ہیں۔"

"اور تم سمجھتے ہو تمہارے گھر والے تمہیں اس حماقت کی اجازت دے دیں گے؟"

"مجھے ان کی اجازت نہیں چاہیے۔ زندگی کے ایسے فیصلوں کے لیے کسی کی اجازت نہیں چاہیے۔ ماں باپ کی بھی نہیں۔
وں کی بھی نہیں۔"

"شکریہ" میں نے بڑی تلخی سے کہا تھا "تو پھر مجھے یہ سب کیوں سنا رہے ہو؟"

چلتے چلتے رک کر اُس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا "تمہاری اجازت نہیں چاہیے تمہاری محبت چاہیے
ت جج بن کر اپنے دوستوں کے اعمال کی جانچ پڑتال نہیں کرتے اُن کو اپنی دوستی اور محبت کی چھاؤں میں پناہ دیتے ہیں۔"

اس کے بعد میرا کچھ کہنا بیکار تھا۔ میں نے صرف اتنا پوچھا تھا "تو اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

اُس نے کہا تھا "کل میں اپنے وطن جا رہا ہوں۔ اپنے ماں باپ کو اس فیصلے کی اطلاع دینے۔ ماتا جی بیمار ہیں اس لیے
مہ کر اُن کو ایک دم SHOCK دینے کے بجائے خود جا کر انہیں زبانی سمجھانا چاہتا ہوں۔"

"اور اگر وہ لوگ راضی نہ ہوئے تو؟"

"تو اُن کی مرضی اور اجازت کے بغیر یہ شادی ہو گی" اور اس کے کہنے کے انداز میں اتنی قطعیت تھی کہ میں خاموش
ـا۔

اگلے دن ہم اکٹھے ہی اسٹیشن پر گئے۔ پہلے اُس کی گاڑی جانی تھی اُس کے بعد میری۔ ٹکٹ کھڑکی پر جا کر جب اُس نے کہا۔
ـ فرسٹ کلاس شام نگر" تو بابو نے پوچھا "سنگل یا ریٹرن؟"

"ریٹرن" اُس نے بڑے زور سے کہا "ہمیشہ واپسی کا ٹکٹ ہی لینا چاہیے۔"

لکشمی بھی اُسے چھوڑنے اسٹیشن پر آئی تھی۔ جب گارڈ نے سیٹی دی اور جھنڈی ہلائی اور برجو اپنے کمپارٹمنٹ میں سوار
یا تو لکشمی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

"اری پگلی، گھبراؤ نہیں" برجو نے چلتے چلتے چلّا کر کہا "میں تو پرسوں ہی لوٹ آؤں گا۔ یہ دیکھ تین دن کا ریٹرن ٹکٹ۔"

ریل چل پڑی تھی۔ اور ریل میں برجو تھا۔ برجو کے ہاتھ میں ایک ہرا واپسی کا ٹکٹ تھا۔ پھر ریل آگے جا کر اپنے انجن کے

میں آنسو تھے۔ اور ان آنسوؤں میں پریتم سے بچھڑنے کا غم بھی تھا اور اُس سے جلد پھر ملنے کی آرزو اور امید بھی تھی۔

میں علی گڑھ واپس چلا آیا۔ امتحان کی تیاریوں میں لگ گیا۔ چند ہفتے میں نے پریتم کے خط کا انتظار کیا۔ مگر کوئی خط نہ آیا۔ میں نے سوچا۔ نئی نئی شادی ہوئی ہے شاید ہنی مون پر کہیں گئے ہوں۔ پھر امتحان کے چکر میں سب کچھ بھلانا پڑا۔ امتحان ختم ہوا تو مجھے نوکری کے سلسلے میں بمبئی آنا پڑا۔ نئے نئے کام کا چکر ایسا پڑا کہ علی گڑھ لکھنؤ پریتم کشمی سب پرانی یادیں بن کر کھو گئے۔ سنہ ۴۲ء کا سیاسی ہنگامہ آیا۔ ۴۶ء میں فساد اور خون خرابے ہوئے۔ ۴۷ء میں آزادی آئی۔ میں کئی بار دنیا کے سفر کو گیا۔ زندگی میں کتنی ہی خوشیاں اور کتنے ہی غم آئے اور بگولوں کی طرح گزر گئے۔ کتنی ہی کامیابیوں اور ان سے بھی زیادہ پریشانیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر بھی پریتم اور کشمی کی یاد ایک سوالیہ نشان بن کر میرے دل کے ایک کونے میں دبکی رہی اور اُس صبح جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی وہ سوالیہ نشان دن دہاڑے ایک بھوت بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

۴

اس بار گھنٹی بجی تو وہ ٹیلی فون کی نہیں تھی۔ دروازے کی تھی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ ایک ڈھیلی سی میلی سی لش شرٹ اور پتلون پہنے ایک بوڑھا سا آدمی کھڑا موٹے موٹے شیشوں کی عینک سے مجھے گھور رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا پورٹ فولیو تھا جیسا انشورنس ایجنٹ رکھتے ہیں۔ عین اسی وقت جب میں اور پریتم پچیس برس کے بعد ملنے والے تھے یہ بوڑھا انشورنس ایجنٹ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا۔

"کیا چاہیے؟" میں نے کسی قدر درشتی سے پوچھا۔

جھریوں دار گہرے سانولے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا "کیوں بھول گئے؟ پریتم!" اگلے لمحے ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے تھے۔

"میں بہت بدل گیا ہوں گا؟" اُس نے بیٹھتے ہوئے کہا "تم نے بھی نہیں پہچانا"

یہ واقعہ تھا کہ پچیس برس پہلے کے پریتم اور اس بوڑھے میں کوئی دور کی بھی مشابہت نہ تھی۔ میں نے سوچا ضرور بیچارہ سخت بیمار رہا ہوگا۔ تبھی تو اُس کے چہرے اور بازوؤں پر کھال اُسی طرح لٹکی ہوئی تھی، جیسے اُس کے ڈھیلے کپڑے۔ میں نے اُس کو تسلی دیتے ہوئے کہا "پچیس برس میں ہم سب ہی بدل گئے ہیں۔ مجھے ہی دیکھو۔ چندیا بالکل صاف ہو گئی ہے"

اُس نے کہا "میں نے تمہارا نام ٹیلی فون ڈائرکٹری میں تلاش کیا۔ امید تو نہ تھی تم ملوگے۔ سنا ہے اکثر ہندوستان سے باہر رہتے ہو"

ٹیلی فون کے ذکر پر میں نے کہا "میں تو فون پر تمہاری آواز سن کر سمجھا تھا کوئی انگریز یا امریکن ہے۔ جس سے میں کہیں سفر میں ملا ہونگا"

"اوہ میرا (ACCENT) ایکسنٹ؟ میں بھی تو کتنے ہی برس انگلستان میں رہا ہوں۔ ویسے ہی بات کرنے کی عادت ہو گئی ہے"

نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بات کہنا چاہتا ہے اور اُسی بات کو چھپانا بھی چاہتا ہے۔
کئی قسم کے خیالات اور خدشے میرے دماغ میں آئے۔
شاید اُس کی نوکری چھوٹ گئی ہے۔ بیکار ہے۔ شاید مدد مانگنے آیا ہے۔ شاید اُس کو شراب کی لت پڑ گئی ہے۔ تب ہی بہکا بہکا سا لگتا ہے اور اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں کانپتی ہیں۔
شاید اُس نے کوئی جرم کیا ہے۔ اس لیے اُس کی آنکھیں بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہیں۔
کئی سیکنڈ تک، ہم دونوں ایک دوسرے کے چہرے میں اپنے ماضی کی تلاش کرتے رہے۔
پھر میں نے کہا "کیوں۔ بمبئی اکیلے ہی آئے ہو۔ بھابی ساتھ نہیں ہیں کیا؟"
اُس کے جواب نے مجھے چونکا دیا "میں نے طلاق لے لی ہے"
لیکن اب کم سے کم اُس کی پریشانی کی وجہ تو معلوم ہو گئی۔ اتنے برسوں کے شدید عشق کے بعد اگر طلاق کی نوبت آئی ہے تو اس حالت پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے تھا۔
میں نے کہا "بڑا افسوس ہے، برجو۔ لیکن ہوا کیا جو طلاق لینی پڑی؟ اس عمر میں تو میاں بیوی کو ایک دوسرے کے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے"
"نہیں بیومی! اُس نے اُن دو لفظوں کو کسی کڑوی دوا کی طرح تھوکا "پہلے دن ہی سے ہماری شادی ایک جھوٹ تھی۔ ایک بھیانک غلطی تھی۔ چھبیس برس تک میں نے اس غلطی سے نباہ کیا، اس جھوٹ کو سچ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں کامیاب نہ ہوا"
میری سمجھ میں نہ آیا کیا کہوں۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ میرے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بیچارہ مجھ سے کوئی صلاح مشورہ کرنے کے لیے نہیں اپنے دل کا بخار نکالنے کے لیے آیا تھا۔
کانپتی ہوئی انگلیوں سے اُس نے ایک سگار جلایا۔ اور مُنہ سے دھوئیں کا ایک بادل اُڑاتا ہوا بولا "تم سوچ رہے ہو گے کہ میں اتنے برس کہاں غائب رہا۔ شادی کے فوراً بعد ہی میں بیوی کو اپنے ماں باپ کے پاس چھوڑ کر انگلستان چلا گیا۔ آئی سی ایس کا امتحان دیا اور بدقسمتی سے پاس ہو گیا"
"تو تم آئی سی ایس میں تھے۔ اور ہمیں کبھی پتہ ہی نہیں چلا؟"
"میں کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ تم لوگ اُن دنوں سرکاری نوکریوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے، ستیاگرہ کر کے جیل جا رہے تھے۔ میں کس مُنہ سے تم لوگوں کے سامنے آتا۔ اس لیے میں نے جان بوجھ کر ایسے ایسے مقام چنے جہاں کسی پرانے دوست سے ملاقات نہ ہو "پہلے کئی سال فرنٹیر میں رہا۔ پھر آسام میں۔ پھر کورگ میں۔ وہیں ہمارا پہلا لڑکا پیدا ہوا......"
کتنی ہی دیر وہ دھوئیں کے بادلوں میں نہ جانے کیسی کیسی تصویریں بناتا اور بگاڑتا رہا۔
پھر وہ بولا "مگر وہ ہمارا لڑکا نہیں تھا۔ وہ اُس کا لڑکا تھا۔ جو میرے ایک چپراسی سے پیدا ہوا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو تم سمجھ سکتے ہو میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ چند مہینے تک تو میں بالکل پاگل ہو گیا۔ شراب تو میں پہلے بھی پیتا تھا لیکن اب میں

نے اپنی دولت کو ڈبونے کے لیے اندھا دھند پینا شروع کر دیا۔ جب وہسکی سے کام نہ چلا تو کوکین کھانے لگا۔ تین مہینے پاگل خانے میں علاج کرایا۔ اور جب علاج کرا کے کسی قدر حواس پر قابو پایا اور باہر نکلا تو نوکری سے استعفیٰ دینا پڑا۔ ذلیل ہو کر نکالے جانے سے یہی بہتر تھا کہ میں خود ہی بیماری کا بہانہ کر کے وقت سے پہلے پنشن کی درخواست دے دوں۔ میں نے اُس کی منت کی کہ مجھے طلاق دے دو۔ بچے لے جاؤ۔ میری ساری پنشن لے لو۔ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اپنی نئی زندگی بنا سکوں۔ لیکن وہ نہ مانی۔ بولی۔ "تم نے میری زندگی تباہ کی ہے اب تم مجھ سے اتنی آسانی سے چھٹکارا نہ پاؤ گے۔"

"پھر؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"پھر میں ان دونوں کو لے کر انگلستان چلا گیا۔ ہندوستان میں اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ تھا۔ پنشن بیچ کر جتنا روپیہ وصول ہوا اُس سے میں نے لندن میں مکان خرید لیا۔ ایک حصے میں ہم خود رہتے تھے اور باقی میں ہندوستانی اور افریقن طالب علم کرایہ دار رہتے تھے۔ بس یہی ہمارے گزارے کی صورت تھی۔"

"پھر؟"

"پھر وہی پرانی کہانی دہرائی جاتی رہی۔ اب مجھ میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ میں اس بدکار سے کوئی باز پرس بھی کر سکتا۔ رات کو جب تک "پب" بند نہ ہوتا میں وہاں بیٹھا شراب پیتا رہتا تھا اور وہ ان نوجوان طالب علم کرایہ داروں سے کرایہ وصول کرتی رہتی تھی۔ دس سال میں تین اور بچے ہو گئے۔ ایک بالکل کالا۔ ایک سانولا۔ ایک گورا۔

مجھے اپنے دوست کی حالت پر رحم بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول ہی پڑا۔ "اور تم نامردوں کی طرح سب دیکھتے رہے اور تم سے یہ نہ ہوا کہ دو جوتے رسید کرتے اور نکال باہر کرتے اس چھنال کو۔ میں نے تو چوبیس برس ہوئے تم سے کہا تھا، برجو، رنڈی کی بیٹی سے سوائے بے وفائی کے تم اور کچھ نہ پاؤ گے۔"

"رنڈی کی بیٹی؟" اُس نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں ہاں رنڈی کی بیٹی لکشمی!" میں نے نفرت سے بھرپور لہجے میں وہ نام لے ہی ڈالا جو اتنی دیر سے ہم دونوں کے درمیان ایک پہیلی بنا ہوا تھا۔ جس کو بوجھنے کی ہمت نہ مجھ میں تھی نہ اس میں۔

"لکشمی؟" اُس نے ایسے لہجے میں دہرایا جیسے عمر میں پہلی بار یہ نام سنا ہو۔ پھر وہ بے اختیار ہنس پڑا اور ہنستا رہا ہنستا رہا۔ ایک قہقہہ کے بعد دوسرا قہقہہ اُسے ہنسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ لیکن اس ہنسی میں ایک کھوکھلی سی آواز ہی آواز تھی کوئی مسرت نہ تھی۔ میں حیرت سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔

"تو تم سمجھ رہے ہو کہ میں اب تک مسز لکشمی کا ذکر کر رہا ہوں؟"

"تو اور کیا؟" میں نے کہا۔ "اُسی سے تو تم نے شادی کی تھی نا؟"

"کاش ایسا ہی کیا ہوتا، دوست" اُس نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سی سانس بھر کر کہا۔ "مگر جس سے میری شادی ہوئی وہ طوائف کی بیٹی لکشمی نہ تھی ایک جاگیردار کی بیٹی موہنا تھی۔"

"موہنا" اور میں نے اس حسین چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی جو میں نے لکھنؤ کے مے فیر ریستوران میں دیکھا تھا۔

اور پچیس برس کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ کاجل کا حاشیہ لگی ہوئی آنکھوں میں ایک عجیب آگ چمک رہی ہے۔ اُس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن اسی آگ میں برجو کی زندگی جھلس جائے گی "اور لکشمی؟" میں نے پوچھا یہ لکشمی کا کیا ہوا؟ آخری بار جب ہم لکھنؤ میں ملے تھے مجھے یاد پڑتا ہے تم تین دن کا واپسی ٹکٹ لے کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ اپنے ماں باپ کو اُس شادی کی اطلاع دینے؟

جواب میں اس نے کچھ نہ کہا۔ جیب سے ایک پرانا بٹوہ نکالا اور اس میں سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ۔ اس کاغذ کی تہوں میں سے ایک ریلوے ٹکٹ کا آدھا حصّہ نکالا جو برسوں کے بعد اتنا پرانا ہو گیا تھا کہ اس پر چھپے ہوئے سب حرف غائب ہو گئے تھے۔ صرف اس کے سائز سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی یہ ریٹرن ٹکٹ کا واپسی والا آدھا حصّہ رہا ہو گا۔

اب میں کچھ کچھ سمجھا کہ کیا ہوا ہو گا۔

"تو جب تم گھر پہنچے تو کنور صاحب اور کنور رانی کو قائل نہ کر سکے۔ تمہارے ماتا پتا نے تمھیں جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی؟"

اُس نے سر ہلا کر اقرار کیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔

"انھوں نے تمھیں لکھنؤ واپس جانے سے بھی روک دیا؟"

اُس کے سر کی جنبش نے اثبات میں جواب دیا۔

"انھوں نے زبردستی تمھاری شادی اپنے جاگیردار دوست کی بیٹی موہنا سے طے کر دی؟ انھوں نے تمھیں انگلستان بھیجنے کا لالچ دیا۔ انھوں نے تمھیں ڈرایا کہ اگر تم نے طوائف کی بیٹی سے شادی کر کے سماج میں سکینڈل برپا کیا تو تمھیں نہ صرف آئی۔سی۔ایس سے ہاتھ دھونا پڑے گا بلکہ کوئی بھی معقول نوکری نہ مل سکے گی؟"

اُس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا "تمھیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"

میں نے کہا "ایسا ہمارے ملک میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ فلموں میں بھی۔ زندگی میں بھی۔ اور اُن دنوں میں تو اور بھی کچھ ہوتا تھا۔ سماجی انقلاب کے بارے میں تقریر کرنا اپنی زندگی میں انقلاب لانے سے زیادہ آسان تب بھی تھا اور اب بھی ہے"

"اپنی اُسی کمزوری کا خمیازہ آج تک میں بھگت رہا ہوں۔ میں جو دبو دراس کی کمزوری پر ہنستا تھا" ایسا لگتا تھا کہ وہ ایسی باتیں کر کے اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا ہے۔

"اور شاید ریٹرن ٹکٹ کی تین دن کی مدت گزر گئی اور تم لکھنؤ واپس نہ آئے اور واپسی کا حصّہ بیکار تمھاری جیب میں پڑا رہا؟"

"یہی تو مشکل ہے، میرے دوست!" اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ "زندگی کے سفر میں ریٹرن ٹکٹ نہیں ملتا۔ جہاں سے ہم چلے ہیں اور جن مقاموں سے گزرے ہیں ہزار کوشش کرنے پر بھی ہم وہاں لوٹ کر نہیں جا سکتے۔"

۵

" تو اب کیا ارادہ ہے ؟" میں نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

برجو نے کہا " میں نے موہنا کو لندن کا گھر دے دیا ہے۔ اپنی ساری جائیداد اس کے نام لکھ دی ہے۔ اس قیمت پر وہ مجھے طلاق دینے پر راضی ہوئی ہے "

" تو کیا وہ —— موہنا —— ہمیشہ سے ایسی تھی ؟ "

" نہیں۔ تب ہی تو پچیس برس نباہ کرنے کی کوشش کی میں نے "

" پھر ایسی کیسے ہو گئی ؟ "

کچھ دیر تک برجو خاموش رہا۔ اُس نے ایک نیا سگار جلایا۔ آہستہ آہستہ اس نے کئی کش لیے۔ پھر وہ بولا " گناہ گار تو میں ہی ہوں۔ میں اُسے وہ کچھ نہ دے سکا جسے وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔ کوشش کرنے کے باوجود میں اُس سے محبت نہ کر سکا "

" تو کیا، اُسے لکشمی کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا ؟ "

" شادی کے سال بھر بعد معلوم ہو گیا تھا۔ اُس وقت میری پوسٹنگ فرنٹیئر میں تھی۔ ایک رات میں کلب سے بہت شراب پی کر لوٹا تھا۔ جب میں اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے گیا تو چاندنی میں دیکھا کہ سفید کپڑے پہنے لکشمی میرے پلنگ پر بیٹھی ہے۔ میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ بہت پیار کیا۔ اُس نے کہا برجو تم تو رو رہے ہو ؟ کیا ہوا ؟ میں نے کہا۔ وعدہ کرو اب مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جاؤ گی، لکشمی۔ لیکن وہ لکشمی نہیں تھی۔ وہ موہنا تھی۔ اور اُس رات کے بعد سے موہنا بھی وہ نہ رہی۔ کچھ اور ہی ہو گئی۔ پہلے اُس نے میرے ساتھ شراب پینا شروع کی۔ پھر دوسروں کی ساتھ۔ اُس کے بعد جو ہوا وہ تم کو معلوم ہی ہے۔ مگر میں اب بھی اُسے دوش نہیں دیتا۔ اپنی تباہی اور اُس کی تباہی دونوں کا ذمہ دار میں ہوں "

" اور لکشمی "

" اُس کی زندگی بھی میری وجہ سے تباہ ہو گئی۔ جب میرا سہارا چھوٹ گیا تو اُسے اپنی ماں کے پاس جانا پڑا۔ وہ سب کرنا پڑا جس سے صرف میں اسے بچا سکتا تھا۔ بنارس سے دہلی کے چاوڑی بازار میں آئی۔ وہاں سے کلکتہ کے سوناگاچی میں۔ وہاں سے بمبئی کی فورास روڈ پر۔

اب سُنا ہے کہ وہ بڈھی اور بیمار، اس دھندے کے لیے بیکار ہو کر بنارس لوٹ گئی ہے۔ وہاں کسی مندر کی سیڑھیوں پہ پڑی ہے۔ اور . . . . . . اور . . . . . . "

" اور ؟ " میں نے پوچھا۔

" میں اس کے پاس جا رہا ہوں "

اُس شام کو جب میں اُسے چھوڑنے سٹیشن پہ گیا اور ہم ٹکٹ خریدنے لگے تو بابو نے حسب معمول پوچھا۔ سنگل یا ریٹرن

نو برجو نے جلدی سے کہا "سنگل" اور جب پلیٹ فارم پر پہنچ کر مجھ سے بولا "یہ میرا آخری سفر ہے۔ اس پر مجھے واپسی کے ٹکٹ کی ضرورت نہیں"

ٹرین روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک عجیب معجزہ دیکھا۔ وہ جھریوں دار چہرے اور کھچڑی بالوں والا بوڑھا اب بوڑھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے گال ایک عجیب مسرت اور جوش سے تمتما رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی چمک رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایک کرارا پن آگیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے وہ اپنا ہی پچیس برس والا برجو لگا۔

میں نے کہا "برجو لکشمی بھابی کو میرا پرنام ضرور کہنا۔ تمھیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہم تمھارے رقیب نہیں ہیں"

میں نے دیکھا کہ وہ نئے نویلے دولھا کی طرح شرما رہا ہے۔

خلش

ابوالفضل صدیقی

کیا کہنے! کیا معقول جواب آیا میرے اس مراسلہ کا:-

چونکہ وقت مقررہ سے آپ لوگ پورے بارہ روز لیٹ ہو
چکے ہیں، یوں بھی پروگرام بے وقت بنا تھا اور اب تو اواخر
مارچ آ لگا، گرمی ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی لہذا اب
آئندہ سیزن کے لیے ملتوی کر دیجئے...... ۳۰ مارچ

اطلاعاً تحریر ہے کہ ہم لوگ مع چند موقر مہمانوں کے کل دوپہر
یقینی طور پر پہنچ رہے ہیں۔ لنچ وہیں کیمپ پر ہوگا۔ نیز یہ کہ ہم
کو پروگرام یاد نہ رہا تھا آج آپ کے خط پر خیال آیا......

۳۱ مارچ

اور مجھے ان صاحبزادگان سے زیادہ اپنی حماقت پر غصہ آ رہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے دیوانہ کے ہاتھ میں اینٹ تھما دی نہ یہ لکھتا کہ مت آؤ اور نہ یہ آتے، اور پھر غور کیا تو یک نہ شد دو شد، چند موقر مہمان بدنصیب اس تپتے ہوئے جنگل میں اور گھسیٹے جا رہے ہیں اور مہمانوں کی وجہ سے جتنا کام اور ذمے داری بڑھے گی وہ مجھ کم بخت کے سر پڑے گی، خود ہی کیا کم تھے اور مہمان ساتھ باندھ کر لا رہے ہیں بھلا پہلی اپریل کو شکار کھیلنے کے لیے اور مہمانوں کے ساتھ آنا کون سی عقلمندی ہے۔ میں نے تو اس خیال سے ضابطہ کی اطلاع دی تھی کہ کل ہی کیمپ اکھیڑ کر گھر چل دوں گا بھلا ان الھڑ نوجوانوں کو کون سمجھائے۔ چڑھتی گرمی ہے، ہر گھنٹہ میں بڑھ رہی ہے آج کا دن کل سے اور کل کا دن پرسوں سے زیادہ گرم تھا، مچھروں کا بس نہیں کہ ایک ہی رات میں سب چوس ڈالیں، مچھر دانی تک کھسوٹے پھینکتے ہیں۔ اور سب کچھ غور کرنے کے بعد میں نے حکم دیا کہ کیمپ یہاں سے اکھیڑ کر ڈاک بنگلہ کے کمپاؤنڈ میں لگایا جائے تاکہ دوپہر میں کمروں کے اندر آرام مل سکے حالانکہ کمرے بھی کیا تھے دیواریں چھت کل تعمیر لکڑی اور بانس کی آڑ تھی، تاہم کیمپ سے بہتر تھے اور چھوٹے چھوٹے انتظامات کیے خاص طور پر مہمانوں کی آمد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر چیز پر خاص توجہ دینی پڑی۔

مگر شام کو بیرا اور خانساماں دونوں جمع ہو کر میرے پاس آئے اور بہت ڈرتے ڈرتے کہا کہ مرغی، انڈا، اور ہر قسم کی جنس

جملہ شیبابہ افراط موجود ہیں مگر بڑا گوشت خراب ہو گیا اور کل لنچ پر کباب پسندہ وغیرہ قیمہ کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔"

میرے جی میں آیا کہ سر پیٹ لوں، اور پھر ساری جھونجھلاہٹ انہیں پر اتار دی "بے ایمانو، تم دونوں خوب جانتے ہو کہ صاحبزادگان بغیر کباب کے نوالہ نہیں اٹھاتے ہیں، اللہ تمہیں غارت کرے، نمک حرامو، سورو، یہ وقت تھا اطلاع دینے کا، دور منہ سے۔"

"پہلے تو حضور، ہم تمام دن کیمپ کی اکھیڑ پچھاڑ میں لگے رہے اور پھر حضور کل سے گرمی کی وہ دھمک پڑی ہے کہ برف میں لگے ہونے کے باوجود بھی بڑا گیا پورا دس سیر گوشت۔"

بہت اچھا ہوا، جل گیا۔ میں کیا کروں، کل لنچ بے مزہ معلوم ہو جائے گا۔ میں تو صاف کہہ دوں گا کہ حرام خوروں نے گوشت خراب کر دیا اور مجھ کو شام کو بتایا، ورنہ کچھ انتظام کرتا۔"

"حضور گوشت تو گوشت ہی ہے، کچھ گھی ہی چپاتا ہے نہیں غور فرمایئے لاکھ برف میں لگا ہو، ابھی آج دو ہفتہ کٹے ہوئے ہو گئے کہاں تک سالا نشے اس جھلسی گرمی میں۔"

"ارے حرام خورو، سورو، میں یہ کب کہتا ہوں، وہ تو ٹھیک ہے، لیکن ذرا دن سے بتلا دیتے تو کچھ مار لاتا، اب کیا کل اپنی ٹانگ کاٹ کر کباب دو گے؟ ابے آں، آؤں، ہوں، وہ کچھ نہیں میں تو تم کو سامنے پیش کر کے علیحدہ ہو جاؤں گا اور کہہ دوں گا کہ مجید کو اطلاع نہیں دی، ورنہ میں ذرا دیر میں کوئی چیز مار لاتا۔ آؤں، اور حرامزادو اور شکار تو پیچھے کریں گے پہلے تمہارا ہی قیمہ کر دیں گے۔"

مگر حضور، ہمارا قصور بھی کیا، ابھی دو پہر تک شامی کباب بنانے میں کوئی بات نہ تھی، آپ نے کھائے ہی ہیں۔ ابھی ابھی اس وقت یکدم محسوس ہوا کہ جل گیا اور کل دوپہر تک بد بو سے جائیگا۔"

"خوب کیوں ؟"

"میں نے عرض کیا نہیں حضور، آخر کو گوشت ہے اور آج دس بارہ روز کا رکھا ہوا ہے، لاکھ برف سہی، پھر موسم کون آنکا"

"اور یہ بات بھی ہے اور یہ بھی کہ آج کیمپ یہاں سے داں منتقل کرنے میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے فرج بند ہو گیا اور بس حضور، اتنی ہی دیر میں یہ جل گیا۔"

"اور حضور جانتے ہی ہیں کہ برف کی لگی چیز یہاں ذرا برف سے ہٹی اور گئی۔"

"اچھا خیر اس سے کہہ دو شکاری خاں سے کہ آدھی رات کھسے مجھے جگا لے، چاند کی آخری تاریخیں ہیں پچھلے پہر چاندنی پسار لیتی ہے، اب تو اندھیرا ہو گیا ذرا دیر پہلے تو کوئی بات نہ تھی کوئی چیتل جھانک ٹٹول لاتا ——— اور تمہیں تو کل ڈیڑھ دو بجے لنچ پر دینا ہے، اور میں انشاء اللہ صبح کی چاء کے وقت پہلے کر پلٹ بھی آؤں گا۔"

شکاری خاں کے جگانے پر میں اٹھا مگر ترنگ مار کر نہیں جیسا کہ بالعموم پچھلے پہر علی الصبح شکار کو جانے والے شوقینوں کا انداز ہوتا ہے، بلکہ یک گونہ کراہیت اور سستی سی محسوس ہو رہی تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں آج شکار کو نہیں گوشت کے لیے جا رہا تھا، جلدی جلدی کپڑے پہنے جیبوں میں کارتوس بھر لے۔ شکاری خاں نے ایک کاندھے پر رائفل ٹانگی دوسرے پر تھیلا، پانی کی بوتل لٹکائی، میں آگے آگے وہ پیچھے پیچھے چپ چاپ کیمپ سے نکل کر چل دیئے سمت کا تعین جیسے دل ہی دل میں ہو گیا اس سلسلہ میں بھی بات کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ تقریباً دو فرلانگ بڑھنے کے بعد میرا موڈ اپنی جگہ پر آ گیا اور میں اپنی اصل پر پلٹ آیا اندر والا شکاری

ہو گیا اور جب شکاری نے ایک گہری نگاہ پھینکی تو اس کو پیچھے ہٹا کر اور بھی اندر سے مناظرِ فطرت کا شیدائی آ گیا۔ میں وقت کی کیفیت اور ماحول کی اداسی اور اس نیرنگی میں کھو کر رہ گیا۔ زوالِ ماہ کا دوسرا ہفتہ شروع ہوا تھا، آخیر تاریخوں کا کٹا ہوا کمزور مگر زرد بیمار بیمار نحیف سا چاند میرے عین سامنے پہاڑی کی چوٹی سے اُچک رہا تھا۔ زرد زرد جیسے روح سی چاندنی میں سنسان ماحول جیسے اُبھرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں خارجی و داخلی ہر پہلو سے چاق و چوبند تھا، دھندلے ماحول کے نشیب و فراز، چاندنی کی علیل روح، اور جنگل کا مہیب سناٹا سب مل کر مجھ کو دبانا چاہتے تھے اور ایک قنوطی احساس کی جانب لے جانا چاہتے تھے، مگر موسمِ بہار کی کیف آگیں مستانہ وار بہالی چلتی ہوئی نسیمِ سحری شرابِ دو آتشہ بنی ہوئی سب پر حاوی تھی اور جیسے میری سانس کے ساتھ شکر کی صورت میں نفوذ کر کے رونگٹے کھڑے کئے پر ہلکا سرور طاری کر رہی تھی، شکار کے قاعدہ کے موجب میں گنگنا تو نہ سکتا تھا مگر جیسے میرے اندر آہستہ آہستہ ساز بج رہا تھا اور جہانِ فطرت کے اس انوکھے نظارہ میں جس میں سب کچھ نظر آنے کے باوجود کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا اور جو کچھ دکھائی دے رہا تھا حسن ہی حسن معلوم ہو رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شبک رو نسیمِ سحری میرے جسم کو آہستہ آہستہ اس غمناک ماحول میں حل کر رہی ہے، جیسے میرا وجود اسی پھیکی پھیکی خنک نمناک چاندنی سے ہی تشکیل پائے ہوئے ہے اور میں پھر اسی میں ملا جا رہا ہوں۔ والہانہ انداز میں بڑھتا ہوا اس پہاڑی کے اس ڈھال سے چڑھ کر اس ڈھال سے اُترا درمیان کی وادی طے کر کے اس چوٹی پر پہنچ گیا جہاں پہلے چاند اُبھرتا نظر آیا تھا اور اب چاند دور دست دور گھنے جنگل کے بلند و بالا درختوں کی پھنگیوں پر لٹکا دکھائی دیا۔ اور اس پہاڑی کے ڈھال سے اُتر کر اور دوسری مسطح وادی طے کر کے سامنے والی ایک اور پہاڑی کی جانب بڑھا جو نسبتاً کم بلند تھی اور جس کے ڈھال چاروں طرف دور تک پھیلے ہوئے تھے اور پہاڑی سے زیادہ ٹیلے سے مشابہ تھی اس پر جھاڑیاں گھاس اور درخت بھی کچھ مسطح وادی جیسے اور کچھ اونچی پہاڑیوں پر اُگنے والی قسم کے ملے جلے تھے اور نسبتاً زیادہ گھنے تھے اور اس کی نوک چوٹی جیسی ڈھلوان نہ تھی بلکہ مسطح قطعہ کی شکل میں تھی اور جب میں نے اس کا ڈھال طے کیا تو اندازہ کیا کہ یہ اوپر سے ہلکے اُتار کی شکل میں سامنے والی وادی سے مل گیا ہے جیسے اونچائی اور نیچائی نے نہایت مناسب انداز میں سمجھوتہ کر کے اپنا سلسلہ ملا لیا ہے اور اب سامنے وادی بڑے لق و دق میدان کی شکل میں تھی، اس میں ایک جانب بڑا مہیب سال، سیمل اور ٹیک کا جنگل تھا جس میں گھاس سے لے کر فلک بوس درختوں کی چوٹیوں تک درمیانی جھاڑیوں اور پیچ در پیچ بیلوں نے ایسا بے پناہ سلسلہ ملا رکھا تھا کہ اس کے اندر ان پگڈنڈیوں کے علاوہ جو مختلف النوع جنگلی جانوروں کی گزرگاہیں تھیں دو قدم بھی اِدھر اُدھر بڑھنا ناممکن تھا۔ اور اس میدان میں اسی جنگل کا سلسلہ دونوں جانب سے رفتہ رفتہ کم گھنا ہو کر چھدرا ہوتا چلا گیا تھا، اس میں بلند درخت ذرا دور دور تھے، بڑی بڑی جھاڑیاں جگہ جگہ تھیں مگر مسلسل اچھی قسم کی گھاس بڑی گھنی اور زوردار تھی اور یہ جنگل کم اور میدان زیادہ قسم کی جگہ جنگلی چرندوں کی چراگاہ تھی جو ہزاروں مربع میل میں مشتمل ہو گی، اس کے دو کناروں پر لگا ہوا گھنا جنگل جانوروں کی پناہ گاہ تھی اور ہر وقت تقریباً چھوٹے بڑے ہر جانور کے اس چراگاہ کے میدان پر رہنے کا تھا۔ ڈھلان کے ختم پر آخری قدم ڈال رہا تھا کہ میں نے یکدم محسوس کیا کہ بیمار اور کمزور چاندنی پر موت کی زردی چھانے لگی، صبح کاذب کے آثار رونما ہوئے اور ایک جماہی سی لے کر اوپر نگاہ اُٹھائی تو تاروں بھرے آسمان پر ایک خطِ نور مشرق سے مغرب تک کھنچا دکھائی دیا، پیچھے پلٹ کر دیکھا تو سُکھ بڑے زور سے ٹمٹما ٹمٹما کر جیسے تاریکی کی شعاعیں سی پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا اور سامنے نظر اُٹھی تو مغربی اُفق پر مشرق کے انعکاس سے نور پاشی شروع ہو رہی تھی، اور بمشکل دو ڈھائی سو قدم بڑھا پایا ہوں گا کہ جیسے جادو سے ہو گیا، مرتے چاند اور اُبھرتے سورج کی آویزش میں چپکے سے سمجھوتہ ہو گیا اور چاندنی

نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ سپیدۂ صبح کا روپ دھار لیا، تارے دھندلی دھندلی نیلی، واہیں چھپ گئے اُوپر سے نیچے تک دائیں بائیں آگے پیچھے نورِ سحر کی لہروں کا تابناک و نم ناک سلسلہ مل گیا، مرغیاں کڑکڑائیں اور مرغوں نے جنگل کے اندر شاخ شاخ پتہ پتہ کا رشتہ اپنی بانگوں سے جوڑ دیا، موروں نے ارغنوں بجائے اور مست تیتروں نے پٹیل پٹیل کہنا شروع کیا۔ اور یک تمام جنگل سر پر اُٹھا لیا، کہیں کہیں دور کوئی چیتل اور سانبھر دھاڑا، اور جگہ جگہ کاکڑ بھونکا اور میرے کان ان آوازوں پر چونکے، جمالِ فطرت کا شیدائی اندر دبک گیا اور شکاری بڑھ کر آگے آ گیا۔ اکڑی ہوئی، ترچھی گردن، تند گام اور نظر کی کمندیں تیز تیز اچھلنے لگیں، پلٹ کر شکاری خاں کے ہاتھ سے رائفل لے لیا اور جیسے میری چھٹی حس بروئے کار آ گئی، اور جس وقت یہ شدید ہوتی ہے تو الہام سا ہوتا ہے اور یک دم کچھ نہ کچھ شکار سامنے آ جاتا ہے اور میں بڑی دقتِ نظر کے ساتھ چھدرے جنگل نما گھاس کے میدان کا جائزہ لیتا اور قدم قدم پر کوئی شکار سامنے آنے کے خیال میں کھویا بڑھ رہا تھا کہ یک دم شکاری خاں نے میرا ہاتھ چھو کر میری توجہ کچھ کھوجوں کی جانب زمین پر مبذول کی، اور دو فوراً شوق سے میرا دل سرشار ہو گیا۔ ہیل کے ایک گلہ کی خبر اپنے جنگل میں مدتوں سے سن رہا تھا اور یہ اسی کے کھوج تھے، اور میں نے جنگل تو جنگل کبھی چڑیا گھر بھی نہ دیکھا تھا در اصل یہ ہمارے جنگلوں میں پایا ہی نہیں جاتا ہے ویسے جس وقت بھٹک کر دو تین آتا ہے تو اس کا چھوٹے سے چھوٹا دھاوا پچاس تیس میل کا ہوا کرتا ہے، شروع سیزن میں ان کے ایک گلہ کی آمد کی خبر سُنی تو یقین نہ آیا کیونکہ وہ جنگلات جہاں یہ پایا جاتا ہے بندھیاچل کی ترائی کے ہیں یا زیادہ سے زیادہ قریب ہیں تو تین چار سو میل وسط ہند کے اور اودھ فارسٹ میں ان کا وجود بالکل عجوبہ چیز تھا۔ مگر موجود تھے اور میرے سامنے ان کے کھوج تھے اور کھوج بھی بالکل تازہ یہی آدھی گھنٹہ پہر کے اندر کے، ساتھ ہی ساتھ کھوجوں کے نشانات کا انداز ایسا تھا کہ بالکل شانت تھے اور مزے مزے چرتے ہوئے کبھی گنجان اور کبھی چھدری کبھی ادھر اُدھر گھاس میں گھومتے ہوئے آہستہ آہستہ چرتے بڑھے تھے اور میں نے کھوجوں سے بھی اندازہ لگا لیا کہ بس زیادہ دور نہیں گئے ہیں۔ میرا ان کے شکار کے متعلق ذاتی تجربہ تو تھا نہیں ایسے ہی شکاریوں کی زبانی سُنا تھا اور ان کی جبلت کے متعلق ان شکاریوں میں سے بھی اکثر کا علم کتابوں کا تھا ایک دو ایسے شکاریوں سے بھی ان کے موضوع پر گفتگو رہی تھی جنھوں نے خود تو مارا نہیں تھا مگر جس پارٹی میں یہ شریک تھے ان میں ساتھیوں نے شکار کیا تھا اور ان کے شکار کے متعلق میرا جو تجربہ تھا وہ ظاہر ہے۔ اور کھوجوں پر بڑھنے سے پیشتر ہی مجھے یک دم دھچکا سا لگا اور میں ہاتھوں ہی ہاتھوں میں آہستہ آہستہ اپنے رائفل کو کچھ [illegible] سی لے کر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ یہ ۳۰۰۔ اسپرنگ فیلڈ تھا، ہائی ولاسٹی، ہلکی اور تیز رفتار گولی والا ہتھیار، پتلی کھال کے جانوروں کے شکار کے لیے موزوں ہے، زیادہ فاصلہ پر صحیح اور مہلک چوٹ پہنچانے کے لیے بالکل مناسب، قصہ مختصر، بارہ سنگھے سے لے کر سانبھر تک اور درندوں میں بگھیرے سے لگا تیندوے تک بہت کافی ہے اور اس کا بنانے والا تو شیر کے لیے بھی اس کو بالکل ٹھیک بتاتا ہے اور تجربات بھی کہتے تھے کہ ٹھیک ہی ہے مگر شیر کے شکاری عام طور پر اس کو استعمال نہیں کرتے ہیں بلکہ اس سے اور زیادہ موزوں بور پسند کرتے ہیں، لیکن اس شکار کے لیے جس سے میں اس وقت دوچار تھا نہ تو اس کا بنانے والا ہی اس کو استعمال کرنے کے لیے کہتا ہے اور نہ شکاریوں کا ہی کوئی گروہ اس کے متعلق اپنا تجربہ بتا کر موزوں بتاتا ہے، اس شکار کے لیے تو چند مخصوص وزنی گولی والے اور شدید صدمہ پہنچانے والے کارڈائٹ بارود کے رائفل ہیں اور مجھے اپنا دونالا ۴۵۰/۴۰۰ کارڈائٹ یاد آیا جو یہاں سے کم و بیش دس میل کے فاصلہ پر کیمپ میں میری چارپائی کے نیچے بکس کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اور یہ تو

اہم مسئلہ تھا۔ ایک معمولی بات کمزور ہتھیار کے استعمال کی یہ ہے کہ شکار گھائل ہو کر بھاگ جاتا ہے ہاتھ بھی آتا نہیں اور ایک مدت تک سخت اذیت میں مبتلا رہ کر گھل گھل کر مرتا ہے جو اسپورٹس مین کے مسلک میں بڑی مذموم چیز ہے اور یہاں پیاس کو جلد از جلد ختم کرنا اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے جس سے روبراہ ہونا ناممکن ہوتا ہے اور پھر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ——— کبھی کبھی گھائل ہو کر انتقام کی آگ میں حملہ بھی کر دیتا ہے اور اس کی جبلت بڑے درجہ کی منتقم ہے۔ یہاں تک کہ اگر شکاری کسی ایسی جگہ پر پناہ لے لے جو اس کی رسائی سے باہر ہو مچان یا درخت وغیرہ تو یہ انتقام کے جنون میں اس کے ارد گرد منڈلاتا رہتا ہے اور ہٹتا نہیں ہے خواہ وہیں یہ سوکھ سوکھ کر مر جائے، انتقام کی آگ نہیں بجھتی اور اس کے متعلق بعض دکن اور سی پی کے شکاریوں کے سنائے ہوئے دو ایک قصے بھی ذہن میں ابھرے جنہیں سنتے وقت میں نے کہانی اور شکاری گپ سے آگے نہ سمجھا تھا۔ اور جیسے مجھے کسی نے پیچھے کھینچا، رائفل کا وزن بہت ہلکا محسوس ہوا گویا ہمارا ہاتھ خالی ہے۔ مگر سینہ کے اندر شوق کی لہر جو اٹھی تو اس کی رو میں ہم دونوں نے کھوجوں پر بڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اس رائفل کے سب سے بھاری ۲۵۰ گرین والی ٹھوس گولی کے کارتوسوں کی ڈبیہ جیب سے نکالی، میگزین میں سے ہلکی اور پھٹنے والی گولی کے کارتوس علیحدہ کئے اور انہیں بھر کر میگزین فٹ کیا۔ اس ۲۵۰ گرین والی ٹھوس گولی کا جو لٹریچر کارخانہ والوں نے بھیجا تھا اس میں بھی انہوں نے یہ تو نہ لکھا تھا کہ یہ ہیبل کے شکار کے لیے ٹھیک ہے البتہ یہ ضرور لکھا تھا کہ یہ گولی میگنم کارڈائٹ رائفلوں کی گولی کا ایک حد تک کام دے سکتی ہے اور اچھی چوٹ پڑ جائے تو بعض موٹی کھال والے بڑے جانوروں پر بھی مؤثر ہو سکتی ہے۔ اور مجھے جیسے یکدم اپنے اس سیک ۳۰۰ اسپرنگ فیلڈ میں ہی اپنے دونالے ۴۵۰/۴۰۰ کا وزن محسوس ہونے لگا ——— اونہہ، سب بیکار واہمہ، اور شکاری کو مفروضہ خطروں سے ڈرنے کے معنی یہ ہیں کہ شکار چھوڑ دے اور ہم دونوں بڑے شوق و انہماک میں سب کچھ پس پشت ڈالے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کھوج بہت واضح تھے اور زمین نم تھی، مگر زمین تک نگاہ لے جانے کی نوبت نہ آئی تھی، گھاس شبنم آلود تھی اور دور تک ان کا راستہ علیحدہ شاہراہ کی طرح دکھائی دے رہا تھا اور چند قدم ڈالنے کے بعد ہماری نظریں دور کا جائزہ لیتی چلتی تھیں اور قیاس کے ساتھ گلہ کی موجودگی کی سمت کا تعین کر رہی تھیں اور تھوڑی دیر چلنے کے بعد دور گھنے درختوں کی کالی کالی پھنگیوں پر مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی زرپاشی ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے ہری ہری گھاس کے لق و دق میدان پہ سونا بکھر گیا شبنم کا ایک ایک موتی دمک اٹھا، بڑھتے بڑھتے کھوج ہم کو گھنے جنگل کی سمت لے گئے اور جب ہم کنارے پر پہنچے تو یک گونہ تعجب ہوا پورا گلہ علی الصبح گھنے جنگل میں گھسا تھا، میں نے شکاری خاں کی جانب دیکھا جو جنگل کے ہر چرندے کی جبلت کا محرم تھا اور یہ وہ بھی جانتا تھا اور میں بھی کہ چرندے کی جس قسم کا ہم اس وقت پیچھا کر رہے ہیں یہ دنیا کے ہر چوپائے سے زیادہ ذکی الحس اور آدمی سے بھاگنے والی جبلت کا حامل ہے۔ اس کا شامہ بلا کا تیز ہے اگر ہوا کا رخ اس کی جانب ہو تو میلوں سے آدمی کی بو لے کر نوک دم بھاگتا ہے اس کی سماعت کا یہ عالم ہے کہ شیر کے کان اس کے کانوں کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہیں، میل بھر کے فاصلہ پہ اگر آدمی اک ذرا کھانس دے تو یہ سکنڈ فرار ہو جاتا ہے اور ایک دو نہیں بیس میل بھاگ کر سانس لیتا ہے اور اتنی دور بھاگ کر بھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں خطرہ کے احساس سے مستغنی ہو پاتا ہے جنگل میں UN-CHALLANGED زندگی بسر کرتا ہے، اور نہ کوئی اس کا مد مقابل ہے نہیں تجربہ کار شیر ان سے کترا کر نکل جاتا ہے کبھی کوئی نوجوان شیر حملہ کر بیٹھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ گلہ میں سے ایک جانور تو ضرور کام آ جاتا ہے مگر اس شیر کی کھال کی دھجیاں

ان کے سینگوں میں ہی نیلی دکھائی دیتی ہیں اور گوشت کی بوٹیوں کا تو پتہ ہی نہیں چلتا، جیسے چکی کے پاٹوں میں پیس دیا، دنیا میں اس کا کوئی حریف ہے تو آدمی، اور آدمی کا سایہ تو بہت دور کی چیز ہے بو سے یہ جھلاد ہو جاتا ہے، مشہور بات ہے کہ ایک مرتبہ کا ذکر بھاگا ہوا گلہ اس دن پھر شکاری کو نظر نہیں آسکتا۔

میرے اور شکاری خاں کے درمیان اشاروں ہی اشاروں میں بات ہوئی اور ہم نے قیاس کر لیا کہ گلہ جنگل کا یہ کونہ پار کر کے ادھر نکل گیا لہذا جائے اس کے کہ جنگل کے اندر گھس کر کھوج میں کنارے کنارے چل کر ادھر پہنچ جائیں اور پھر کھوج اٹھائیں اور جب ہم جنگل اور گھاس کے میدان کے ملے ہوئے خط پر ایک جانب سے چل کر جوں ہی گوشہ پر پہنچے اور دوسرے خط پر چلنے کا ارادہ کیا تو سامنے گھاس کے میدان پر پورا گلہ کھڑا نظر آیا جگہ جگہ چھوٹے بڑے درخت تھے اور کہیں کہیں بانس کی جھاڑیاں تھیں اور شاداب اونچی گھاس تھی۔ اور ہم فوراً دبک گئے۔ اور سب سے پہلے میں نے ہوا کی سمت کا تعین کیا تو اطمینان ہوا۔ یہاں ہوا بہت ہی موافق تھی اور بالکل ان کے اوپر ہو کر ہماری جانب کو چل رہی تھی۔ اب گھنے جنگل کے کنارے کی جھاڑیوں میں چھپ کر میں نے بڑا مکمل جائزہ لیا، ہر جانور کو پرکھا، گنا، ہر ایک کے رخ اور چلنے کے رجحان کا اندازہ لگایا۔ نر اور مادہ دیکھے، سب سے بڑے گلہ کے سردار کو پہچانا۔ اپنے اور ان کے درمیان فاصلہ کا اندازہ کیا، اور اگرچہ وہ چل چر رہے تھے۔ اور جیسا کہ چرتے وقت ہوتا ہے کسی کا کوئی مقام معین نہ تھا مگر، یہاں پر گھاس بالکل نئی اور شاداب تھی لہذا بڑے انہماک کے ساتھ چر رہے تھے۔ میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ ایک ایک کو پرکھا، گلہ میں پانچ سانڈ اور چالیس مادائیں اور بچے تھے، اب میں نے پانچوں سانڈوں پر نظر ڈالی، چار نوجوان تھے اور پانچواں بڑا شاندار، بھاری سینگوں اور پہاڑ سے تن و توش کا حامل تھا اور رنگ ڈھنگ نشان و شوکت ہر اعتبار سے اس گلہ کا سردار دکھائی پڑتا تھا۔ اور ان چاروں کا باپ دادا ہوگا۔ اور بس اسی پر میری نگاہ جمی۔ جبلت کے مطابق، پانچوں سانڈ دو دو تین منٹ بعد گھاس میں سے سر اٹھا کر وحشی نظروں سے ماحول کا جائزہ لیتے تھے اور پھر چرنے لگتے تھے۔ بچے اور مادائیں مستقل طور پر گھاس کے اندر منہ دیئے ہوئے تھیں البتہ ایک بڑی بوڑھی جو ڈیل ڈول اور عمر کے لحاظ سے سرداری معلوم ہوتی تھی تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سر اٹھا کر دیکھتی مگر ایسا اندازہ ہوتا کہ وحشت میں نہیں، گھاس کے قطعہ کا جائزہ لیتی ہے کہ اچھا کھانا کدھر کدھر ہے۔ اور میں نے گہرا جائزہ لیا تو اندازہ کیا کہ کسی کسی وقت دو دو تین تین منٹ کا وقفہ ایسا گزرتا ہے کہ ہر جانور کی آنکھیں ڈیڑھ گز اندر گھاس میں بند ہوتی ہیں۔ اب میں نے ایک مخصوص مقام کا تعین کیا جہاں سے سردار اچھے رینج میں تھا اور یہ ایک چھوٹے بانس کی جھاڑی تھی اور اس تک آڑ ہی آڑ پہنچنے کا ایک راستہ نظری جائزہ سے متعین کیا، مگر جنگل چھدرا تھا اور اس جگہ تک مکمل آڑ نہ تھی لہذا میں نے ایک جھاڑی، پھر دوسرا درخت، پھر تیسری جھاڑی پھر چوتھی بانسی، اور پھر اس بانس کی جھاڑی تک اپنے راستہ کا نقشہ ذہن میں قائم کیا ——— اور یہ راستہ مجھے کھلے ڈھکے تقریباً ڈھائی تین سو گز طے کرنا تھا۔ اور سب کا سب ان ساعتوں میں جس وقت پورے گلہ کی آنکھیں گھاس کے اندر ہوں۔ ہوا بہت سازگار و موافق چل رہی تھی یعنی گھاس میں ہلکی ہلکی آواز بھی پیدا کر رہی تھی اور ان کی جانب سے میری جانب آرہی تھی نہ بو پہنچنے کا امکان تھا نہ کھٹکا ہی۔ میں نے بسم اللہ کر کے اور بھرپور جائزہ لے کر پہلی منزل کی جانب قدم اٹھایا اور بے کھٹکے جھاڑی کی آڑ پکڑ لی، دو تین منٹ پھر جائزہ لیا اور ایسی ہی مبارک ساعت میں دوسری منزل پکڑ لی، اور پھر فرداً فرداً ہر جانور کو پرکھا، اور پھر تیسری منزل

بڑی لمبی چوڑی آڑ تھی، سال بھر پہلے ایک بلند و بالا سال کا درخت آندھی میں کٹ کر جا پڑا تھا تقریباً چہارم ایکڑ زمین پر موٹے موٹے گٹھے اور درمیانی موٹائی کی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں کچھ بالکل خشک کچھ باوجود ٹوٹ جانے کے بھی نیم خشک نیم سبز بعض بالکل زمین پر پڑی ہوئی تھیں بعض جھک گئی تھیں اور بے ترتیبی کے ساتھ مختلف رخ اختیار کر گئی تھیں کچھ ایسی تھیں کہ اوپر موٹے تنے سے جڑی رہ گئی تھیں اور چہرہ کہ اُفق کے رخ کو سیدھی سی ہو گئی تھیں پر زمین سے آٹھ فیٹ بلند تھیں میں نے اس کی آڑ میں کھڑے ہو کر اچھی طرح اور اطمینان کے ساتھ جائزہ لیا، اور یہاں سے منزلِ مقصود تک درمیان میں ایک ہاٹ اور تھا اور یہیں پھر وہاں سے سردار بمشکل پندرہ گز کے اردگرد بیچ میں ہوتا تھا خوب سستا کر میں بڑھا، مگر چند قدم ڈالنے کے بعد اسی درخت کے سوکھے اور کرخت پتوں کے ڈھیر سے دوچار ہوا۔ گھاس میں چھپنے کو اچھی جگہ دکھائی نہ دی مجبوراً ایک جانب کو ہٹنا ہی پڑا مگر جہاں پھرتی کے ساتھ ہٹنے کے لیے پاؤں پڑا وہاں پر بھی گھاس کے نیچے ایک چھوٹی ڈھیری انھیں پتوں کی پڑی تھی، جوتا اگرچہ ربڑ سول تھا پھر بھی سوکھے پتوں پر ہلکی سی کھٹ چپاجا ہو ہی گیا۔ میں نے لپک کر جھاڑی تو لی مگر پتوں کے چٹاخے پر تقریباً ہر ایک نے گردنیں اٹھا لی تھیں اور ہر کوئی بھاگنے ہی والا تھا خطرہ کا احساس پورا ہو چکا تھا بس کسی ایک کے قدم اُٹھانے کی دیر تھی اور مانو سب کے سب بلک مارتے اڑ جھیں ——— سردار بہت اچھے نہیں تو برے بیچ میں بھی نہ تھا، وہ منزلِ مقصود والی بات تو نہ تھی تاہم زد پہ اچھا تھا تقریباً پورا بدن گھاس کے اندر تھا شاندار گردن اور پر شکوہ سر گھاس کی پھنگیوں سے گز بھر اونچا اُٹھا ہوا تھا، پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ تھا۔ میں نے گردن پر شست لے کر دن سے فیر کر دیا ——— اور فیر کے بعد اپنی نگاہ اور شعور اتنا بھی درست نہ کرنے پایا تھا کہ یہ اندازہ کر لیتا کہ کیا نتیجہ ہوا کہ یک دم میرے بائیں جانب سے میرے اوپر مورت جھپٹی، ایک نوجوان سانڈ توپ کے گولے کی طرح مجھ اپنے اوپر جھپٹتا نظر آیا اور جب تک میں نے رائفل پلٹا کر کے اٹھایا وہ مجھ سے پندرہ گز کے اندر تھا، میں نے چابک دستی کے ساتھ اس کے جھکے ہوئے سر سے بالشت بھر پیچھے اس کی گردن کے اوپری رخ پر شست لے کر گولی ماری یہ بہترین پوائنٹ تھا، اور فیر کے دھماکے کے ساتھ گولی لگنے کا مخصوص چٹاخہ بھی میرے کان میں گیا۔ مگر اس کی رفتار کی تندی میں کوئی فرق نہ آیا البتہ جیسے ایک دھکے نے اس کا رخ میری سیدھ سے اک ذرا ہٹا دیا اور جب وہ بگولے کی طرح میرے محاذ میں پہنچا تو مجھ سے ترچھا ترچھا کچھ ہوا سا بچیس گز کے فاصلہ پر تھا اور میں اس شدید حادثہ کی اہمیت کا ابھی پورا اندازہ بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اڑاڑا دوں، ڈھادوں، ڈھادوں" اور سیدھا ہو کر جیسے ڈاک گاڑی کا انجن میرے اوپر چلا، میں نے اچھی طرح شست لے کر پھر گولی لگائی، یکدم بریک سا لگا جیسے انجن پٹڑی سے اترتے اترتے سنبھل گیا اور پھر اسی تندی کے ساتھ بڑھا مگر بریک کے جھٹکے میں حملہ کے رخ کا توازن صحیح نہ رہ سکا اور نہ یہ بارہ من وزن کے طاقت پھرتی اور تندی کے مجسمہ کے لیے ایسی صورت میں ممکن تھا اور اب کی مرتبہ جو توازن بگڑا تو بجائے میرے اوپر پہنچنے کے مجھ سے چالیس پچاس گز ایک جانب جا کر سنبھل سکا اور پھر بڑے زور سے ڈکرایا، ڈیک ڈیک، ڈیک، ڈیہیہ، ڈیہیہ، ڈھی، ڈھی، ڈھادوں! اور پہلا حملہ تو دراصل حملہ تھا ہی نہیں بلکہ اس کا سر گھاس میں تھا اور اتفاق سے رخ میری جانب، فیر کی آواز پر وحشت میں جدھر کو منہ تھا بھاگ پڑا اور میں نے حملہ سمجھ کر گولی مار دی اور گولی کھا کر تو پھر وہ انتقام میں تابڑ توڑ حملے کرنے لگا، اور

یہ حملہ پہلی جھپٹ اور دوسرے حملہ دونوں سے زیادہ تند تھا، جیسے شدید انتقام کی آگ میں کُل کا کُل تودۂ بارود کی طرح بھڑک کر غیظ و غضب کے طوفان کی صورت مجھ پر جھپٹ پڑا اور جتنی دیر میں وہ سنبھل کر جھپٹتا مجھ کو اک لمحۂ فکر میسر آیا، اپنے ہتھیار کی کمزوری اور اپنے غیر محفوظ ہونے کا پورا احساس ہو گیا اور میں نے یہ جگہ چھوڑ کر ایک موٹے درخت کے تنے کی آڑ پکڑ لی اور یہاں سے معقول زاویہ پر تیسری گولی لگائی جس کا چٹاخ دھماکے کے ساتھ نمایاں سنائی دیا، بجائے پہلے جیسے گولی کی ٹکر سے چند گز ٹھوکریں سی کھائیں اور اب کی مرتبہ گولی اور اس کی رفتار کے تصادم میں بڑا اچھا بریک لگا اور جب وہ سیدھا ہوا تو میرے رخ سے ہٹ کر کہیں سے کہیں جا پڑا تھا اور مجھ سے بائیں جانب سوا سوا سو گز کے فاصلہ پر سنبھل کر، وہاں انک، وہاں انک، ڈھی، ڈھی، ڈھیک ڈھیک" بڑے زور سے نئے حملہ کے لیے طیاری کر رہا تھا، اور اگلے کھروں سے زمین کھود کر اڑا اڑا، اور دھول، دھواں۔ اب کی مرتبہ اتنا شدید حملہ کیا کہ اگر میں اس درخت کی آڑ نہ پکڑ چکا ہوتا تو اوسان کھو دیتا، اور تیسری گولی کھانے کے بعد ایسا تند و تیز حملہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ رائفل میں آخری کارتوس باقی تھا اور مجھ کو اپنے ہتھیار کی کمزوری کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا مگر اوسان برقرار رکھتے میں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس درخت کے تنے کی آڑ پکڑی جس میں ادرگرد کی گھاس معاون ہوئی اور خرگوش کی طرح دبک گیا اور مجھ کو اس طرح غائب ہوتے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور کچھ فاصلہ پر کھڑا ہو کر یہ اندازہ لگانے لگا کہ میرا دشمن کہاں ہے اور تقریباً دو منٹ تک اس جھاڑی کی سمت بس میں میں پہلے تھا اور اس تنے کی جانب خونبار آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ ادھر مجھ کو یک گونہ اطمینان کے ساتھ سوچنے کا موقع ملا، میں نے اندازہ لگایا کہ رائفل اس کے لیے بہت ناکافی ثابت ہوا، اور تینوں گولیاں اس کے جسم پر ایسی رائگاں گئیں جیسے سنگِ خارا کی چٹان پر، اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اک ذرا حملہ کا رخ پھیر کر موت سے بچا دیا، یہ چوتھی اور یہی، پھر پھر یہ مجھ کو زندہ نہ چھوڑے گا اور یہیں پر پیس دے گا، اور بچنے کی شکل؟ ——— بچنے کی شکل صرف کسی درخت پر چڑھ کر پناہ لینا ہے۔ اور یہ درخت جس کے تنے کی آڑ میں اس وقت بیٹھا ہوں یہ تو بہت ہی بے ڈھب ہے۔ اور ایسے نازک وقت میں اس پر چڑھنے کا خیال بھی نہ لانا چاہیے۔ اور میں نے بغیر گردن گھمائے کنکھیوں سے ادرگرد کے اور درختوں کو دیکھا، وہ سب کے سب ایسے ہی بے ڈھب تھے اور کسی پر بھی چڑھنے کی کوشش کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔ بس وہ ٹوٹا ہوا درخت مناسب تھا، مگر وہاں تک پہنچنا، تیس چالیس گز کا فاصلہ اس وقت ہفت خواں طے کرنا تھا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے تو یہ مجھ کو تیس چالیس مرتبہ پیسے گا ——— اور ایک صورت ذہن میں آئی، میں نے اندازہ کیا کہ اس وقت یہ مجھ سے پندرہ بیس گز کے فاصلہ پر ہے اور ادھر مجھ کو ٹوٹے درخت تک پہنچنے کے لیے تیس چالیس گز طے کرنا ہیں اگر میں اس کو اس جگہ سے جہاں پر کہ یہ اس وقت کھڑا ہے سو سوا سو گز ادھر آگے کو ہنکا دوں تو ادھر تیس چالیس گز کا فاصلہ دوڑ کر خیریت کے ساتھ طے کر سکتا ہوں اور چوتھی گولی اس کو مارنے کے لیے نہیں ایک مخصوص سمت کو ہنکانے کے لیے تو کافی تھی" صورت میرے ذہن میں تھی اور ایک مرتبہ جب اس نے حرکت کی اور میری جانب کو اک ذرا پچھاڑی سی ہوئی میں نے بغیر کوئی خاص پوائنٹ شست میں لیے پسلیوں پر ترچھے ترچھے تنگ زاویے پر گولی لگائی، ظاہر بات ہے کہ گولی کی سمت کا صحیح تعین کر لینے کے باوجود بھی وہ اپنے بھاری جسم کو یکدم موڑ نہ سکتا تھا، پہلے تو تیس چالیس گز ادھر ہی کو ریلا دیتا ہوا نکلا چلا گیا جدھر کو منہ کئے ہوئے تھا۔ اور پھر کچھ چکر کی سی بھول کر دیوانہ وار ادھر ادھر رش کرتا رہا، اور جب تک جسم

اور دماغ کو مرتوجہ کر کے وہ میری جانب پلٹا میں ٹوٹے ہوئے درخت کی سمت تقریباً دس بارہ گز ہی طے کر سکا تھا کیونکہ راستہ صاف نہ تھا، سوکھی ہوئی جھکی ٹہنیوں پر پاؤں بھی پھسل رہا تھا اور جھاڑیاں بھی دامن پکڑتی تھیں، گھاس اور گھاس پر لپٹی ہوئی باریک باریک سی بیلیں بھی روکتی تھیں اور میں اس کی نظر سے بچنے کی بھی کوشش کرتا چل رہا تھا۔ وہ چل رہا تھا، سرک رہا تھا، پھسل رہا تھا، پھدک رہا تھا اور گردن اور کمر جھکائے کہیں کہیں پر وہ چار ڈگیں بھر لیتا تھا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندازہ کر رہا تھا کہ یہ وحشت اور چوٹ میں دیوانہ وار اچھل کود کر رہا ہے لیکن ہنوز میری سمت کا پوری طرح تعین نہیں کر پایا ہے اور بے تاب ہو ہو کر ایسی سمتوں کو جھپٹتا ہے جو میری سیدھ سے بچی ہوئی ہیں اور جیسے کچھ شکست خوردگی اور ضرب کے سبب غصہ میں رقص ہی رقص کر رہا ہے اور حملوں میں توازن نہیں ہے ——— اور بیس چالیس گز دوافتی مجھ کو ہفت خواں بن گئے۔ راستہ نے مجھے بہت ہی الجھایا اور شاید ایسے وقت میں سیدھے سے سیدھا راستہ بھی الجھاتا ——— اونٹ کی چوری نیوڑے نیوڑے! بھلا اپنا چھ فیٹ ایک انچ لمبا قد کہاں تک چھپاتا، جھلک نظر آ ہی گئی اب حملہ میں وہ اندھا دھند پن نہ رہا بلکہ ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہوا۔ حملہ اور حملہ ہی حملہ کر کے ریزہ ریزہ کر دینے والا وحشیانہ انداز جبلت سے زائل ہو گیا اور سمجھ کر رخ بدلا۔ اور درخت مجھ سے چند لمبی ڈگوں پر تھا۔ اب خوش نصیبی سے یہاں پر راستہ بھی ذرا صاف اور ہموار تھا۔ میں بڑا تیز دوڑا اور اس نے پاگل کتے کی طرح میرا پیچھا کیا۔ اور نہ معلوم کتنی تیز رفتار تھی درخت کے نیچے تک پہنچتے پہنچتے بالکل میری پشت پر آ گیا "ڈھوں، ڈھائیں، ڈھاں، ڈھی" ——— ایک خون آشام ڈیک میرے کانوں نے سنی اور مجھے اپنی پیٹھ میں ایک ٹیک سی محسوس ہوئی اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کے اندر اوپر سے نیچے تک برف کی سلاخ سی اترتی چلی گئی ——— جھکی ہوئی مری شاخ پکڑنے کے لیے لنگور کی طرح اچھلا، دونوں ہاتھ اوپر بڑھے، اور شاخ ہاتھوں میں بھر کر لٹکتی موٹی ٹانگوں کو جھولا دیا اور دوسری جانب سے پاؤں کی گرفت میں لینے کے لیے اچھالا تو اس کی گرم گرم سانس میری پنڈلیوں پر مس ہوئی اور جوتے کی تو سینگوں کی نوکوں کو چھوتی ہوئی اوپر آئی، اور جب اس عالم رستخیز میں مجھے اپنی خبر ہوئی تو دونوں ہاتھوں اور دونوں ٹانگوں کی گرفت میں لیے ہوئے چھپکلی کی طرح موٹی شاخ سے چمٹا ہوا تھا، اپنے حریف کے برچھوں اور گرز کی زد سے بمشکل چار پانچ فیٹ بلند اور انھیں چار پانچ فیٹ میں ملک الموت کی دسترس سے ہزاروں کوس باہر تھا۔ الامان و الحفیظ، وہ غصہ میں شوں شوں کر رہا تھا جیسے جوالا مکھی آگ چھوڑنے سے قبل، اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خوف کے مارے سارا ماحول لرزاں ہے۔

حالت بدلی، اور دو منٹ چپکے رہنے کے بعد مجھے اپنی پوزیشن بدلنی لازمی تھی، اور نشست صحیح کرنی تھی لہذا شاخ کے اوپر کے رخ پر پہنچنے کے لیے کھسک کر پلٹا کھایا، اس بندر کی سی حرکت میں رائفل کندھے سے اتر کر کلائی میں جھومی اور میں نے موقع کی نزاکت کے مطابق تھوڑا سنبھالنے کی کوشش کی مگر اتنی ہی کہ میں اس کے ساتھ خود نیچے نہ جا پڑوں اور جب میں شاخ کے اوپر رخ پہنچکر سنبھلا تو رائفل قلابازی کھا کر نیچے جا پڑا، اور رائفل کے گرنے سے وہ یک دم بھڑک کر پانچ گز ادھر جا پڑا اور نیچے سے اوپر تک کا جائزہ لیا الاماں! برف کی سلاخ نے جیسے ریڑھ میں سے میرے تمام جسم میں ٹھنڈی لہریں دوڑا دیں، کیسی قہر آلود خونبار آنکھیں اور غضب ناک تیور تھے ظالم کے! اور ہر مرتبہ جب ماحول کو پرتال کر مجھ کو دیکھتا تھا تو آنکھوں میں سے سرخ سرخ چنگاریاں چیخ اٹھتی تھیں اور غیض میں پھر پھر کر اگلے کھروں سے زمین کاٹتا تھا۔ آہستہ آہستہ کینہ و غیض میں بھری ہوئی آواز نکالتا تھا۔

شاخ اوپر سے خاصی موٹی تھی اور درخت گر جانے کی وجہ سے جھک کر تقریباً متوازی سی شکل اختیار کر گئی تھی، یہ شاخ تو

سوکھی ہوئی تھی لیکن درخت کی کچھ جڑیں ابھی زمین میں تھیں اور اسی کے سبب کچھ شاخیں شاداب و نیم شاداب تھیں، اپنی اس پناہ گاہ پر پہنچ کر میں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا تو مجھے تعجب ہوا کہ میں یہاں پہنچ کیسے گیا، اگرچہ اس کے دشمن حملوں کے وقت میری جان ہوتی نہ کہاں پہ بھی خائف تھی، یہ مجھے یہاں کیا ہو گیا ——— ابھی ابھی چند منٹ قبل تیندوے کاٹ کاٹ کر جسم کے ایک ایک پٹھے ایک ایک نس سے پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کام لے رہے کر جو اسپورٹس میں ایک ماہر پٹھے باز کی طرح قوت اور فن کو بھرپور کام میں لا رہا اس کا مقابلہ کر رہا تھا اور گولی پر گولی مار کر اس کا خونیں حملہ خالی دے رہا تھا اس وقت اس کے اعصاب اس قدر جواب دے چکے تھے کہ اس پتلی جیسی چوڑی بگلی شاخ پر بیٹھ نہ سکتا تھا۔ تمام جسم میں رعشہ تھا، جو آہستہ آہستہ ترقی پذیر ہو رہا تھا اور جتنا میں اس کی جانب غور کرکے اس پر قابو پانا چاہتا تھا اتنا ہی یہ زیادہ ہوتا تھا اور ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کپکپاہٹ کی کسی شدید لہر میں اُلٹ کر نیچے نہ جا پڑوں، بہرحال بہت سنبھالنے کی بھی کوشش کی لیکن اتنی دیر کے مجادلہ اور حادثہ در حادثہ کا ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ میں نے اندازہ کیا کہ محض ذہنی طور پر کوشش سے یہ حالت صحیح نہیں ہو سکتی دراصل ایسی تشنجی کیفیت میں کم از کم گھنٹہ بھر چارپائی پر پڑے رہنے کی ضرورت تھی اور جب میں اپنی تمام تر ذہنی و نفسیاتی کوششوں کے باوجود اپنی حالت پر قادر نہ ہو سکا تو میں نے اپنی ڈری ڈری نگاہیں جن کے اندر اب وحشت کے بجائے ملالت کی سی نشانیاں اُبھر آئی ہوں گی درخت کے اوپر زیادہ مناسب نشست کی تلاش میں ڈالیں مگر باوجود تھوڑا بہت درخت پر چڑھنے کے فن سے واقف ہونے کے اس وقت کسی مناسب جگہ پہنچنا میری رسائی سے باہر تھا، مسلسل تھرتھراہٹ اور جوتے میں کسے ہوئے پاؤں — اور باوجود کوشش کے میری انگلیاں تو جوتے کا فیتہ بھی نہ کھول سکیں، بھلا درخت پر چلنا کیا معنی۔ تاہم چند گز اوپر اسی شاخ کے مخرج پر ایک مناسب جگہ نظر آئی جہاں پہ شاید میں پہنچ سکوں، یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک دوسری اتنی ہی موٹی شاخ اس کے ساتھ نکل کر دوسری جانب کو گئی تھی، اور یہاں پر ایک دو شاخے کی شکل میں بہتر سی نشست نظر آ رہی تھی۔ فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا، راستہ بھی سیدھا اور کھردرا تھا، پھر مرتا کیا نہ کرتا ہمت کر ہی دی، اور میں نے ادھر کو بہت سنبھلتے ہوئے رینگنا شروع کیا لیکن جوں ہی اک ذرا حرکت کی تشنج مائل بہ سکون ہوا اور میں اس دو شاخے میں پہنچ گیا۔

جگہ دُور سے دیکھنے میں جیسی مناسب نظر آ رہی تھی بیٹھ کر پتہ چلا کہ واقعی بہت معقول ہے۔ دونوں کولہوں کو بھی ٹکنے کو ٹھکانا تھا، بازو بھی ٹک گئے اور تھوڑی ٹانگیں بھی پھیل گئیں، دو شاخے میں کمر کو بھی تکیہ مل گیا۔ کچھ رینگنے کی حرکت میں تشنج پر قابو ہوا کچھ اطمینان کی نشست ملی اب اپنے آپ کو پھر سے پرتالا، رائفل تو پہلے ہی داغِ مفارقت دے گیا تھا اور اب پتہ چلا کہ سر سے ہیٹ اس سے بھی پہلے کسی جھاڑی نے اُتار لیا تھا۔ ماحول کو دیکھا تو اُوپر کھلا آسمان تھا، نیچے زمین پر رائفل لیٹا ہوا تھا اور دُور ایک جھاڑی پر احتیاط کے ساتھ ہیٹ ٹنگا ہوا تھا۔ پینٹیں کانٹوں سے پر تھیں، کلائیوں اور پنڈلیوں پر جگہ جگہ رگڑیں تھیں پتلون کا ایک پائنچہ پھٹا ہوا تھا . . . . . دل کی دھڑکنوں کا تو پوچھنا ہی کیا جب رعشہ ٹھہرا تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے جسم کی جان نکل گئی اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ اعصاب مفلوج سے ہو گئے، اور وہ نیچے غصے کے مارے زمین اُلٹے پھینکتا تھا ڈکرا ڈکرا کر چیلنج کر رہا تھا اگلے کھروں سے گھاس اور مٹی اکھیڑ اکھیڑ کر پھینکتا تھا، غیظ میں بھر بھر کر دُم لہرا لہرا کر ناچتا تھا۔ سر کو جھٹکتا تھا اور پھر نئی نئی بھیانک آوازوں میں چیختا تھا، کچھ دیر تو میں نے اس کا اثر لیا پھر اپنی حالت کو ہر پہلو سے پرتالا، تھوڑی دیر بعد اور اندازہ ہوا کہ اعصاب بہتر ہیں اور مائل بہ سکون ہیں اور آہستہ آہستہ ایک قسم کے اطمینان کی لہر سی تمام جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور جان

بچ جانے کا عظیم احساس، اور پھر پہلی چیز جو یاد آئی وہ اپنا نیچے پڑا ہوا رائفل تھا ——— اور پھر وحشت کا رقص ناچتے ہوئے دشمن پر نگاہ گئی ہوں! خوب بنا بنا کر چکما دے رہے ہو بچو! تقدیر کے اچھے ہو، رائفل لڑھک گیا، نہیں تو معلوم ہوتا کہ پڑا تھا کسی گل چلے سے پالا، بس یہ پوری جب بھر کارتوسوں کی گولی پلا دیتا آج، اچھے تو یہ دونوں آنکھیں ایک ایک کر کے پھوڑتا جن سے تم بکھیرتے ہو پھرتے چاروں گھٹنوں کی مینگٹ پاش پاش کر کے بہا دیتا، جن سے گھوم گھوم کر ہوا سے لڑ رہے ہو، اور یہ چبوترہ سی بلیٹھ دو مزین کی باڑھوں میں ایسی کتر جاتی جیسے آری کے دانتوں میں کوروں کا لٹھا، گر یہ کمر یہ کا جوڑ جوڑ بند بند بکھر چکا ہوتا اب تک اور دیکھتا کہ اس تمہارے پتھر کی چٹان سے کھوپڑے کی ہڈیاں کتنی مضبوط ہیں، اسی گھاس پر بھیجے کی چھٹیں چھٹکیں پھیلی نظر آتیں ——— ساری بہادری آلٹی ہو چکی ہوتی اب تک تو۔ اور پھر یک دم خیال آیا مگر تم سب کچھ تو کرتے لیکن کرتا کون، یہ تھرتھراتی انگلیاں یہ کپکپاتی چھاتی، یہ لرزتے ہاتھ پاؤں ——— کیوں نہیں چار گولیاں نیچے انھیں نے تو ماریں ——— اور وہ تو جب رائفل ہاتھ میں ہوتا ہے تو فولاد کی لپک اور گولی کی تیزی آپ ہی آپ آ جاتی ہے . . . .

اور یہاں تک کہ غیض اور جذبۂ انتقام میں جو اضطراری حرکتیں وہ کر رہا ہے ان میں مجھے ایسا لطف آنے لگا جیسے سرکس کے اندر کسی جانور کو تماشہ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، مسلسل شوں شوں خرخرے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے طرح طرح کی ڈراؤنی اور کربناک آوازیں، جسم کی رگ رگ پٹھا پٹھا جیسے پورے تناؤ تک کھنچا ہوا اور رونگٹا رونگٹا حرکت ہی حرکت، تقریباً اسی طرح گھنٹہ بھر گزرنے کے بعد تندی میں کچھ کمی معلوم ہوئی، عجیب طرح سے اکڑا، اٹھا اور شرابی کے سے قدم ڈالتا ترچھا ترچھا بڑھا اور چند قدم چل کر ایک گھنی جھاڑی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، دو تین منٹ کھڑا رہا، چند نہایت بھیانک اور بلند ڈکاریں سی لیں، زمین سونگھی اور دو تین بار دُم اٹھا کر جہاں کا تہاں چکرایا اور وہیں پر بیٹھ گیا ——— اور مجھے وہ بات یاد آئی جو اس کے متعلق تجربہ کار شکاریوں کی زبانی سنی تھی کہ جس وقت یہ انتقام لینے پر آتا ہے اور اس کا دشمن درخت پر پناہ لے لیتا ہے تو اس وقت تک درخت کے نیچے بیٹھا رہتا ہے کہ دشمن سوکھ کر درخت سے نیچے گر جائے . . . . اور غصہ میں نہ اس کو بھوک لگتی ہے نہ پیاس، چاہے خود بھی سوکھ سوکھ کر مر جائے غصہ نہیں اترتا ——— الاماں! اور اپنا بھی حشر مجھ کو نظر آیا . . . .

اور میں نے محسوس کیا کہ ماحول میں آہستہ آہستہ آگ سی بھڑک رہی ہے اور مجھ کو شدید پیاس لگی ہوئی ہے ———
میں نے کلائی پر نگاہ ڈالی تو گھڑی نہ تھی غالباً صبح باندھ کر ہی نہ چلا ——— مگر یہ جو کرنیں چبھیں تو ہیبت غائب پایا اور تھوڑی دور ایک جھاڑی پر تنگا نظر بھی آ گیا - ماحول کی حرکت ترقی پذیر تھی، جنگل کے اندر سورج کی چال کا پتہ نہ چلا صرف گرمی سے ہی اندازہ ہوا کہ دس گیارہ بجے ہوں گے، ننگے سر، پیاس، اور مجھے تو آگے کی سوجھ رہی تھی، اور جوں جوں وقت گذرا اور بھی دور کی سجھائی دی یہاں تک کہ اس شاخ سے سیدھا ملکِ عدم کا راستہ دکھائی دے گیا، اور حساب لگایا، کہیں بارہ بجے تک میرا ساتھی افتاں و خیزاں بھاگ کر کیمپ پہنچے گا اور وہاں سے مجھ کو چھڑانے کے لیے کمک لے کر بہت جلدی یہاں تک پہنچا تو چار بجے تک ورنہ پانچ کے لگ بھگ! اور اب ساڑھے دس گیارہ کا وقت ہوگا، بس آج "دھیانت" ہو جائیگا یہیں پر، جوں جوں وقت گذرا سورج کی کرنیں اقلیدس کے ہر زاویہ سے میری ننگی کھوپڑی اور جسم پر پڑ پڑ کر رونگٹے رونگٹے میں نفوذ کرتی گئیں، یہاں تک کہ میرے تمام وجود میں میری روح میں حدت حلول کر گئی، پیاس کے مارے پیٹ میں انگارے سے دہکنے لگے ——— میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچا

ابھی سے یہ عالم ہے! اور پانی نہ معلوم کب ملے گا۔ اور کیا معلوم ملے گا بھی، یا یونہی پیاسا لُو کے مارے آم کی طرح کپو کے ٹپک پڑوں گا —— اور سورج کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا، وقت گرم ہو کر تپا اور تپ کر بھڑک اُٹھا اور زمین سے لے کر آسمان تک ساری دُنیا لپٹتے شعلوں سے بھر گئی۔ اس درخت کے پاس پناہ تھی، مگر جلاتی ہوئی دھوپ سے نہیں اس بپھرے ہوئے عفریت سے، جو اب بھی اطمینان سے جہاں کا تہاں کینہ و بغض کی چٹان کی طرح جما ہوا منتظر تھا کہ کب میرا دشمن سوکھ کر ٹپکے اور کب میں اس کی سوختہ لاش کی دھجیاں بکھیر دوں اس کے مردہ جسم کا قیمہ بنا دوں۔ سورج کی کرنیں اور بھی زیادہ نکیلی ہو گئیں اور برچھیوں کی طرح براہِ راست میری کھوپڑی میں اُترنے لگیں، میں نے اوپر نگاہ کی تو آسمان جیسے لال توے کی طرح دہکتا نظر آیا نیچے دیکھا تو زمین پہ بھٹی سی بھڑک رہی تھی دائیں بائیں نظر کی تو نیچے سے اوپر کو دھواں سا اُٹھ اُٹھ کر چلتا دکھائی دیا اور مجھے سچ مچ ایسا محسوس ہوا کہ میں تندور میں بیٹھا ہوں، اور اس سب کے ساتھ مجھے اپنا انجام نظر آیا۔ ٹھہر ٹھہر کر لُو کے جھکڑ چل رہے تھے، چرندے پرندے سب کھا پی کر آسودہ ہو چکے تھے اور پیاس کے مارے میری زبان باہر آگئی تھی، میں نے ذرا پہلو بدلا اس عفریت کی جانب دیکھا۔۔۔ "عنقریب تشنگی اور موسم کی حالت مجھ کو یہاں سے اوندھے منہ نیچے پٹخ دے گی اور یہ میری —— سوختہ لاش پر اپنی حسرتیں پوری کرے گا اور میری انتڑیاں اس کے برچھا سے سینگوں پر لپٹ جائیں گی باقی جسم اس کے گرز جیسے سر سے پس جائیگا۔ اور مٹی اور گھاس پر کچھ نشانیاں باقی رہ جائیں گی جو میرے ساتھی آکر قیمہ کی پوٹ کی شکل میں لپیٹ کر کہیں دفن کر دیں گے"

—— اور یہاں پہنچ کر جیسے اندر سے ردِ عمل درمقابلہ سا ہوا۔ میں نے پھر پہلو بدلا، اور جیسے انجام سے بچنے کے لیے سنبھلا اپنے کھوئے کھوئے سے حواس مجتمع کیے اور اپنا کچھ جائزہ لیا —— آنکھوں کے آگے کسی وقت سیاہ چادر اور کبھی نیلی سُرخ تتلیاں اُڑ رہی ہیں —— کھوپڑی اوپر سے چٹک رہی ہے، اور اندر جیسے چاول پک رہے ہیں —— نتھنوں سے لپٹیں نکل رہی ہیں —— آنکھوں کو حرکت دیتا ہوں تو چنگاریاں سی چھٹتی ہیں —— پیٹ میں بار بار پگھلا سیسہ بھڑ بھڑاتا ہے —— ہاتھ پاؤں میرے نہیں جیسے کسی اور کے ہیں جو میرے جسم میں لگے ہیں —— کسی کسی وقت دم گھٹتا ہے —— کوئی چیز حلق میں ٹک ٹک کلاک کی طرح بجتی ہے ——۔ بار بار چکر سا آتا ہے —— ارے کہیں میں نیچے نہ گر پڑوں! —— اور میں پھر اپنی نشست پہ سنبھلا، بار بار پلک مار کر بصارت کو برسرِ کار لانے کی کوشش کی۔ زبان ہونٹوں تک تو آگئی مگر نمی نہ تھی جو ذرا تر ہو جائے —— اور میں نے محسوس کیا کہ بڑا میٹھا میٹھا خمار ہے اور ہلکا ہلکا چکر سا آرہا ہے ... پھر گرمی، پیٹ...

... شاید یہ جہنم کا کوئی طبقہ ہے —— میں اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہوں —— اور میں نے پھر سنبھل کر پہلو بدلا —— مگر میں مرا تو نہیں ہوں —— اور نہ مجھے بخار ہی چڑھا ہے —— میں اپنے دماغ پر سرسامی کیفیت طاری نہ ہونے دوں گا —— یہ جنگل ہے —— آج صبح میں یہاں شکار کو آیا تھا —— ہوں، ہوں، میں بیہوش ہرگز نہ ہوؤنگا —— میں اس درخت سے نیچے نہیں گروں گا —— میں یہیں سوکھ کر مرجاؤنگا —— نہیں، نہیں، میں نہیں مرونگا —— میں اس کو مارونگا —— میں اس کا قیمہ بنا کر کھاؤنگا —— اس کی ہڈیوں کا گودا نکال کر چوس جاؤں گا —— اس کا کھوپڑا توڑ کر بھیجا بھون کر کھا جاؤں گا .....

...... شاید دن لوٹ گیا اور سہ پہر آگئی۔ جیسے میرے کانوں میں کچھ آواز سی گونجی۔ یہ اندر کی ہذیانی آواز

ہے یا نہیں باہر سے آ رہی ہے میں نے تمیز کرنا چاہا مگر قطعی طور پہ سمجھ نہ سکا، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان دبائے تو آواز بند ہو گئی، اور جب ہٹائے تو پھر زیادہ واضح سنائی دینے لگیں اور صاف معلوم ہونے لگا کہ یہ ادھر ہی سے آ رہی ہیں جدھر سے کمک آنے کی امید ہو سکتی تھی اور چند منٹ کے اندر نہایت نمایاں شکاری سیٹیاں بجتی سنائی دیں جو مخصوص آوازیں اپنی آمد کی اطلاع کی ہوتی ہیں، اور پھر آوازیں بڑھتی رہیں، میری ساری سرسامی سی کیفیت کافور ہو گئی، نیم وا آنکھیں بھرپور کھل گئیں، پیاس بھی غائب ہو گئی اور گرمی کا احساس بھی جاتا رہا اور یہ اندیشہ ہوا کہ اگر انھیں اس عفریت کی جائے قیام کا صحیح پتہ نہ چلا اور یہ اسی طرح پھیلے ہوئے بڑھتے چلے آئے تو کہیں یہ ان پہ حملہ نہ کر دے لہٰذا انھیں اس کی جگہ بتا دینا بہت ضروری ہے ——— ان کی آوازیں قریب سے سنائی دے رہی تھیں سیٹیوں کے ساتھ بات چیت بھی کان میں آ رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ چلا کر بتا دوں کہ یہ یہاں بیٹھا ہے مگر بولنا کیا ہے زبان کی جگہ منہ میں لکڑی کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا، اور حلق میں میخ سی ٹھکی ہوئی تھی ——— اور پھر خیال آیا یہ سیٹیاں جو بج رہی ہیں یہ خاص صاحبزادگان کی ہیں ایسی آواز والی سیٹیاں کیمپ پر نہیں تھیں یہ لوگ اپنے ساتھ لائے ہوں گے یقیناً وہ خود آ رہے ہیں۔ غضب ہی ہو جائے گا اگر یہ لوگ بے خبری میں بڑھتے چلے آئے اور اس نے حملہ کر دیا۔ نہ معلوم کون کون سی قیمتی جانیں خطرہ میں ہیں ——— اوہ! اب تو بہت ہی قریب ہیں ——— اور ادھر ہی کو بڑھ رہے ہیں ——— میں نے پھر خطرہ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر زبان کی نمی کیا خشک ہوئی تھی جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ میں نے لاچار ہو کر ادھر ادھر دیکھا، اور نیم خشک درخت کی شاخ پر ایک گچھا ہری ہری کونپلوں کا نظر آیا مٹھی میں بھر کر کھسوٹ لیا اور منہ میں بھر لیا، مگر جبڑوں نے چبانے کا یارا نہ دیا بڑی مشکل سے اگلے دانتوں سے کتر کتر کر چبایا کچھ نمی ذرا سے پھین پیدا ہوئے دوسری مٹھی کھسوٹ کر اور منہ میں بھر لی۔ اب کی مرتبہ جبڑے بھی چلے اور منہ پھینوں سے بھر گیا اور کسیلے کھٹ مٹھے عرق سے ہونٹوں سے لے کر حلق تک تمام تر ہو گیا اور زبان چل نکلی، آوازیں دے کر انھیں متنبہ کیا کہ یہ اس سمت بیٹھا ہوا ہے اور جب اپنے بائیں ہاتھ پر نگاہ ڈالی تو یہ جماعت جنگل کے عین اسی گوشہ سے نمودار ہوئی جہاں سے میں نے پہلی مرتبہ گلہ دیکھا تھا اب میں نے زبان کے ساتھ ہاتھ کے اشارہ سے بھی بتایا ——— ہاتھوں میں رائفل اور گلوں میں دوربینیں لٹکائے وہ میری ہدایت کے مطابق خوب چکر کاٹ کر ادھر پہنچ گئے جدھر سوار پر میرا پہلا فیر ہوا تھا، اور باوجود میرے پیہم اشارہ کر کے بتانے کے دوربینوں سے بھی یہ نہ دیکھ سکے کہ سانڈ کہاں پر بیٹھا ہے البتہ یہ سمجھ گئے کہ یہ میرے بائیں ہاتھ پر ہیں اور وہ کہیں داہنے ہاتھ پر۔ جماعت میں چالیس دیہاتی دل چلے بھالا برچھے لیے ہوئے تھے بقیہ چھ صاحبزادگان اور دو ان کے مہمان اور شکاری خاں تو شکاری بھاری بور کے دونالے رائفلوں سے مسلح تھے۔ اور یک دم بہت سے آدمی چلا پڑے "ارے یہ تو یہ پڑا ہے مرا ہوا!"

"کیا بکتے ہو ——— وہاں کہاں ادھر ہے بتا رہا ہوں" میں نے گلا پھاڑ کر اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

وہ سب کے سب جمع ہو گئے۔ اور چند منٹ باتیں کرنے کے بعد بقیہ آدمیوں کو وہیں چھوڑ کر یہ نو ادھر بڑھے، اٹھارہ نالیں بھرے ہوئے، رائفلیں تانے اور بڑھتے بڑھتے میرے درخت تک آ گئے وہ پھر بھی نہ اٹھا یہ لوگ دو قدم اور آگے کو سرکے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو شکاری خاں نے ڈپٹ کر چیلنج کیا "ڈیہہ، ڈیہہ" سب رائفل کندھوں پہ تنے پہلی ہی حرکت پر

اٹھارہ گولیوں کی باڑھ پڑتی ـــــــ مگر وہ تو اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں، یہ لوگ اور بھی زیادہ مستعدی اور ہوشیاری سے بڑھے اور جب پانچ گز کا فاصلہ رہ گیا تو شکاری خاں نے بڑے زور سے للکار کر پتھر مارا اور سب نے اپنے رائفل تانا لیے مگر وہ پھر بھی جوں کا توں ڈھیر سا وہیں پڑا رہا تو شکاری خاں نے ذرا تمسخرانہ انداز میں للکارتے ہوئے اچھل کر اس کی دم پکڑلی اور سب کے منہ سے یک وقت لاحول ولا قوة نکلا سب دوڑ کر قریب پہنچے تو صاحبزادگان ـــــ یہ تو اکڑا پڑا ہے جبھی کام آ "شکاری خاں نے خوشی میں بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور صاحبزادگان قریب جا کر ناک پر رومال رکھے "ہیں ہیں اونہہ اونہہ تعفن پیدا ہو گیا، سڑ گیا، نہ معلوم کب کام آ ہے" کہتے ہوئے دور ہٹ آئے یہ

شکاری خاں نے کہا "آٹھ تو گھنٹے ہو گئے مرے ہوئے سڑنے کو رہ جائے گا اب تک"

ادھر سے برچھے تھامے دیہاتی آ گئے اور شکاری خاں سے پوچھا "خاں صاحب، وہ ادھر وہ پڑا تو سڑ کر پھول بھی گیا یہ ادھر ذرا چھاؤں میں تھا اس میں کچھ دم ہے" اور گوشت کے لالچ میں سب کی مرے ہوئے سانڈ پر حریصانہ نگاہیں پڑیں۔

" وہ پھول گیا، یہ پھول رہا ہے، دم کیسا، بالکل سڑ گیا، اب گدھ پڑتے ہیں، کدھر ہی سے" اور پھر بڑبڑایا "آج یہ بھینٹ مجلس من گوشت سڑ گیا، اور سرکاروں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا ہے، ہوں ادھر میں پہنچا، آدھر سواری آئی، یہ بھی نہیں کہ کسی نے اچھی طرح بیٹھ کر پانی بھی پیا ہو، بس سنتے ہی دوڑ پڑے سب کے سب ادھر ـــــ ہوں اب رات کے کھانے پر بھی کباب نہیں ہوں گے"

" ارے بے ایمان، باتیں مار رہا ہے، ارے اب مجھے آثار ہیں مر رہا ہوں، سرکنے کی بھی سکت نہیں۔ نیچے ٹیک لے دو لگا" میں نے کہا اور اندازہ کیا کہ میری زبان بڑے تڑانے سے چل رہی ہے۔ دو آدمیوں نے اوپر سے سہارا دیا دو نے آدمیوں نے نیچے سے سنبھالا اور ایک جانب لے جا کر گھاس پر لٹا دیا، سب لوگ جمع ہو گئے، مہمانوں میں ایک ڈاکٹر بھی تھے انھوں نے بڑی پابندی لگائی، مرے کو ماریں شاہ مدار، میری نبض دیکھی قلب کی حرکت ٹٹولی آنکھیں پھیر کر دیکھیں اور پیٹ ٹٹولا اور مجھ کو پانی دینے میں بڑی احتیاط کی، پہلے تھرموس میں سے برف نکال کر پانی کے قطرے حلق میں جو آئے، پھر ایک چھوٹا گلاس سنترہ کے عرق کا دیا، پھر دو بسکٹ بڑھا دیئے جو میں نے بڑی مشکل سے کھائے، پھر ذرا سا سنترہ کا عرق دے کر پندرہ منٹ صبر کرنے کا حکم دیا اور میرا یہ عالم تھا کہ چار چھ مشک پانی یک دم پی جاؤں۔ انھوں نے اس دوران میں برف کے پانی میں تر کر کے چہرہ پر رومال پھیرا، یا اللہ! یہ پندرہ منٹ پندرہ برس ہو گئے پھر دو بسکٹ اور ایک چھوٹا گلاس پانی کا بڑھایا۔ پھر دس منٹ صبر اور پھر دو بسکٹ اور ایک گلاس شربت ـــــ تقریباً دو گھنٹے تک مجھ پر پابندیاں لگاتے رہے، ایک دوا بھی پلائی، اور پانی جیسے میری رگ پے میں اترتا چلا گیا اور رونگٹے رونگٹے پر جھلک اٹھا، آٹھ سات گلاس پانی اور تقریباً ایک پیکٹ بسکٹ پیٹ میں پہنچنے کے بعد میں نے شکاری خاں سے پہلا سوال کیا "بڑے سانڈ کے گولی کہاں پر پڑی تھی؟"

بس یک، کان کے پیچھے، اور کلیان ہو گیا ـــــ گردن اور سر کے جوڑ کا گر یہ توڑ کر معلوم ہوتا ہے سیدھی بھیجے میں جا کر دھر رہی بس جہاں کا تہاں دھرا رہ گیا، پسر بھی نہ ہلا، جیسے بتاشہ پر پانی کی بوند آ پڑی ـــــ بس دو چار مرتبہ دم تو ہلی معلوم ہوتی ہے

مٹی پر نشان تھے، اور کچھ نہیں سانس بھی نہ لی۔"

"اور شکاری خاں، یہ شیطان چار گولیاں کہاں ہضم کر گیا؟" — میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سانڈ کی پڑی ہوئی لاش کو دور سے دیکھنے لگا۔

شکاری خاں منہ پر رومال رکھے اس کے قریب پہنچ گیا اور ایک چھڑی سے اشارہ کر کے بتانا شروع کیا "گردن کے اوپر مونڈھے پر ایک، سیدھے پھوسے پر دو، پیٹ پر تین —— پسلیوں کے جوف میں چار —— اور بس معلوم ہوتا ہے یہی کام کر گئی، یہ پہلی تو پیچھے سے ہے مگر دو پسلیوں کے بیچ میں کہاں تو پڑتی ہے کہ نکل چلی گئی اور سینہ میں پہنچ کر کہیں پھیپھڑے وغیرہ چیر دیئے، اور مار گئی۔"

"ہوں، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جس وقت جا کر بیٹھا ہے وہاں پر اسی وقت مر گیا" میں نے کہا۔

"ابھی کیا ہی مرنے کو تھا، یہ دیکھو نا، منہ سے چار مشک خون پھینکا ہے، یہ جھاڑی کی جڑ میں جمع ہو گیا ہے، سوکھ گیا بس صبح ہی کا ہے، اور خون پھینکتے ہی مر گیا۔"

"ہوں، وہ وہاں پر اور یہ یہاں پڑا رہ گیا اور کہا یوں کہ ایک بار پھر نہ نصیب ہوا" میں نے اپنا صبح کے پروگرام کی اصل غایت یاد دلا کے کہا۔

اور صاحبزادہ صاحب ہنس پڑے اور فرمایا "خیر جو ہوا سو ہوا اپریل فول آج خوب بنا گیا آپ کا یہ مرتے مرتے" ایک قہقہہ پڑا۔ اور جانے کے سب طیاری ہو گئی کیمپ یہاں سے چھ میل سیدھے راستہ تھا، لوگوں نے چاہا کہ مجھے اٹھا لیں مگر میرے پاؤں میں نہ معلوم کہاں کی قوت آ گئی تھی سب کے ساتھ آہستہ آہستہ چل پڑا —— رائفل جو ہاتھ میں آ گئی تھی!

مورپنکھی

ڈاکٹر محمد حسن

[یہ ڈراما بارہ مناظر پر مشتمل ہے اس میں پانچ سے سات سیٹ تک کی ضرورت ہوگی۔ اسمٰعیل کا خیمہ۔ خیمے کے باہر کا میدان۔ مورپنکھی اور سرفراز کے خیمے۔ نواب کا خیمہ۔ تالاب۔ بعض مناظر مختصر ہیں REVOLVING STAGE پر یہ ڈرامہ اچھی طرح اسٹیج ہو سکتا ہے]

کردار

۱۔ مورپنکھی ۔ ایک الہڑ خوب صورت لڑکی عمر ۱۷ سال
۲۔ سرفراز ۔ ٹھگوں کا نوعمر سردار عمر ۲۶ سال
۳۔ اسمٰعیل ۔ ٹھگوں کا بوڑھا سابق سردار عمر ۶۰ سال
۴۔ غفور ۔ ٹھگ، عمر ۳۵ سال
۵۔ بدری ــــ ایک اور ٹھگ عمر ۳۰ سے ۳۵ تک
۶۔ نواب سبزی بہادر ــــ ۴۰ ــ ۴۵ سال کے ایک عیاش طبع نواب
۷۔ خیرو ۔ نواب سبزی بہادر کا نوکر
۸۔ ــــ اور دو تین سوداگر اور دو تین ٹھگ

پہلا منظر

(ٹھگوں کے سردار کے خیمے ہیں، وقت رات، ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ)

اسمٰعیل ۔ سب لوگ آ گئے۔

بدری ۔ ہاں سردار۔ سب۔

اسمٰعیل - بدری مشعلیں بجھا دو چاندنی رات میں ان کی ضرورت نہیں۔ اگر اور وہاں کچھ اور آگ میں ڈال دو۔

بدری - جو حکم سردار۔

اسمٰعیل - میں نے اس خیمے کو دلہن کی طرح سجایا اور طرح طرح کے پھولوں سے ڈھکا دیا ہے۔ یہ رات ہمارے قافلے کی زندگی میں شاید بڑی ہی مبارک ثابت ہو۔ میں نے اپنے سب ساتھیوں کو اس لیے بلایا ہے کہ میں ان سے فیصلہ چاہتا ہوں۔
سرفراز خاں

سرفراز - سردار

اسمٰعیل - آؤ میرے پاس آ کر کھڑے ہو جاؤ۔

سرفراز - ساتھیو! میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ٹھگی کے پیشے میں میں نے ۴۵ سال گزارے ہیں دیوی بھوانی کے ایک معمولی سیوک کی حیثیت سے میں نے اپنا کام پورا کیا ہے ——— ٹھگ بڑا پاک لفظ ہے ہم دیوی بھوانی کے سچے بھگت ہیں۔ بھوانی ہمارے ذریعے دنیا سے بدی کو ختم کرتی ہے۔ جب دیوی شگون دیتی ہے تو ہم اس کے حکم سے انسانوں کو موت کا پیغام سناتے ہیں۔ دیوی ہمارا ساتھ نہ دیتی تو ہمارے معمولی رومال میں تندرست سے تندرست انسان کی گردن مروڑنے کی طاقت کہاں سے آتی۔

سب - جے بھوانی کی!!

اسمٰعیل - ہمارے قافلے میں ہندو مسلمان سب برابر ہیں۔ سب دیوی بھوانی کے حکم سے قتل کرتے ہیں۔ اس قتل سے جو مال ملتا ہے اس کا بڑا حصہ دیوی بھوانی کو چڑھاتے ہیں۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میں تمھاری سرداری کے لیے اپنے لے پالک بیٹے سرفراز کو پیش کرتا ہوں۔ بھائیو کیا تم سرفراز کو اپنا سردار بنانے پر راضی ہو؟

غفور - جے بھوانی کی!

اسمٰعیل - میں سمجھ گیا غفور۔ ہاں اگر بھوانی اپنے اس معمولی سیوک کو سردار بنانے پر راضی ہو تو کیا تم سرفراز کو اپنا سردار بنا لو گے؟

غفور - بے شک، مگر سرفراز کے لیے بھوانی سے شگون لینا ضروری ہے۔

کئی اور آوازیں - بے شک۔

اسمٰعیل - سرفراز تمھارے لیے نیا نہیں ہے۔ تم پچھلے سفر میں اس کے کارنامے دیکھ چکے ہو۔ وہ خوبصورت، جوان اور تندرست ہے اس کی باتوں میں جادو ہے۔ قیمتی پوشاک میں وہ نواب زادہ لگتا ہے۔ اس نے پچھلے سفر میں کئی اچھی اسامیوں کی مضبوط گردن میں رومال ڈال کر انھیں ایک سیکنڈ میں ختم کر دیا تھا۔

کئی آوازیں - ہمیں معلوم ہے۔

اسمٰعیل - نیزہ بازی میں اس کا جواب نہیں۔ شہسواری میں اسے کمال حاصل ہے۔ پہلوانی میں میرا بیٹا رستم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی سرداری میں ہمارے قافلہ پر دھن برسے گا دھن۔

بدری - تو پھر کیا دیر ہے سردار شگون لے لیا جائے۔

اسمٰعیل ۔ (بہار زمانے کے لب و لہجے میں) دیوی بھوانی ہمیں ہدایت دے ! ہمیں راستہ دکھا ، اگر تو اپنے سیوک سرفراز کو اپنے گروہ کی سرداری کے لیے قبول کرتی ہے تو ہمیں شگون دے ہمیں اجازت دے دیوی ! دیوی !!

اسمٰعیل ۔ (تھوڑی دیر بعد) ہم خاموشی سے تیرے اشارے کا انتظار کریں گے ۔

(تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہتی ہے پھر اچانک کہیں
قریب ہی سے اُلو کے بولنے کی آواز سنائی دیتی ہے کچھ
دیر تک یہ آواز آتی رہتی ہے)

سب لوگ ۔ (خوشی سے مست ہو کر) جے بھوانی مائی کی :- جے بھوانی مائی کی !

اسمٰعیل ۔ شکر ہے لاکھ لاکھ شکر ہے بھوانی مائی نے میری لاج رکھ لی ۔ سرفراز میرے بیٹے آ میرے سینے سے لگ جا ۔

غفور ۔ مبارک ہو سرفراز ۔

اسمٰعیل ۔ میرے بیٹے سرداری مبارک ہو ۔ خدا نے آج بڑے ارمانوں کے بعد مجھے یہ دن دکھایا ہے ۔

سب ۔ مبارک ، سلامت ،

اسمٰعیل ۔ سرفراز آؤ ۔ میرے سامنے آ کر کھڑے ہو جاؤ ۔ خدا کے سامنے قسم کھاؤ ۔ حلف اُٹھاؤ کہ تم ٹھگی کے اصول پر چلو گے ۔

سرفراز ۔ میں قسم کھاتا ہوں ۔

اسمٰعیل ۔ ماتا بھوانی کے اس مقدس نشان پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ اپنے رُومال سے ہر اُس انسان کی جان ضرور لو گے جس کے لیے ماتا بھوانی کا اشارہ مل جائے ۔

سرفراز ۔ میں قسم کھاتا ہوں ۔

اسمٰعیل ۔ قسم کھاؤ کہ جہاں تک ہو سکے گا عورت کے قتل سے ہاتھ نہ رنگو گے بلکہ اس کی عزت کرو گے ۔ دھوبی ۔ نائی ۔ کنجڑے وغیرہ کے قتل سے باز رہو گے اور ٹھگی کا راز کبھی کسی کو نہ بتاؤ گے ۔

سرفراز ۔ میں قسم کھاتا ہوں ۔

اسمٰعیل ۔ اور اگر تم نے کبھی یہ راز فاش کیا تو تمہاری سزا ٹھگی کے قانون کے مطابق موت ہو گی ۔

سرفراز ۔ مجھے منظور ہے ۔

اسمٰعیل ۔ قسم کھاؤ کہ اگر عورت ، مرد یا سمجھدار بچہ ہیں سے ـــــ کوئی تمہارا بھید جان لے گا تو تم اُسے ٹھگی کے قانون کے مطابق جان سے مارنا اپنا فرض سمجھو گے ۔

سرفراز ۔ میں خدا اور بھوانی ماتا کے سامنے قسم کھاتا ہوں ۔

اسمٰعیل ۔ بھائیو ۔ تمہارا سردار تمہیں مبارک ہو ۔

سب ۔ بھوانی ماتا کی جے !

اسمٰعیل ۔ بھائیو ۔ اب تم سب بھی پاک نشان پر ہاتھ رکھ کر بھوانی ماتا کے سامنے قسم کھاؤ کہ جب تک وہ ٹھگی کے اصول پر چلے گا

تم سرفراز کی سرداری قبول کروگے اور جب وہ اس راستے سے ہٹنے کی کوشش کرے گا تو تم اسے بھوانی کی بھینٹ چڑھا دوگے۔اور اس کے خون کا تلک لگاؤ گے۔

سب ۔ ہم سب قسم کھاتے ہیں ہم سب پہ تگیا کرتے ہیں۔

(اچانک ڈھول پر زور کی چوٹ پڑتی ہے اور جھانجھ کی آواز آتی ہے)

اسمٰعیل ۔ جاؤ سب جشن مناؤ۔

[جشن شروع ہوتا ہے لوگ ناچ گانے میں محو ہو جاتے ہیں]

(یہ آوازیں پس منظر سے آتی رہتی ہیں سب لوگ خیمے سے باہر چلے جاتے ہیں اور ناچ گانے میں مصروف ہو جاتے ہیں صرف غفور۔ سرفراز اور اسمٰعیل رہ جاتے ہیں)

(موسیقی فضا میں بکھر جاتی ہے ایک مردانہ آواز سرگم کی تان لیتی ہے جھانجھ اور گھنگھروؤں کی آواز سماں باندھ دیتی ہے۔یہ کیفیت کچھ دیر جاری رہتی ہے پھر دھیرے دھیرے موسیقی کی لے مدھم ہونے لگتی ہے اور اسمٰعیل کی آواز اُبھرتی ہے جو سرگوشی میں سرفراز سے کچھ گفتگو کر رہا ہے)

اسمٰعیل ۔ سب جشن منا رہے ہیں۔میرے بیٹے۔کل تمہارے امتحان کا دن ہے۔

سرفراز ۔ میں تیار ہوں۔

اسمٰعیل ۔ غفور کل ہی نیا شکار پھانس کر لاؤ۔تاکہ دالوں کو فوراً سرفراز خان کی سرداری کا تحفہ ملنا چاہیئے۔

غفور ۔ خان غفور آپ کی سب باتیں مانے گا مگر اس بار تو سرفراز خان کو شگون کے لیے اپنا شکار خود ہی پھانسنا چاہیئے۔

سرفراز ۔ مگر یہ تو سوتھائی کا کام ہے۔

غفور ۔ ہاں میں سوتھائی[1] ہوں میرا یہی کام ہے مگر سردار کو تو سوتھائی سے لے کر بھٹوٹی[2] اور لگھائی[3] تک سب کے کام آنے چاہئیں۔

سرفراز ۔ یعنی میں اپنے آپ شکار پھانسوں۔خود انھیں موت کے گھاٹ اتاروں اور خود ہی قبر کھود کر انھیں دفن کروں ——— تو پھر تم کیا کروگے؟

---

[1] سوتھائی۔ ٹھگی کی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو شکار پھانس کر لائے۔

[2] وہ شخص جو شکار کی گردن میں رومال ڈال کر اس کا گلا گھونٹے۔

[3] جو قبر تیار کرے۔

غفور - جو مجھے کرنا چاہیئے ۔
اسمٰعیل - غفور! تمہیں اپنے سردار کی مدد سے انکار ہے ؟
غفور - میری کیا مجال!
اسمٰعیل - پھر کیا چاہتے ہو ؟
غفور - میں سرفراز کے ساتھ جانے کو تیار ہوں مگر شکار پھانسنے کا کام سردار کو کرنا ہوگا ۔
سرفراز - مجھے منظور ہے۔غفور! زندگی میں میں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ تمہارے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔میں تمہیں دکھا دوں گا سوٹھائی کسے کہتے ہیں ـــــ (بلند آواز میں) جاؤ۔
غفور - بہت اچھا،جب میری ضرورت ہو مجھے یاد کر لیا جائے ۔
اسمٰعیل - میرے بیٹے ـــــ یہ تم نے کیا کیا ؟
سرفراز - میں اپنی قسمت آزمانا چاہتا ہوں اباجان۔ میں غفور کو اور سارے قافلے والوں کو دکھا دینا چاہتا ہوں کہ سرفراز کے پاس ہمت بھی ہے اور فراست بھی۔ آج آپ دیکھیں گے اباجان مجھے زندگی کی دوسری شاندار کامیابی ہوگی ۔
اسمٰعیل - بھوانی ماتا کی یہی مرضی معلوم ہوتی ہے ۔
سرفراز - آپ کا بیٹا صرف خدا اور بھوانی پر بھروسہ کرنا جانتا ہے۔انسان تو کھلونا ہے جسے تباہ کرنا میرا فرض ہے ۔
اسمٰعیل - کل اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔

دوسرا منظر

[خیموں کے باہر میدان میں۔صبح ہونے والی ہے]

غفور - صبح ہو گئی۔ ابھی تک سرفراز نہیں آیا ۔
بدری - سرفراز نہیں سردار کہو،غفور سردار ۔
غفور - ابھی نہیں،آج کی سوٹھائی کے بعد دیکھنا کون کس کو سردار کہتا ہے ۔
بدری - کس طرف کا ارادہ ہے ؟
غفور - غفور کو نہیں جانتے بدری۔میری پانچوں انگلیاں میں پانچ پرلوک کے بھید ہیں ۔ وہ غلطی پر ہیں جو غفور کو آزماتے ہیں ۔
بدری - مجھے معلوم ہے ۔
غفور - میں گھر پھونک کر رکھ دیتا ہوں اور کوئی میری چنگاری کو نہیں دیکھ سکتا ۔
بدری - اس کا مطلب ؟!
غفور - مطلب وقت بتائے گا ـــــ وہ دیکھو سامنے گھوڑے پر سرفراز آ رہا ہے ۔

بدری ۔ سوداگروں کے لباس میں تو بالکل مہاراجہ لگ رہا ہے۔

غفور ۔ اونہہ مہاراجہ !؟ تم سب لوگ چڑھتے سورج کے پجاری ہو تم ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھتے ہو۔

سرفراز ۔ (سرفراز قریب پہنچ کر) سورج نکل آیا۔ تم دونوں تو سچ مچ کے سوداگر معلوم ہو رہے ہو۔

بدری ۔ بندہ پروری ! ذرہ نوازی ! ! آخر شریف آدمی ہیں، بھلی پوشاک پہن لیں تو ایک ذرا میں کچھ کی کچھ صورت نکل آتی ہے۔

سرفراز ۔ کون کہتا ہے ٹھگی جرم ہے۔ ٹھگی فن ہے۔ لباس کی تبدیلی، چہرے مہرے اور شکل و صورت کی تبدیلی، پھر ہر قبیلے کی چال ڈھال، بول چال برتنا، کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے۔ میں اس فن کو کمال تک پہنچاؤں گا —— غفور گھوڑے تیار ہیں ؟

غفور ۔ جی ہاں سردار —— ہم لوگ آپ کے ہمراہ چلنے کے لیے تیار ہیں ۔

سرفراز ۔ نہیں میں تنہا جاؤں گا۔

غفور ۔ بے کار ہے۔ اکیلے جانے سے کام نہ بنے گا۔

سرفراز ۔ خاموش، بھرنی کا انتظار کرو —— بھوانی ماتا کے اشارے کا انتظار کرو۔

بدری ۔ وہ دیکھیے بگلوں کی قطار پورب سے اڑتی چلی آ رہی ہے ۔

سرفراز ۔ شگون بہت اچھا ہے بھائیو —— اچھا خدا حافظ۔ میں قسمت آزمائی کرتا ہوں۔ آج سے ہمارے قافلے میں دھن برسے گا۔ میں بھوانی ماتا کی قسم تم سب کو مالا مال کر دوں گا ۔

بدری ۔ آپ کس طرف جائیں گے سردار۔

غفور ۔ یہاں کے راستے بڑے ٹیڑھے میڑھے ہیں ۔

سرفراز ۔ میں اکثر ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزرا ہوں غفور۔ میں تالاب کی طرف جا رہا ہوں ۔

[چلا جاتا ہے تھوڑی دیر دونوں اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں]

غفور ۔ چلا گیا، چلو ہم واپس چلیں ۔

بدری ۔ کیوں ؟ !

غفور ۔ آج کا دن بھی بیکار گیا۔ کیا مرغابیوں کی گردن میں رومال ڈال کر شکار کرے گا ! ! تالاب اونہہ ! ! تالاب کے کنارے اسے کون ملے گا۔ سوٹھائی بڑا مشکل کام ہے تجربہ چاہیے ۔

بدری ۔ مگر بھوانی ماتا کا شگون اچھا ہے۔

غفور ۔ بھوانی ماتا بھی کبھی کبھی اپنی مایا دکھاتی ہیں آؤ چلیں ——

تیسرا منظر

[جنگل میں تالاب کے کنارے، صبح کے ۹ بجے]

نوجوان لڑکی ۔ اے ...... اے ...... سنو ...... بات سنو ۔

سرفراز ۔ مجھ سے کچھ کہا تم نے ۔

نوجوان لڑکی ۔ ہاں ہاں تم سے کہا ۔ کوئی غضب ہو گیا ۔ آدمی آدمی سے بات کرتا ہے ۔

سرفراز ۔ کیا کام ہے ؟

لڑکی ۔ ارے اب میں بھر دور سے تھوڑا ہی بتاؤں گی کیا کام ہے ۔ ذرا پاس آؤ ۔ ایک نظر دیکھیں تو، شریف آدمی ہو کہ یونہی چلنے پھرنے چور اچکے ہو ۔

سرفراز ۔ آپ کی تعریف ؟!

لڑکی ۔ میرا نام ہے مور پنکھی، شریف گھرانے کی باندی ہوں ۔ نواب سبزی خان کا نام سنا ہے ۔ میری ماں کریمہ ان کی پرانی کنیز ہے —— اور تم ۔

سرفراز ۔ میرا نام ایسا خوب صورت تو نہیں ہے ۔

لڑکی ۔ وہ تو صورت سے ظاہر ہے ۔ ہو گا یہی کوئی کلو خان ۔ حشمت بیگ وغیرہ ۔

سرفراز ۔ میرا نام ہے سرفراز مرزا ۔

لڑکی ۔ کام ؟

سرفراز ۔ بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھانا ۔

لڑکی ۔ یا راستہ چلتے ہوؤں کو بہکانا ۔

سرفراز ۔ آپ کہیے ۔ کیا ارادہ ہے ؟

لڑکی ۔ میرا ارادہ، دیکھیے اعلیٰ حضرت ۔ نواب سبزی خان بہادر سفر پر نکلے ہیں ۔ مجھے نگوڑا یہ جنگلوں میں مارے مارے پھرنا اچھا نہیں لگتا ۔ نواب صاحب سال بھر میں ایک دفعہ سسرال جاتے ہیں تو شکار کی دھن میں جنگلوں میں ٹھہرتے ہوئے جاتے ہیں، تم بھی شکاری ہو ؟

سرفراز ۔ ہاں شکار سے مجھے شوق ہے مگر بڑے شکار سے ۔

لڑکی ۔ تم نے کبھی شکار کیا بھی ہے ؟

سرفراز ۔ شکار کرنے کا ارادہ ہے ۔

لڑکی ۔ تم نے خون کا مزہ چکھا ہے کبھی، اس جانور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہیں جس کی گردن مروڑ دی گئی ہو اور جو گھائل ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے زمین اور آسمان کو دیکھ رہا ہو اور اپنے جوڑے پر حسرت کی نظر ڈال رہا ہو ۔

سرفراز ۔ موت میں یہ سب کچھ ہوتا ہے ۔

لڑکی ۔ میرا دل پھٹتا ہے ۔ نواب سبزی بہادر کا سارا قافلہ تو روانہ ہو چکا ہے بس میں اور نہیں نواب صاحب کے ساتھ ہیں ۔ تنہائی میں دم گھٹا جاتا ہے میں ذرا خیمے سے نکلی تو راستہ بھول گئی ۔ مجھے خیمے تک پہنچا دو گے ۔ ؟

سرفراز ۔ تمہیں یوں اکیلے نہیں پھرنا چاہیئے ۔

لڑکی ۔ کیوں ؟

سرفراز ۔ تم جوان ہو ۔

لڑکی ۔ بس —— ؟ !

سرفراز ۔ خوب صورت ہو ۔

لڑکی ۔ بس ——

سرفراز ۔ کم عمر ہو ، حسین ہو ، ناتجربہ کار ہو ، کامنی ہو ، چنبیلی کی ڈالی اور گلاب کے پھول کی طرح نرم و نازک ہو ۔

لڑکی ۔ اوہو سچ مچ ، کیا میں سچ مچ خوب صورت ہوں ؟ ۔ سب یہی کہتے ہیں کوئی نہیں بتاتا خوبصورتی کسے کہتے ہیں ۔ تمھیں معلوم ہے ؟

سرفراز ۔ ہاں معلوم ہے ۔

لڑکی ۔ بتاؤ ۔

سرفراز ۔ خوبصورتی اس شراب کو کہتے ہیں جو ایک نظر میں مست کر دیتی ہے اور جس کا نشہ زندگی بھر نہیں اترتا ۔

لڑکی ۔ ارے رے ...... تب تو چلو ، میں تمہیں نواب سے ملاؤں گی وہ بھی شاعر ہیں ۔ کیا کیا غزلیں لکھتے ہیں غضب کرتے ہیں اماں کہتی ہے بہت قابل آدمی ہیں ایک غزل لکھی تھی ——

چھپا ہے مانگ میں دل اب بتاؤ ڈھونڈوں کدھر
کہ آدھی رات ادھر ہے اور آدھی رات ادھر

سرفراز ۔ اہاہا مزا آ گیا —— چلو میں تمہیں خیمے کے راستے کی طرف لے چلتا ہوں ۔ بتاؤ تو سہی کدھر ہے وہ خیمہ ؟

لڑکی ۔ یہ جو سامنے شیشم کے پیڑ ہیں ان سے بائیں طرف جا کر دائیں کو مڑتے ہیں تو ڈھاک کا جنگل آتا ہے بس وہیں ۔ مگر مجھے ٹھیک راستہ نہیں آتا ۔

سرفراز ۔ میں راستہ ڈھونڈھ لوں گا ۔ چلو ۔

(تھوڑی دیر تک خاموش چلتے رہتے ہیں)

لڑکی ۔ تمہیں گانا آتا ہے ۔

سرفراز ۔ ہاں کچھ کچھ ۔

لڑکی ۔ تم جوان ہو خوب صورت ہو کم عمر ہو ناتجربہ کار ہو پھر گانا بھی آتا ہے ۔ اے تم مجھے پہلے سے کیوں نہیں ملے میں

تم سے پیار کرتی ہیں تمھیں چرا کرلے جاتی ——— ایک بات بتاؤں۔ سچ کہنا ٹھیک ہے نا تم سوداگر ہو۔ دلستی آئی ہے نا یہی بات۔

سرفراز ۔ ہاں اور اس وقت جان اور مال کا سودا کر رہا ہوں۔

لڑکی ۔ لاؤ۔ ہم خریدتے ہیں۔

سرفراز ۔ گانا آتا ہے تمھیں ؟

لڑکی ۔ ہاں ناچنا بھی آتا ہے۔ وہ ٹھمک ناچتی ہوں کہ کالکا اور بندادین میرے سامنے پانی بھریں۔

سرفراز ۔ تو کب ؟

لڑکی ۔ آج رات کو ؟ دیکھو وہ خیمے نظر آنے لگے۔ چلو تمھیں نواب سے ملواؤں۔

چوتھا منظر

[نواب صاحب کا خیمہ ۔ دن کے یہی کوئی ۹ بجے]

نواب ۔ کیا شہرت ہے۔ خیر و مگر کرے کے ہاتھ سے اس کی لذت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ ا ہا ہا۔ خدا کی قسم اگر ہم سکندر اعظم ہوتے اور ساری دنیا پر ہماری حکومت ہوتی تو سبزی[۱] کے لیے ہم اپنی آدھی حکومت بخش دیتے۔ ایک پیالہ اور ——— اور یہ مورپنکھی کہاں چلی گئی۔ واللہ رات اس نے کیا ٹھمک ناچا ہے۔

مورپنکھی ۔ یہ دیکھئے۔ سوداگروں کے بادشاہ سرفراز مرزا !

نواب ۔ آئیے حضرت۔ یعنی جنگل میں بھی سوداگری۔ یعنی حد ہے۔ دنیا کام کی دیوانی ہے۔ اس کی قسمت میں عیش نہیں میاں مسافر یہ مورپنکھی تمھیں کہاں سے پکڑ لائی۔

سرفراز ۔ یہ راستہ بھول گئی تھی۔

نواب ۔ یہ بھی خوب ہے۔ یہ تو خود دوسروں کو راستہ بھلانے کے لیے کافی ہے۔ بھئی ایمان سے کہنا یہ سچ دیکھ یہ الھڑپن یہ قیامت کی شوخی، مستی، البیلا پن خوبصورتی، گلاب کی پنکھڑی کی سی نزاکت، کہیں دیکھی ہے تم نے۔ اس کی آنکھیں شبنم سے بھرے ہوئے کنول۔ اس کے بال برسات کی کالی گھٹا ——— اور ناچنے میں بھی قیامت ہے۔ بجلی ہے۔ طوفان ہے ——— تم نے اسے دیکھ کر خدا کی قدرت کے سامنے سجدہ کیا تھا یا نہیں ؟!

سرفراز ۔ آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔

نواب ۔ اچھا یہ بتاؤ کیا شغل کرو گے سبزی پیو گے۔

---

[۱] سبزی یعنی بھنگ

سرفراز ۔ جی نہیں ۔ اس نعمت سے محروم ہوں ۔
نواب ۔ لاحول ولاقوۃ ۔ اس کو زندگی اس لیے دی گئی ہے کہ عیش کرے ۔ سوداگری تو مرنے کے بعد بھی ہو سکتی ہے عیش کرلو عیش ۔
سرفراز ۔ جی ہاں قبلہ صحیح فرمایا ۔
نواب ۔ پھر کس چیز سے شغف ہے ؟
سرفراز ۔ شکار سے ۔
نواب ۔ خوب خوب ، چلو خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو ۔
سرفراز ۔ میرے ساتھ تو کئی دیوانے ہیں ۔
نواب ۔ یعنی کہ سوداگروں کا پورا قافلہ ہے ۔
سرفراز ۔ جی ہاں ۔
نواب ۔ کوئی شکاری بھی ہے ۔
سرفراز ۔ ایک سے ایک بڑا شکاری ہے نواب صاحب ۔ کیا مجال کہ نشانہ خطا ہو جائے ۔ بلم ، بندوق ، تلوار ، لاٹھی ، برچھی ، تیر ۔ ہر ہتھیار میں ماہر ۔ ہر چیز میں اُستاد ۔
نواب ۔ میاں خیرو ۔ بستر باندھو ۔ ہم ان لوگوں کے قافلے کے ہمراہ جائیں گے کچھ دن سیر شکار ہو جائے ۔ کہاں روز روز گھر سے نکلنا ہوتا ہے ۔
سرفراز ۔ مگر حضور کے پاس قیمتی سامان ہے ۔
نواب ۔ ہے تو کیا ہوا ۔
سرفراز ۔ پھر اگلی منزل پر آپ کے ساتھی آپ کی راہ دیکھ رہے ہوں گے ۔
نواب ۔ وہ اپنی راہ چلے جائیں گے ہم چند دن بعد پہنچے تو سمجھیں گے شکار پر چلے گئے ۔
سرفراز ۔ نہیں قبلہ میں اس کی رائے نہ دوں گا ۔ سفر کا معاملہ ہے اور وہ بھی جنگل کا ۔ راستے چور اچکوں سے بھرے ہوئے ہیں کوئی اُونچ نیچ ہو جائے تو مجھے شرمندگی ہوگی ۔
نواب ۔ (بے فکری سے ہنستا ہے) شکاری ہو کر ڈرتے ہو ۔ ارے ہم موت سے آنکھیں لڑاتے ہیں ۔ میاں خیرو ۔ سامان باندھو ۔
مورپنکھی ۔ لیجئے ۔ حقہ حاضر ہے ۔
نواب ۔ لو میاں سوداگر مورپنکھی نے تمہارے لیے خود حقہ تازہ کیا ہے پیو ۔
سرفراز ۔ میری خوش قسمتی ۔
نواب ۔ تم سچ مچ بڑے خوش قسمت ہو ۔

پانچواں منظر

[اسمٰعیل کا خیمہ - دن چڑھ آیا ہے سہ پہر کا وقت]

سرفراز - میری بڑی خوش قسمتی کہ آپ سے نیاز حاصل ہوا ——— یہ ہیں ہمارے چچا - یہ ہمارے سوداگر بھائی ہیں۔

اسمٰعیل - نیاز مند کو اسمٰعیل مرزا کہتے ہیں۔

نواب - سبحان اللہ آپ لوگوں نے تو جنگل میں منگل کر دیا ہے بس صرف خواتین کی کمی ہے ورنہ گھر کا مزا آ نا ہوگا۔

اسمٰعیل - جی ہاں مگر سوداگر بچے کہاں اپنے خاندان کو لیے لیے پھریں ہمارا کیا ہے آج یہاں ہیں کل وہاں ہیں۔

نواب - مورپنکھی ——— تم آگئیں۔

مورپنکھی - میں نہ آتی۔ میں نے ہی تو ڈھونڈھا ہے سرفراز مرزا کو۔ ٹھگوں اور چوروں کے جنگل میں اکیلے بڑا ڈر لگتا تھا خدا کی قسم میں تو سہم گئی تھی۔

سرفراز - ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

نواب - بہتری اور خوب صورت لڑکی سے موت بھی بھاگتی ہے ——— ارے بھئی اب کیا دیر ہے سب کو بلاؤ۔ بھائی برادروں کو جمع کرو میاں خیرو سے کہو طبلہ لائیں سازندہ تو یہاں کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا جم جائے محفل۔ ہمیں شعر سے بڑی نفرت ہے۔ خدا کی قسم اپنی زندگی تو رنگ رلیوں ہی میں کٹ گئی۔

سرفراز - جوارث دار استاد غفور خاں۔ نواب صاحب کے پاس بیٹھو۔ سیٹھ بدری پرشاد۔

نواب - آئیے سیٹھ جی آپ ادھر آئیے۔ بخدا ہم بہت خوش ہیں۔ آپ لوگ مل گئے۔ سفر جنت بن گیا۔ میاں زندگی کیا ہے یہی دو گھڑی ہنسنا بولنا۔ مورپنکھی۔ آج کوئی پھڑکتی ہوئی چیز سناؤ کہ روح بھی جھوم اٹھے۔

(سازندے ساز ملاتے ہیں)

مورپنکھی کی آواز رس گھولتی ہوئی فضا پر پھیل جاتی ہے ———

[رقص]

سرفراز - حضور تعریف نہیں ہو سکتی۔ چھلاوا ہے بجلی ہے کرشمہ ہے۔

نواب - مورپنکھی، ہماری سب سے بڑی دولت ہے۔ تم جانتے ہو سرفراز ——— ہم دو چیزوں سے زندہ ہیں۔ تم کہو گے پانی اور ہوا۔ نہیں ہم وہ نہیں ہیں (گدھا ہنگتا ہے) وہ گدھے اور ہوں گے ہم تو سبزی اور مورپنکھی سے زندہ ہیں۔

سرفراز - غفور خاں - یہ کس جانور کی بولی تھی۔

غفور - جھرنی[1]

---

[1] ٹھگی کی اصطلاح میں کسی جانور کی آواز جو مبارک شگون مانی جاتی ہے۔

نواب - یہ کون جانور ہوتا ہے۔

سرفراز - یہ خاص اس جنگل کا جانور ہے - بڑا لذیذ ہوتا ہے اور اس کے شکار میں وہ مزا ہے کہ حضور شیر کا شکار بھول جائیں گے یہ عرض کرتا ہوں عجیب و غریب چیز ہے مگر ذرا دو چار دن میں قابو میں آتا ہے بڑا ہانکا کرانا پڑتا ہے۔

نواب - کوئی بات نہیں - مور پنکھی - تم یہاں رہنا - شام تک ٹھیرو تو بھیجیں گے نہیں تو یہ سب شریف آدمی ہیں یہ لوٹ نہ ہیں کے برابر اسمٰعیل مرزا ہیں گھبرانا مت - ہم شکار سے واپس آ کر تمہیں لے چلیں گے - دراصل ہم نے بڑی غلطی کی تمہیں پہلے قافلے کے ساتھ بھیجدینا چاہیئے تھا۔

مور پنکھی - ہم آپ کے ساتھ شکار پر چلیں گے - ہم سے نہیں رہا جائے گا۔

نواب - اچھا دیکھا جائے گا تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ تھک گئی ہو گی۔

سرفراز - تمھارے لیے خیمہ سجا دیا گیا ہے - جاؤ آرام کرو۔

مور پنکھی - دیکھئے میرے پیچھے شکار پر نہ چلے جایئے گا۔

نواب - پگلی - جا آرام کر لے۔

اسمٰعیل - سفر آپ کی وجہ سے بڑا اچھا کٹ رہا ہے۔

نواب - یہ آپ کیا کہتے ہیں حضرت - یہاں تو مستقل دم حلق میں اٹکا رہتا تھا - سارے ہتھیار پاس تھے آدمی ساتھ مگر سفر میں خطرہ لگا ہی رہتا ہے اب آپ ایسے لوگوں کا ساتھ ہو گیا خطرہ نہیں رہا - کچھ سبزی کا شغل رہا۔

اسمٰعیل - حقہ ملاحظہ کیجیے۔

نواب - خوب (حقہ کا کش لگاتے ہیں) جناب سبزی بھی خوب چیز ہے - چلو میں آ تو - نہ غم دزد نہ غم کالا - ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ دو پیالے غٹا غٹ چڑھا کر جو شیر کے شکار کو نکلا تو ٹانڈ تک پہنچے بھی نہ پایا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ شیر ببر ایک ایک کلا دس دس من کا اینڈتا اکڑتا چلا آ رہا ہے مجھے دیکھتے ہی چنگھاڑ ماری جست مار کر حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ ڈپٹ کر جو میں نے لنگڑی ماری ہے تو دھوبی پاٹ پر کس لیا - چت کر کے وہ گھونسے وہ لاتیں ماریں کہ جیب پول گیا - پھر بھی شباب تھا - زمین پر ٹھوکر مار دوں تو پانی نکل آئے - ایسا دم دبا کر بھاگا کہ آج تک صورت نہیں دکھائی۔"

سرفراز - سبحان اللہ سبحان اللہ - نواب صاحب آپ پان سے شوق فرمائیں گے۔

اسمٰعیل - پان حاضر ہیں ـــــ مگر تمباکو (بلند آواز میں) ارے کوئی ہے تمباکو لاؤ۔

(تھوڑی دیر گڑبڑ اور ہلچل مچتی ہے نواب کا گلا سرفراز مرزا رومال سے گھونٹ دیتا ہے۔ نواب بے دم ہو کر گر پڑتا ہے لوگ اس کی لاش لے جاتے ہیں)

سرفراز - مر گیا کم بخت - رومال کی گرفت کافی دیر سخت کرنی پڑی۔

اسمٰعیل - مبارک ہو سرفراز مبارک ہو - پہلا شکار مبارک ہو - شاباش میرے بیٹے شاباش۔

غفور ۔ مبارک ۔
بدری ۔ مبارک ہو ۔
سرفراز ۔ اگر تم دونوں نواب کے ہاتھ پیر اتنی اچھی طرح نہ پکڑتے تو اس قدر تیزی سے میں اس کی گردن کو رومال میں نہ جکڑ سکتا۔ میرے بھائیو ۔ یہ ہم سب کا حصہ ہے ۔
بدری ۔ اور اس کا نوکر جبرو ؟
سرفراز ۔ اسے دوسرے خیمے میں قتل کر دیا گیا۔
بدری ۔ قبر ؟
سرفراز ۔ لگھائیوں نے قبریں تیار کر رکھی ہیں ابھی ایک منٹ میں ہم ان دونوں کا نشان ختم کر دیں گے ۔
غفور ۔ مورنکھی کا کیا ہوگا ؟
سرفراز ۔ عورت کا قتل نہیں ہوگا ۔ ہم اس سے کہہ دیں گے کہ نواب صاحب شکار کو چلے گئے ۔
غفور ۔ اور مال ؟
سرفراز ۔ پانچہزار روپیہ نقد اور دس ہزار کا سامان ۔ یہ سب ہمارا ہے ۔ ہم سب کا ہے ۔ یہ میری سرداری کا پہلا تحفہ ہے ۔ آج یہ سب بانٹا جائے گا ۔
بدری ۔ مبارک ہو ۔ سردار پہلی کامیابی مبارک ہو ۔
سرفراز ۔ بدری ۔ میرے بھائی یہ میرا فرض تھا ۔ میں بھوانی کا ادنیٰ سیوک ہوں ــــــ جلدی کرو لگھائیوں سے کہو قبریں پاٹ کر زمین برابر کر دیں اور اس پر فرش بچھا دیں ۔ آج رات کو اس جگہ مورنکھی بھی ناچے گی اور سنو ۔ غفور تم قافلے کے تین چار آدمیوں کو سفر پر روانہ کر دو ۔ مورنکھی سے کہہ دیں گے کہ ہمارے آدمیوں کو بھی نواب صاحب شکار پہ لے گئے ہیں ۔
بدری ۔ بہت اچھا ۔
سرفراز ۔ یہ سب کام فوراً ہونا چاہیئے ۔
بدری ۔ ابھی ہو جائے گا ۔
سرفراز ۔ ابّا جان آپ سارا مال جمع کر کے اس کے بٹوارے کا انتظام کریں ۔
اسمٰعیل ۔ ابھی بٹوارہ ہوا جاتا ہے ــــــ بیٹے تو نے آج میرے بڑھاپے کی لاج رکھ لی ۔ میں بھی جوانی میں اسی طرح رومال کے ایک جھٹکے سے گردن کو جھٹکا دیا کرتا تھا ۔ میرا سر آج غرور سے بہت اونچا ہو گیا ہے ۔
سرفراز ۔ آج میں نے پہلی بار انسانی خون کا مزا چکھا ہے ۔ پہلی بار میں نے انسان کو اپنے ہاتھوں مرتے دیکھا ہے ۔ یہ انسان قدرت کے ہاتھ کا کھلونا انسان (قہقہہ لگاتا ہے)
اسمٰعیل ۔ بھوانی تیرے دل کو سکون اور تیرے ہاتھوں کو طاقت دے میرے بیٹے ۔

سرفراز ۔ انسان جو مغرور گھمنڈی، فرعون، خدائی کا دعویٰ کرنے والا انسان، ایک معمولی سے کپڑے کی گرفت میں دم توڑ دیتا ہے اس کا سارا گھمنڈ، ساری چالاکی، ساری دانشمندی اور طبیعت میں رومال کے ایک پیچ میں ختم ہو جاتی ہے کیسی آنکھیں اُبل آئی تھیں کیسے نرخرا خرخر کرنے لگا تھا کس طرح رگیں پھٹنے لگی تھیں اور اشرف المخلوقات کی ساری شیخی کرکری ہو گئی انسان تو دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ ہے انسان (پھر قہقہہ لگاتا ہے)

بدری ۔ سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

سرفراز ۔ زمین برابر کر دی گئی۔

غفور ۔ جی ہاں - فرش بچھا کر لوبان اور اگر سلگا دیا گیا۔

سرفراز ۔ یہ اس قافلے کا سات سو انیسواں شکار تھا۔

(ایک دم مورپنکھی بھاگتی ہوئی آتی ہے شام ہونے لگی ہے)

مورپنکھی ۔ نواب صاحب میں نے بڑا اچھا خواب دیکھا ہے۔ میں نے بڑا اچھا سا خواب ...... ایں ...... نواب صاحب کہاں ہیں۔

سرفراز ۔ آؤ۔ اندر آؤ مورپنکھی۔

مورپنکھی ۔ نواب صاحب کہاں گئے۔

سرفراز ۔ نواب صاحب۔

مورپنکھی ۔ مجھ سے چھپا رہے ہو نا! چلے گئے ہوں گے شکار پہ۔ مجھ سے چوری چوری چلے گئے۔ کہہ رہا تھا میں نے کہ مجھے لے کے جائیے گا۔ بہانے بنانا تو کوئی ان سے سیکھے۔ مجھے بیٹی کی طرح پالا پوسا لاڈ کیا مگر مجھے چھوڑ کر چلے جانے کی عادت نہ گئی۔

سرفراز ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں مورپنکھی! وہ شکار سے جلد واپس آ جائیں گے۔

مورپنکھی ۔ ان کا کوئی ٹھیک نہیں۔ اگر لمبے نکل گئے تو بھلا میں گھر کیسے پہنچوں گی۔

سرفراز ۔ کیا سچ مچ تمہیں گھر پہنچنے کی فکر ہے؟

مورپنکھی ۔ کیسے نہیں ہوتی!

سرفراز ۔ بہت سے لوگوں کو گھر کی فکر ہوتی ہے مگر کچھ ایسے ہوتے ہیں جو جہاں رہتے ہیں وہیں گھر بنا لیتے ہیں۔

مورپنکھی ۔ (کھسیانی ہنسی ہنستی ہے) اچھا ...... ! (پھر اس طرح ہنستی ہے) اچھا ...... نواب صاحب کہتے ہیں۔

سرفراز ۔ کیا کہتے ہیں نواب صاحب۔

مورپنکھی ۔ کہتے ہیں ...... اچھا تم بتاؤ کیا کہتے ہیں۔

سرفراز ۔ مجھے کیا معلوم؟!

مورپنکھی ۔ کہتے ہیں مورپنکھی کے ہاتھ تو مور جیسے خوب صورت آدمی کے ہاتھ میں تھماؤں گا۔ اس کے ہاتھ پیلے کر دوں تو مجھے

بے فکری ہو اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں . . . . . مجھے تو شرم آتی ہے ۔

سرفراز ۔ تمہیں اور شرم ؟!

مورپنکھی ۔ کیوں ؟ کیا میں عورت نہیں ہوں کیا میں دل نہیں رکھتی ۔

سرفراز ۔ تمہارے دل بھی ہے ؟

مورپنکھی ۔ بہت بڑا ۔ بہت اچھا سا دل ہے ۔ بڑا چنچل دل ہے ۔ ایک بات تمہیں بتاؤں ؟

سرفراز ۔ بتاؤ ۔

مورپنکھی ۔ جب میں نالا کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور میں نے تمہیں اس طرح آواز دی تھی "اے . . . . . اے . . . . . ذرا سننا" تو میں نے تمہیں تھوڑی ہی آواز دی تھی ۔

سرفراز ۔ اور کس نے آواز دی تھی ۔؟

مورپنکھی ۔ میرے چنچل دل نے !

سرفراز ۔ کیوں ؟

مورپنکھی ۔ بس یوں ہی ۔ ہمیں اچھے لگے ۔ ہم نے بلا لیا ۔ دل نے کہا اس آدمی کو لے لو ۔ اسے ہتھیا لو ۔ اسے اپنا لو ۔

سرفراز ۔ سچ ؟

مورپنکھی ۔ ہاں سچ ؟! ہم جھوٹ نہیں بولتے ۔ کبھی کبھی بولتے ہیں بہت کم ۔

سرفراز ۔ پھر تمہارا کیا فیصلہ ہے ؟

مورپنکھی ۔ ہم نے اپنا لیا ۔ ہتھیا لیا ۔ تم ہمارے قبضے میں ہو ۔ بولو منظور ۔

سرفراز ۔ تم جلد باز ہو بہت جلد باز ہو مورپنکھی ۔ تمہیں کیا معلوم میں کون ہوں ۔

مورپنکھی ۔ اچھے نیک دل شریف آدمی ہو ۔

سرفراز ۔ تم نے میرا دل کہاں دیکھا ہے ۔

مورپنکھی ۔ تمہارے ماتھے پر ۔ ہر ایک کا دل اس کے ماتھے پر صاف دکھائی دیتا ہے ۔

سرفراز ۔ تم میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتیں ۔

مورپنکھی ۔ اس کی ضرورت بھی نہیں میں نے انسانوں پر بھروسہ کرنا سیکھا ہے ۔

سرفراز ۔ تم میرے اوپر بھروسہ کرو گی ۔ میرے اوپر ؟!

مورپنکھی ۔ (ہنستی ہے) کیوں نہیں ۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے ۔ انسان انسان پر بھروسہ کرتا ہے ۔

سرفراز ۔ میرے پاس دولت نہیں ۔

مورپنکھی ۔ میرے پاس ہے ۔ نواب صاحب نے اپنی ساری جائداد میرے نام لکھ دی ہے ۔

سرفراز ۔ مورپنکھی !!

مور پنکھی - تمہیں کیا ہوا - تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو - تم آرام کرو میں تمہیں پنکھا جھلوں گی -
سرفراز - انسان تو دنیا کا سب سے بڑا اچوبہ ہے !
غفور - میں اندر آسکتا ہوں ؟
سرفراز - آؤ غفور - کہو کیا بات ہے -
غفور - دادا نے آپ کو بلایا ہے -
سرفراز - اباجان نے بلایا ہے مور پنکھی تم یہیں ٹھہرو - میں ابھی آتا ہوں -

چھٹا منظر

[اسمٰعیل کا خیمہ - سرِ شام]

اسمٰعیل - ہاں - میں نے تمہیں بلایا تھا -
سرفراز - جی -
اسمٰعیل - اس لڑکی کو کیوں قتل نہیں کیا گیا -
سرفراز - آپ نے کہا تھا عورت کا قتل جب تک ضروری نہ ہو نہ کیا جائے -
اسمٰعیل - مگر اس کی موت ضروری ہے -
سرفراز - کیوں ؟
اسمٰعیل - یہ بھید اس سے چھپنا مشکل ہے اور اگر ہمارا بھید اس پر ظاہر ہو گیا تب بھی اس کی جان لینی ہم پر فرض ہو جائیگی -
سرفراز - اس پر کوئی بھید ظاہر نہیں ہوگا ہم اسے قافلے کے ساتھ اس کے گھر پہنچا دیں گے -
اسمٰعیل - یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے - سرفراز ! - ایک بات بتاؤ -
سرفراز - جی !
اسمٰعیل - تمہیں اس کے بوینج[1] قرار دیئے جانے پر اعتراض ہے - تم اس کی موت روکنا چاہتے ہو -
سرفراز - میں ؟ ! میں نہیں جانتا -
اسمٰعیل - اگر سچ کہو صاف صاف جواب دو -
سرفراز - میں کچھ نہیں کہہ سکتا -
اسمٰعیل - عورت زہر کا پودا ہے - عورت ناگن کی پھنکار ہے -
سرفراز - مگر بھوانی ماتا خود بھی عورت کا سروپ ہے -

---

[1] بوینج وہ شخص ہوتا ہے جسے ٹھگی کے قانون کے مطابق واجب القتل قرار دیا گیا ہو -

اسمٰعیل - ویلیوں کی باتیں نہ کرو۔
سرفراز - ہوسکتا ہے مورنگھی بھی دیوی کا سروپ ہو۔
اسمٰعیل - تمہارا دماغ پھر گیا ہے ——— اس لڑکی کی موت ضروری ہے اور وہ بھی تمہارے ہاتھ سے۔
سرفراز - اباجان!!
اسمٰعیل - کیا ہوا؟ ڈرتے ہو؟
سرفراز - نہیں۔
اسمٰعیل - پھر کیا عورت کے حسن کا جادو تم پر چل گیا ہے؟
سرفراز - نہیں۔
اسمٰعیل - پھر ——— میں کہتا ہوں اس کی موت ضروری ہے اور اسے تمہارے ہاتھ سے مرنا ہے۔ مت بھولو کہ تم نے ٹھگی کے قانون پر عمل کرنے کا حلف اٹھایا ہے اور اس حلف سے پھرنے کی سزا موت ہے۔
سرفراز - میں سمجھتا ہوں اس کی موت ضروری نہیں۔
اسمٰعیل - بالکل ضروری ہے ——— موقعے کی تاک میں رہو۔ اسے بوبنج قرار دو۔ ضروری ہدایت دو۔ سارا انتظام کر لیا جائے۔
سرفراز - اباجان یہ ظلم ہے!
اسمٰعیل - یہ فرض ہے سرفراز!!
سرفراز - آپ نے کبھی کوئی میری بات نہیں ٹالی۔ آج میری ایک بات مان لیجئے۔
اسمٰعیل - کہو۔
سرفراز - مورنگھی کو اس وقت تک زندہ رہنے دیجئے جب تک اسے ہمارے بھید کی خبر نہ ہو جس وقت اسے ہمارا بھید معلوم ہو گیا میں قسم کھاتا ہوں میں خود اسے اپنے ہاتھ سے مار ڈالوں گا میں اسے بوبنج قرار دے دوں گا۔
اسمٰعیل - بیکار ہے ———
سرفراز - صرف ایک بار مجھے موقع دیجئے۔ آئندہ کبھی آپ کے حکم سے انکار نہ کروں گا۔
اسمٰعیل - ضد کرتے ہو ——— چلو آزما دیکھو ——— مگر جس لمحے اسے راز معلوم ہو گا اس وقت اسے بوبنج قرار دے کر جان سے مارنا ہوگا۔
سرفراز - مجھے منظور ہے۔

ساتواں منظر

[خیموں کے باہر کا میدان وہی وقت]

(غفور کا قہقہہ سنائی دیتا ہے)

غفور - (قہقہہ لگا کر) تین دن کی سرداری۔

بدری - غفور یا تم پھر اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگے۔
غفور - ایک - دو - تین ——— تین دن کی سرداری اور پھر اندھیری رات۔ میں بھوانی کی قسم کھا کر کہتا ہوں سرفراز کی نیت صاف نہیں - وہ ٹھگی کے قاعدوں سے ہٹ رہا ہے۔
بدری - کیا مطلب ؟!
غفور - اس لڑکی کے جال میں پھنس کر وہ ٹھگی کے قانون بھول رہا ہے۔ اسے لڑکی کے بھید معلوم ہونے کا خطرہ ہے اسے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے اس کی موت ضروری ہے اس کے پاس قیمتی زیور ہیں اچھی اچھی پوشاک ہے۔ پیسہ ہے۔ اس کی موت ضروری ہے۔
بدری - غفور تم سردار پر الزام لگا رہے ہو۔
غفور - میں قانون سے ہٹنے والوں کو سردار نہیں مانتا - اپنے سردار سے پوچھو لڑکی قتل کیوں نہیں کی گئی - صرف اس لیے کہ تمہارے سردار اس کے ساتھ گل چھرے اُڑا رہے ہیں عیش کر رہے ہیں - یہ ظلم ہے - ہم سب کے ساتھ بے انصافی ہے۔
بدری - اور سردار پر شک کرنا بے انصافی نہیں ؟
غفور - اگر وہ لڑکی قتل نہ کی گئی تو میں سرفراز کو سردار ماننے سے انکار کر دوں گا۔
بدری - چلو ——— مور پنکھی کا ناچ شروع ہونے والا ہے۔

(دُور سے رقص کی دُھن سُنائی دیتی ہے جو دھیرے دھیرے قریب آتی جاتی ہے)

غفور - مور پنکھی کا ناچ ——— نواب صاحب کی قبر پر (پھر اس قدر خوفناک طریقے پر قہقہہ لگاتا ہے) کل مور پنکھی کی قبر پر سرفراز کا ناچ بھی دیکھنا ہے۔

(رقص کی دُھن قریب آجاتی ہے دونوں خیمے کے اندر چلے جاتے ہیں)

آٹھواں منظر

[رات بھیگ چکی ہے - مور پنکھی کا خیمہ]

سرفراز - تمہیں اس خیمے میں کچھ تکلیف ہے ؟
مور پنکھی - نہیں - آج میرا ناچ کیسا تھا ؟
سرفراز - بہت اچھا تھا۔
مور پنکھی - کیسے مرے ہوئے دل سے تعریف کر رہے ہو۔

سرفراز - ہاں ہاں میں تم سے ایک بات کہنا بھول گیا۔

مورپنکھی - کیا ؟

سرفراز - نواب صاحب نے آدمی بھیجا ہے۔ ان کی طبیعت شکار میں خراب ہوگئی ہے وہ گوا ابھار چلے گئے ہیں وہاں سے گھر چلے جائیں گے۔ میری رائے میں تمھارے لیے بھی گھر جانا مناسب ہوگا۔

مورپنکھی - اور تم ——— ؟!

سرفراز - مجھے ابھی سوداگروں کی ٹولی کے ساتھ احمد آباد جانا ہے۔ مگر میں تمھیں واپس تمھارے گھر پہنچوانے کا انتظام کر دوں گا۔

مورپنکھی - میرے گھر ؟!

سرفراز - ہاں تمھارے گھر۔

مورپنکھی - مجھے ایک بات بتاؤ گے ؟

سرفراز - ضرور۔

مورپنکھی - مگر تمھیں خدا کی قسم سچ سچ بتانا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ دغا نہ دینا۔ نہیں تو میں سچ مچ صدمے سے مر جاؤں گی۔

سرفراز - پوچھو۔

مورپنکھی - کیا تم مجھ سے دور رہنا چاہتے ہو کیا تم مجھے پسند نہیں کرتے کیا مجھے اپنے سے ہمیشہ کے لیے دور کر دینا چاہتے ہو ؟

سرفراز - مورپنکھی۔

مورپنکھی - بتاؤ ——— خدارا بتاؤ۔

سرفراز - یہ سب کیوں پوچھتی ہو ؟

مورپنکھی - یہ اس لیے پوچھتی ہوں کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں تمھیں چاہتی ہوں تمھارے اوپر اپنا مال، اپنی جان، اپنی عزت، اپنی راحت، سب کچھ نچھاور کر سکتی ہوں۔ میرے لیے تمھاری چاہت انمول ہے۔

سرفراز - مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھو۔

مورپنکھی - جواب دینا نہیں چاہتے ؟

سرفراز - تم آخر مجھے اتنا اچھا کیوں سمجھتی ہو۔ تم کیوں بن مانگے میرے لیے سب کچھ نچھاور کر رہی ہو۔ میں تمھاری محبت کے قابل نہیں ہوں۔ میں تمھاری پوجا کے لائق نہیں ہوں۔ مورپنکھی۔ تم بہت اچھی ہو۔ تم دیوی ہو مگر میں دیوی کے سنگھاسن پر اپنی ناپاک پرچھائیں کیسے پڑنے دوں ——— مجھے معاف کر دو دیوی مجھے معاف کر دو۔

مورپنکھی - (ہنستی ہے) تم میری ہنسی اڑاتے ہو سرفراز مرزا (دوبارہ ہنستی ہے) بڑے بے رحم ہو تم میں تمھاری طرح ہوشیار نہیں ہوں۔ میں کچھ نہیں سمجھتی کچھ بھی نہیں جانتی۔ بس تم سے ایک دلاسا چاہتی ہوں۔

سرفراز۔ میں تمھیں کیسے دلاسا دے سکتا ہوں مورپنکھی ؟!

مورپنکھی ۔ میں تم سے صرف ایک فیصلہ چاہتی ہوں۔ اگر مجھے اپنے سے دور رکھ کر تمھارا دل خوش ہوتا ہے تو مجھے جہاں چاہو بھیج دو میرے گھر بھجوا دو گوالیار بھیج دو کہیں بھیج دو میں چلی جاؤں گی مگر تمھارے بغیر خوش نہ رہ سکوں گی مجھے زندہ دیوار میں چن دو میں زبان سے اُف نہ کروں گی اور اگر تم مجھے پسند کرتے ہو مجھے چاہتے ہو تو مجھے کنیز کی طرح اپنے پیروں میں پڑا رہنے دو۔ ہم ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے ہمارے بچے اس کے آنگن میں کھیل کود کر جوان ہوں گے میرے لیے یہی خوشی سب سے بڑی خوشی ہے ——— میں تمھارے فیصلے کا انتظار کروں گی۔

سرفراز ۔ یہ سب نہ کہو۔ کچھ نہ کہو۔ مورپنکھی۔ میرے پاس الفاظ نہیں۔ جن سے جواب دیا جاتا ہے میرے پاس زبان نہیں ہے جس سے بات کہی جاتی ہے خاموش کھڑی رہو۔ آج میں تمھیں جی بھر کر دیکھ لوں جب تک جتنی دیر میرا جی چاہے تمھیں دیکھتا رہوں ——— دیکھتا رہوں۔

مورپنکھی ۔ (ہنستی ہے) تم بہت عجیب ہو۔ میرا بس چلتا تو خدا سے تمھیں سمجھنے کے لیے ساری دُنیا کی عقل مانگ لیتی۔

سرفراز ۔ کاش تم پتھر کی دیوی ہوتیں تو تمھیں سنگھاسن پہ بٹھا کر تمھاری پوجا کرتا۔ تم نے انسان کا روپ کیوں لے لیا مورپنکھی۔ تم عورت کیوں بن گئیں دیوی ؟! یہ تم نے کیا کیا ؟!

مورپنکھی ۔ کیسی آدھی اُلٹی باتیں کر رہے ہو ؟

سرفراز ۔ میری بات مانو۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں تم یہاں سے چلی جاؤ۔ سمجھ لو کہ سرفراز سے کبھی تمھاری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بھول جاؤ کہ تالاب کے کنارے تمھیں کوئی ملا تھا۔

مورپنکھی ۔ میں تمھاری سب باتیں مانوں گی۔ میری محبت بھو کی شیرنی نہیں سرفراز۔ میری محبت تیاگ ہے۔ وہ تمھارے اوپر سب کچھ نچھاور کرنا چاہتی ہے۔ تم سے کچھ لینا نہیں چاہتی مگر مجھ سے ایسی درخواست نہ کرو جو میرے قابو میں نہ ہو۔ میں نے کہا تھا میرا دل بڑا چنچل ہے۔

سرفراز ۔ دل وہ چیز ہے جس پہ قابو پایا جاتا ہے۔

مورپنکھی ۔ مجھے نصیحت نہ کرو سرفراز۔ میرے بس کی بات نہیں۔

سرفراز ۔ پرسوں ایک قافلہ شمالی ہندوستان کے لیے روانہ ہوگا میں تمھیں اس کے ساتھ بھیج دونگا۔ اچھا خدا حافظ۔

مورپنکھی ۔ جانے سے پہلے ضرور ملنا۔ نہیں تو میں کبھی تمھیں معاف نہ کرونگی۔ نہیں تو میں زندگی بھر تمھارے لیے ترستی رہونگی۔

نواں منظر

[سرفراز مرزا کا خیمہ ۔ رات کا پچھلا پہر]

سرفراز ۔ بدری

بدری ۔ میرے سردار۔

سرفراز۔ تم میرے دوست ہو۔ میری مدد کرو۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟ ؟
بدری ۔ مجھے سب معلوم ہے سردار ۔
سرفراز ۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں ؟
بدری ۔ آپ نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک ہے مگر سردار ہر طرف سازشیں ہو رہی ہیں۔ غفور کے تیور ٹھیک نہیں ہیں ۔
سرفراز ۔ تم میری مدد کرو گے ؟!
بدری ۔ دل و جان سے !
سرفراز ۔ تو سنو ۔ آج سے پرسوں مورپنکھی کے روانہ ہونے تک اس کے خیمے کی نگرانی تمہارے سپرد ہے ۔ مورپنکھی کو ہمارے بھید معلوم نہ ہونے پائیں دن رات پہرہ دینا ۔
غفور ۔ میں تیار ہوں ۔
سرفراز ۔ اور پرسوں تم اپنے ساتھ مورپنکھی کو اس کے گھر پہنچا دینا ۔
غفور ۔ جو حکم ہو دل و جان سے بجا لاؤں گا ——— مگر غفور سے ہوشیار رہیئے گا سردار۔ اس کے ارادے خطرناک ہیں ۔
سرفراز ۔ مجھے معلوم ہے ۔ وہ سرداری کے خواب دیکھ رہا ہے ۔

دسواں منظر

[اسمٰعیل کا خیمہ ، رات کا وہی وقت]

غفور ۔ سب ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے ۔ کم سے کم دس بارہ ہزار کا مال ہے ۔ چار آدمی ہیں چاروں سوداگر ۔ مال لے کے دسہرہ کے بعد دکن کے لیے نکلے ہیں ۔
اسمٰعیل ۔ تمہارے اوپر پورا بھروسہ ہو گیا ہے ان لوگوں کو ۔
غفور ۔ اجی سولہ آنے بھروسہ ہے سردار ۔ آدھی رات کو کہیئے تو آدھی رات کو بلا لاؤں ۔ غفور نام ہے میرا ۔ سوٹھائی ہوں کوئی مذاق ہے اس میں عمر گذاری ہے حضور کے طفیل سے ۔
اسمٰعیل ۔ تو پھر کیا دیر ہے ؟
غفور ۔ حکم کی دیر ہے ۔ آپ حکم کیجیے ۔
اسمٰعیل ۔ میں حکم کرنے والا کون ۔ سرفراز تمہارا سردار ہے ۔ اس سے حکم لو اور کام شروع کرو ۔
غفور ۔ اب میں اپنی زبان سے کیا کہوں ۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ رنگ رلیوں میں کھوئے ہوئے ہیں ۔ ان دنوں اسے اپنا ہوش ہی کہاں ہے ؟!
اسمٰعیل ۔ بڑی خطرناک بات ہے ۔

غفور ۔ جی ہاں۔
اسمٰعیل ۔ میں نے کہا دونوں باتیں خطرناک ہیں سردار کا رنگ ریلیوں میں کھو بار ہنا اور تمہارا سردار پر الزام لگانا۔ دونوں خطرناک ہیں۔
سرفراز تمہارا سردار ہے۔ تمہیں اس کا حکم ماننا چاہیے۔
غفور ۔ میں اس کے حکم پر اپنی جان نچھاور کرنے کو تیار رہوں۔
اسمٰعیل ۔ لو۔ وہ خود ہی آگیا سرفراز غفور کیا کہہ رہا ہے۔
سرفراز ۔ کیا ہے غفور۔
غفور ۔ کل چار سوداگر ادھر سے گذر رہے ہیں حکم ہو تو چاروں کو لے آؤں۔ بڑا مال اسباب ساتھ ہے میں نے اُستاد سے ذکر کیا تھا
اسمٰعیل ۔ میں نے کہا۔ سرفراز سے پوچھو۔
سرفراز ۔ ضرور لاؤ۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ رات کے کھانے پر ان سب کا تصفیہ ہو جائے گا۔
غفور ۔ بہتر۔
سرفراز ۔ تو کل رات کو ———
غفور ۔ ہاں کل رات کو۔

گیارھواں منظر

[اسمٰعیل کا خیمہ۔ دوسری رات کے اندھیرے جھٹکے ہیں]

پہلا سوداگر ۔ چلو اچھا ہی ہے۔ تمہارا ساتھ ہو گیا۔ نہیں تو یہ راستے سنے ہوں بڑے کٹھن (خطرناک) ہیں۔ چلو جی کس شبھ گھڑی سے کس بھاگیہ وان کا منہ دیکھ کر چلے تھے کہ تم لوگ مل گئے نہیں تو سوداگروں کا سفر تم جانو بڑا جان جوکھم کا ہوتا ہے۔
غفور ۔ سیٹھ جی۔ یہ تو ہمارا سو بھاگیہ ہے کہ ہمارے ہاں آپ پدھارے۔
دوسرا سوداگر ۔ وہ تو پرانی مثل ہے ——— جواہر کی قدر یا جوہری جانے یا بادشاہ۔
غفور ۔ آپ نے بھی حضور کمال کیا۔ جوہری بیچ ضرور ہیں مگر بادشاہی سے بھلا کیا نسبت ہم لوگوں کو! آپ لوگ اچھے سوداگر ہیں آپ کی بات ہی کچھ اور ہے۔
پہلا سوداگر ۔ اجی ایسی بات کیوں سوچتے ہو۔ سوداگر بچہ سوداگر بچہ سب برابر۔ میں تو شگون کو بہت ہی سمجھوں ہوں۔
غفور ۔ اس میں کیا شک ہے۔
پہلا سوداگر ۔ اپنے منیم جی ہیں پنڈت رام لکھن۔ بھگوان سوگند جب بھی ان کا منہ دیکھ لیا کاروبار مندا ہی رہا کوئی نہ کوئی نکسان (نقصان) کچھ نہ کچھ لگا تھا۔ اور اپنا ایک رسوئیا ہے۔ نام تو اس کا ہے کلوا مگر جب صبح سویرے منہ دیکھ لوں ہوں اس کا تو چاندی برسے ہے چاندی!

غفور ۔ آئیے بڑا جمان ہو جئے ۔ یہ ہمارے اُستاد ہیں اُستاد اسمٰعیل ۔ یہ ہیں بڑے بازار کے جوہری سرفراز مرنا ۔ رگھو بیر لالہ
چپت رائے کے بہت بڑے بیوپاری ہیں ۔

پہلا سوداگر ۔ اہو ہو ہو ۔ یہاں تو مانو ساری اپنی برادری ہے ۔

اسمٰعیل ۔ سارے اپنی گاڑی کیسے بیٹھ جی ۔

پہلا سوداگر ۔ بڑی سجاوٹ بناوٹ کر کے رکھے ہو اُستاد اس جنگل میں کوئی خطرہ و نترہ نہیں ۔

اسمٰعیل ۔ ابی تو یہ کہیے خطرے کا یہاں کیا کام ۔

سرفراز ۔ جی ہاں اس لیے تو ہم لوگ اتنا بہت انتظام کر کے نکلتے ہیں ۔

غفور ۔ سیٹھ جی ۔ اپنے پاس چار چھ بندوقیں تین چار تلواریں تو ہر وقت جی تو تیار رہتی ہیں ۔

پہلا سوداگر ۔ یہ تو اچھی بات ہے ۔ ہم لوگ جی اب سے بےپھکر (فکر) ہو گئے ۔

دوسرا سوداگر ۔ سفر اچھا کٹے گا اور چور ڈاکوؤں سے بھی حفاظت کا انتظام ہو جائے گا ۔

غفور ۔ ابی سیٹھ جی ! چور ڈاکو تو ہماری طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتے ۔ دیکھیں تو بھگوان سوگند، آنکھیں نکال لیں ۔

پہلا سوداگر ۔ (عجب طرح ہنستے ہوئے) اچھا جی تب تو بہت ہی اچھا ہے ۔

اسمٰعیل ۔ غفور ۔

غفور ۔ جی اُستاد ۔

اسمٰعیل ۔ تم بھی ہو بڑے کاروباری آدمی ۔ چار شریف سوداگر بچے تمہارے مہمان ہیں اور تم نے خاطر تواضع ہی نہیں کی ۔ کھانا نکلواؤ ۔

پہلا سوداگر ۔ نہیں جی ۔ کرپا ہے آپ کی ۔ بھوجن سے تو نشچنت ہو کے آئے ہیں اب تو سارے راستے ساتھ رہے گا ۔ کیا جلدی ہے
ایسی باتوں کی ۔

اسمٰعیل ۔ پھر بھی کچھ حقہ پانی، کچھ جل پان ۔

پہلا سوداگر ۔ نہیں جی یہی کرپا بہت ہے آپ سب کی کہ ہمیں ساتھ لے لیا نہیں تو بھگوان سوگند آج کا زمانہ تو کلجگ ہے کل جگ ۔
کون کس کی بھلائی سوچے ہے ۔ سب اپنی اپنی پوری کچوری میں لگے ہیں ۔ بھگوان بچائے خون سفید ہو گیا ہے خون ۔

اسمٰعیل ۔ آپ نے ٹھیک کہا ۔

غفور ۔ اُستاد یہ کس جانور کی آواز ہے (مور کی آواز سنائی دیتی ہے)

اسمٰعیل ۔ مور کی آواز ہے ۔

پہلا سوداگر ۔ بڑا اچھا شگون ہے مور کی آواز کان میں آجائے تو مانو دھن برسنے لگے ہے اس دن تو میں پھولوں نہیں سماؤں ہوں ۔

سرفراز ۔ شگون اچھا ہے ۔

دوسرا سوداگر ۔ اس شگون پر تو سیٹھ جی نے بڑے بڑے کام کیے ہیں ۔

پہلا سوداگر ۔ (ہنستا ہے) ابی کچھ مت پوچھو ۔ ایک دن کا قصہ کیا ہوا کہ دوکان پر بیٹھا تھا لالہ مٹھن لال آئے تھے ان کی لڑکی کا

بیاہ تھا میں نے شگون دیکھا تو گڑبڑ۔ میں نے سوچا یہ تو برا ہوا اللہ دشمن لال کو بچایا تو ان کی سمجھ میں نہ آوے۔ آخر ٹھیک بیاہ کے سمے جوان کی ہتری کو چھینکیں آئی تھیں درج ہوتی ہیں تو دو ۔ مندپ کی آگ ماتیے چھینکوں سے بجھ گئی۔

اسمٰعیل ۔ رہنستا ہے) بہت خوب۔

غفور ۔ یہ تو بڑے تجربے کی بات ہے بسیٹھ جی۔ شگون لینا بھی اب آج کل کتنوں کو آتا ہے۔

اسمٰعیل ۔ سیٹھ جی۔ آپ تو واقعی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ ارے کوئی ہے ——— پان تمباکو لاؤ۔

(سیٹھ جی اور ان کے ساتھیوں کے گلے گھونٹ دیئے جاتے
ہیں وہ سب بے دم ہو کر گر پڑتے ہیں ان کی لاشیں
لے جائی جاتی ہیں)

سرفراز ۔ سب ٹھکانے لگا دیئے گئے کم بخت۔

اسمٰعیل ۔ شاباش۔ ساتھیو شاباش!

سرفراز ۔ قبریں تیار ہیں؟!

مورپنکھی ۔ (چیختی ہوتی داخل ہوتی ہے) یہ تم نے کیا کیا ظالمو تم قاتل ہو تم مجرم ہو تم انسانی خون کے پیاسے ہو آہ خدایا تو نے مجھے کن بھیڑیوں میں بھیج دیا ہے تم ٹھگ ہو۔ میں چلا چلا کر کہوں گی تم ٹھگ ہو۔ تم نے تو اب کو بھی اس طرح مار ڈالا ہوگا۔ کہو یہ جھوٹ ہے بتاؤ یہ جھوٹ ہے؟

سرفراز ۔ (چیخ کر) ہمدری!

غفور ۔ سردار۔

سرفراز ۔ اسے خیمے سے باہر لے جاؤ۔ یہ یہاں کیسے آگئی؟

مورپنکھی ۔ مجھے کسی نے آواز دی تھی جاؤ خیمے میں خون ہو رہا ہے۔ میں طنابیں کاٹ کر بھاگی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھ سے خون ہوتے دیکھا ہے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔

سرفراز ۔ غفور اسے خیمے میں لے جاؤ۔

مورپنکھی ۔ (جسے گھسیٹ کر باہر لے جایا جا رہا ہے) مجھے مت گھسیٹو۔ مجھے سرفراز سے بات کر لینے دو ظالمو، خونی قاتلو میری بات سن لو۔

اسمٰعیل ۔ میرے بیٹے تجربہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟!

سرفراز ۔ ہاں ابا جان۔

(پس منظر میں غفور کے خوفناک قہقہہ کی آواز بلند ہوتی ہے)

سرفراز ۔ یہ کون ہنس رہا ہے یہ کون مجھ پر قہقہے لگا رہا ہے خاموش ہو جاؤ (چیخ کر) سب خاموش ہو جاؤ۔

اسمٰعیل - میرے بیٹے ہمت سے کام لو۔ سدو مال سنبھالو۔ میں نے لگائی سے کہہ دیا ہے قبر تیار رہے گی۔

بارھواں منظر

[خیمے کے باہر۔ وہی وقت]

غفور - بدری ——— آج کس مزے کی ٹھنڈک ہے۔ موسم بہار دکھا رہا ہے۔

بدری - کوئی خاص بہار تو نہیں۔

غفور - جاڑوں میں صرف بہار ہے۔ ٹھنڈک دور کرنے کی دو ترکیبیں ہیں۔ انسانی جسم کی گرمی یا انسان کی جان لینے کی خوشی — بھگوان سوگند جب میں موت کا سامان کرتا ہوں تو مجھے ٹھنڈ نہیں لگتی۔

بدری - آج کس کی موت کا سامان ہے۔

غفور - مورپنکھی۔ تمہارے دوست کی محبوبہ ——— کوئی غفور خان کے چنگل سے بچ کر نہیں جا سکتا۔

بدری - تم نے بڑا ظلم کیا ہے۔

غفور - میں معافی نہیں چاہا کرتا۔ میں کبھی معاف نہیں کرتا۔ میں نے بدلہ لیا ہے۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔

بدری - اب کیا ہوگا ؟

غفور - سرفراز کو اپنے ہاتھوں سے مورپنکھی کا خون کرنا ہوگا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ مورپنکھی کا خون سرفراز کے ہاتھوں۔ ان ہاتھوں کو ہاتھ میں لے کر اس نے وفا کی قسم کھائی تھی۔ جن ہاتھوں کو اس نے پیار سے اپنی آنکھوں سے لگایا تھا انہی ہاتھوں سے (قہقہہ لگاتا ہے) تم جانتے ہو کس نے اسے پکارا تھا۔ کون مورپنکھی کو وہاں بلا کر لایا تھا۔ سوچو بدری سوچو۔ ابھی سوچنے کو بہت کچھ باقی ہے (ایک اور قہقہہ لگاتا ہے)

تیرھواں منظر

[مورپنکھی کا خیمہ۔ مورپنکھی فرش پر پڑی سسک رہی ہے]

سرفراز - مورپنکھی !

مورپنکھی - تم ہو ؟ !

سرفراز - ہاں ——— میں ہوں۔ تم نے میرا اصلی روپ دیکھ لیا۔

مورپنکھی - ہاں۔

سرفراز - تم نے دیکھ لیا ہم سب ٹھگ ہیں۔ ہم انسانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہم انہیں لوٹتے ہیں۔

مورپنکھی - ہاں۔ مجھے معلوم ہو گیا۔

سرفراز - میں اسی لیے کہتا تھا میرا اصلی روپ دیکھو گی تو تم میرے منہ پہ تھوک کر چلی جاؤ گی۔ مجھ سے نفرت کرنے لگو گی مجھ سے

ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لو گی۔

مورپنکھی۔ تم ٹھگ ہو۔

سرفراز۔ ہاں۔ ٹھگی میرا پیشہ ہے۔

مورپنکھی۔ تو مجھے ٹھگ لو۔ میری گردن سے یہ زیور، ہاتھوں کے سونے کے کڑے، یہ پازیب، یہ گلے کا جڑاؤ ہار، یہ سب اتار لو۔ میں خوشی سے تمہیں دیتی ہوں۔ لو اسے لے جاؤ۔

سرفراز۔ ہم خیرات نہیں لیا کرتے۔

مورپنکھی۔ جاؤ اپنے ساتھیوں سے کہو کہ نواب نے ساری جائیداد میرے نام لکھی ہے۔ ان کے سارے روپیہ کی وارث میں ہوں۔ میں یہ سارا روپیہ سرفراز کو دیتی ہوں میں یہ سارا روپیہ تم سب میں بانٹنے کو تیار ہوں۔

سرفراز۔ کیا کہہ رہی ہو مورپنکھی ؟

مورپنکھی۔ میں آج بھی تمہیں چاہتی ہوں سرفراز۔

سرفراز۔ مورپنکھی !!!!

مورپنکھی۔ ہاں میرے ٹھگ! میرے لٹیرے دوست!! میں نے تجھے چاہا ہے۔ میں نے کہا تھا نا میں نے انسانوں پر بھروسہ کرنا سیکھا ہے، محبت زہر نہیں ہے امرت ہے اور اگر میرے پاس امرت ہے تو تمہارے اندر کی سچائی ضرور ابھرے گی تم اتنے پیارے ہو اتنے خوب صورت ہو، تم قاتل اور خونی نہیں رہ سکتے۔ میرا پیار تمہیں جیت لے گا میری محبت تمہیں پاک کر دے گی۔ مجھے بھروسہ ہے مجھے انسان سے پیار ہے۔

سرفراز۔ قاتلوں میں انسانیت ڈھونڈتی ہو ؟!

مورپنکھی۔ ہاں —— میرا خیال غلط ہے ؟!

سرفراز۔ بالکل غلط۔

مورپنکھی۔ تو پھر میرا آخری تیاگ قبول کر لو۔ اپنے ہاتھ سے یہ جڑاؤ ہار اتار لو اور میری گردن میں اپنا خونی رومال ڈال دو۔ اس کی گرہ باندھو۔ یہ "تماکو لاؤ" کی آواز دو۔ میں تمہاری آغوش میں ہنستے ہنستے جان دے دوں گی —— لاؤ تمہارا رومال کہاں ہے ؟

سرفراز۔ مورپنکھی !!

مورپنکھی۔ مورپنکھی نے جان کی بازی لگائی تھی۔ وہ اسے ہنستے ہنستے ہار بھی سکتی ہے۔ تم جیت جاؤ گے میرے لیے یہی خوشی کیا کم ہے !!

سرفراز۔ مجھ سے آج تک کسی نے ایسی باتیں نہیں کیں تم عجیب ہو۔

مورپنکھی۔ ہاں میں عجیب ہوں۔ کیونکہ مجھے تمہارے اوپر بھروسہ ہے کہ جب تم میری لاش کو قبر میں لٹکانے لگو گے تو تمہارے اندر کا چھپا ہوا انسان جاگے گا اور تمہارا گریبان پکڑے گا وہ تم سے پوچھے گا تم انسانوں کو کیوں مارتے ہو

ان انسانوں کا کیوں خون کرتے ہو جو تمہیں پیارے ہیں جو تمہیں پیار کرتے ہیں جو زندگی کی ایک چھوٹی سی خوشی کے لیے اپنی جان تک نچھاور کرتے ہیں۔ میں تمہارے خوابوں کی ملکہ بنوں گی تمہارے خیالوں پر میرا راج ہوگا میں تمہیں جیت لوں گی میں تمہیں ہمیشہ کے لیے جیت لوں گی — میں تم سے موت مانگتی ہوں میرے شہزادے — لاؤ مجھے موت دے دو۔

سرفراز ۔ لاؤ میں تمہارا لباس اتارتا ہوں۔

مورپنکھی ۔ (سر جھکا دیتی ہے) اتار لو۔

سرفراز ۔ (گردن کو پکڑ کر) اس خوبصورت گردن میں ایک لمحے بعد میرا رومال ڈال دیا جائے گا اور یہ نازنین کامنی ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جائے گی — میرے ہاتھوں! میرے ہاتھوں!! (چیختا ہے) نہیں! نہیں!! نہیں!!! میں نہیں مار سکتا۔ میں اسے نہیں مار سکتا — میں اسے نہیں مار سکتا۔!

(خیمے سے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر باہر نکلنا چاہتا ہے کہ اسمٰعیل
داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے پیچھے غفور بھی ہے)

اسمٰعیل ۔ سرفراز — خیمے سے باہر کیوں نکلتے ہو؟!

سرفراز ۔ اباجان میں اسے نہیں مار سکتا۔ میں کسی انسان کو نہیں مار سکتا۔ یہ بھلے برے سب میرے ہیں سب مجھ جیسے ہیں میں ٹھگ نہیں ہوں۔ میں ٹھگ بننا نہیں چاہتا مجھے انسان بننے دو۔ خدا کے لیے مجھے انسان بننے دو۔

اسمٰعیل ۔ میرے بیٹے کیا کہہ رہے ہو؟! میرے بیٹے ؟!

غفور ۔ سردار تم نے حلف اٹھایا ہے تم نے بھوانی ماتا کی سوگند کھائی ہے اس کے غضب سے ڈرو۔

اسمٰعیل ۔ تم نے قسم کھائی تھی۔

سرفراز ۔ میں آج ساری قسمیں توڑتا ہوں یہ سب جھوٹی قسمیں ہیں میں آج سے باغی ہوں۔ میں آج سے سارے قول و قرار سے پھرتا ہوں۔ مجھے جانے دو! مجھے چھوڑ دو!!

غفور ۔ سردار تم بھول رہے ہو اس کی سزا موت ہے۔

سرفراز ۔ اگر زندگی کی چاہت کی سزا موت ہے تو یہ مجھے قبول ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں میں انسانوں کو نفرت کی جگہ پیار دینا چاہتا ہوں اتنا پیار اتنی محبت اتنی ہمدردی کہ یہ دنیا پیار اور خوشی سے بھر جائے۔

اسمٰعیل ۔ اس کا دماغ پھر گیا ہے!

مورپنکھی ۔ ایسا نہ کہو آج شاید زندگی میں پہلی بار یہ ہوش میں آئے ہیں!

اسمٰعیل ۔ خاموش! لڑکی۔ ارے کوئی ہے — تماکو لاؤ

(سرفراز کا گلا گھونٹا جاتا ہے)

مورپنکھی ۔ مار ڈالا! بزدلو! تم زندگی بھر اسی رحم کا گلا گھونٹتے رہے، ایک بار، صرف ایک بار اس کے اندر کا انسان جاگا۔ تم نے اس کا بھی گلا گھونٹ دیا۔ مجھے بھی مار ڈالو۔ میرا بھی گلا گھونٹ دو۔ میں چلاؤں گی۔ فریاد کروں گی۔ میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لوں گی۔

اسمٰعیل ۔ اس لڑکی کو بھی —"

[ڈراپ سین]

کاغذی پیرہن

غلام الثقلین نقوی

آدھی رات کو اُسی مدھر سی سُر نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو اُس کی آنکھ کھل گئی۔

یہ ایک بے نام سا سندیسہ تھا جو متواتر تین راتوں سے ایک پھوار بن کر اُس کے تن بدن پر بکھر جایا کرتا تھا۔ اِس میں من کے دُکھ کا میٹھا سا کیف بھی ہوتا۔ اُس نے اپنے سرہانے کی کھڑکی کھولی تو ایک یخ بستہ بھیگا ہوا جھونکا آیا۔ اُسے کپکپی سی لگ گئی۔ باہر گھور اندھیرا تھا۔

"کھڑکی بند کر دو زرینہ!" شاہدہ نے کہا "بہت سخت سردی ہے۔"

زرینہ نے کھڑکی بند کر دی تو شاہدہ نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "تم آدھی رات کو کھڑکی کیوں کھولتی ہو زرینہ؟"

"یونہیں..... شاید..... کمرے کی بند ہوا میں آدھی رات کو گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔"

"دیکھو زرینہ! مجھے ٹالو مت۔ میں جانتی ہوں تم کھلی کھڑکی میں سے پنچھی بن کر نہیں اُڑ سکتی پھر بھی تم جو کھڑکی کھولتی ہو تو اس میں کچھ راز ضرور ہے۔"

"نہیں" زرینہ نے سوئی سوئی آواز میں کہا۔

شاہدہ نے اپنے سرہانے تپائی پر پڑا ہوا لیمپ جلا دیا۔ کمرے میں روشنی پھیلی تو گھور اندھیرے کا سپنا ٹوٹ گیا۔ زرینہ نے آنکھیں جھپک جھپک کر روشنی کو اپنے من میں رچانا چاہا۔ آنکھوں میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی اور من کا میٹھا سا دُکھ جاتا رہا تو زرینہ نے سپاٹ سی آواز میں کہا "شاہدہ! میں آدھی رات کو ایک سپنا دیکھتی ہوں۔"

"کون سا سپنا؟" شاہدہ کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور اشتیاق بھی۔

"میرے کانوں میں ایک میٹھی سی سُر گونجتی ہے جیسے آسمان سے اُتری ہو۔"

"تم تو سدا کی پگلی ہو۔" شاہدہ نے ہنس کر کہا "سنہرے خواب دیکھنے والی شہزادی۔ چل سو جا۔"

زرینہ سوئی تو گھوڑے بیچ کر سوئی۔ صبح جب وہ آنکھیں ملتی ملتی اُٹھی تو سپنوں والا دریچہ کھلا ہوا تھا اور باہر باغ میں آم اور جامن کے درختوں پر رنگا رنگ کے پرندے گا رہے تھے اور اُن کی پھننگوں پر سردیوں کی سنہری دھوپ کانپ رہی تھی۔ وہ گرم چادر

اوڑھ کر آنگن میں آئی تو شاہدہ نے پیار کرکہا۔ "زرینہ! اِدھر تو آ"

"کیوں کیا بات ہے شاہدہ ؟"

"کچھ بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں تنہائی سی محسوس کر رہی تھی۔"

"آج گھر خالی خالی ہے !"

"چچا ابھی ابھی چائے پی کر نکل گئے ہیں۔ انھیں تحصیل میں کچھ کام ہے اور چچی منہ اندھیرے کنویں پر چلی گئیں۔ اُدھر طوطے دہی کا اتنا بڑا پیالہ پی کر ڈکار بھی نہ لی اور گھر سے نکل گئیں۔" شاہدہ نے کہا اور زرینہ کے بھرے بھرے ہونٹوں کے ایک خم میں مسکراہٹ کی اُدھ کھلی کلی شرما کر رہ گئی۔ شاہدہ باورچی خانے میں آگ کے سامنے چوکی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سردیوں کی آگ میں بھڑک نہ تھی نہ شعلوں کی تڑپ۔ آگ کا عکس شاہدہ کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور آنکھوں میں ننھے منے شعلے لہرا رہے تھے۔ اس کے باوجود شاہدہ تنعمہ جلاالؤ نہیں لیکن سردیوں کی اس پرسکون آگ کا دیپک راگ ضرور الگ رہی تھی اور زرینہ نرم نرم دھوپ میں ننگے سر یوں کھڑی تھی جیسے سورج دیوتا کے مندر کی دیوداسی ہو۔ گھنے سیاہ بال کمر تک پہنچ رہے تھے اور ہلکے نیلے رنگ کی گرم چادر پر بکھر گئے تھے اور اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا جس سے کچے خوابوں کے نغمے چھلک رہے تھے۔

"شاہدہ!" زرینہ نے دھیمی آواز میں کہا "تم نے اس چڑیا کا گانا سنا جو منہ اندھیرے بیری کے ٹنڈ منڈ درخت پر بیٹھ کر گاتی ہے۔"

"ہاں!"

"کل مجھے بھی جلد جگا لینا۔ میں اس چڑیا کا راگ سننا چاہتی ہوں۔ کتنے دکھ بھرے انداز میں گاتی ہے اور شاہدہ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے پائیں باغ کے کسی دور کے درخت سے اس کی راگنی کا جواب بھی آتا ہو۔"

"شاید!" شاہدہ نے اس کے رومان پرور جذبات کا ساتھ نہ دیا "میں تو گاؤں سے تنگ آ چکی ہوں۔"

"اتنی جلد ابھی تو کامل بھیا بھی نہیں آئے۔"

"کامل نہ جانے کب آئیں!" شاہدہ نے شرما کر کہا اور اپنی شرماہٹ کو شعلوں کے دھیمے سے عکس میں چھپانے کی کوشش کی۔

"آئیں گے ضرور۔ کیوں نہ آئیں گے بھلا! میری سرکار کچے دھاگے سے بندھ کر آئے گی۔ شاہدہ رانی ان کے شہر کی ساری رونقیں چھوڑ کر اس اُجاڑ سے گاؤں میں آ بسیں اور کامل بھیا ہیں کہ دور پہاڑوں پر برف کے نظارے کر رہے ہیں۔ انھیں برفیلی تنہائیوں میں کیا خاک لطف آتا ہو گا۔" زرینہ کے لہجے میں چہک تھی اور شاہدہ کی آنکھوں میں شفق کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔

"زرینہ! تم آدھی رات کو کون سا سپنا دیکھتی ہو؟"

"میں ۔ ۔ ۔ ۔" زرینہ چونک گئی "میں نے رات ہی جو بتا دیا تھا۔"

"تم نے صرف اتنا کہا تھا کہ تم ایک میٹھی سی شہر سنتی ہو۔"

"ہاں! ایسا لگتا ہے جیسے یہ سُر میری روح میں رچ جانے کے لیے تتلی کی طرح پھڑپھڑاتی ہو۔"

"بس اتنا سا سپنا ۔ ۔ ۔ ۔ تم کھڑکی کیوں کھولتی ہو؟"

"میں ڈرتی ہوں یہ راگنی بند کھڑکی کے ساتھ سر پھوڑ کر نہ مر جائے۔"

"گاؤں میں آکر ایسے سپنے دیکھنے کی کیا وجہ ؟ تم نے کچھ غور کیا زرینہ ؟"

"نہیں۔" زرینہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں نے غور نہیں کیا اور میں سوچنا بھی نہیں چاہتی شاہدہ۔ میں تو چاہتی ہوں یہ دُور دیس سے آنے والی سُر میری رُوح میں رچ جائے تو میں نیلے آکاش سے جا چھوؤں۔"

"میں تیری طرح سنہرے خواب دیکھتی ہوں نہ مجھے شاعری آتی ہے زرینہ پر میں نے سنا ہے پنجاب ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کا دیس ہے۔ اس دیس میں رانجھے اور مہینوال بانسری بجاتے بجاتے آتے ہیں اور ہیریں اور سوہنیاں راگنی کی لے پر رقص کرتی ہوئی اُن کا استقبال کرتی ہیں۔"

"شاہدہ باجی! اگر کامل بھائی دو چار دن اور پہاڑوں پر رہ جائیں تو پنجاب کی شاعری کو کامل شاہدہ نامی ایک اور قصہ ہاتھ آجائے۔" زرینہ کی شوخی نے اپنا انتقام لے لیا۔

"یہ آدھی رات کو جو سُر تیری رُوح میں رَس بس جانے کے لیے پر تول رہی ہو کہیں اسی بانسری کا نغمہ نہ ہو۔" شاہدہ کی آنکھیں شرارت سے مسکرائیں۔ اور زرینہ کھل کھلا کر ہنس پڑی جیسے ساون کی ایک گھٹا پھٹ پڑی ہو۔ پھر گھٹا برس کر اچانک کھل گئی تو فضا میں کامل سکون طاری ہو گیا۔ زرینہ باورچی خانے کے اندر آئی اور شاہدہ کے پہلو سے پہلو ملا کر چوکی پہ بیٹھ گئی۔ شوں شوں چائے کا پانی اُبلنے لگا اور دونوں خواب کے ایک عالم میں کھو گئیں۔

چھوٹے سے سٹیشن کا پلیٹ فارم خالی تھا۔ دونوں بہنیں اپنا اپنا اٹیچی کیس لے کر اُتری ہی تھیں تو گاڑی پھک پھک کرتی چل دی۔ یکایک چچا جمال لپک کر کہیں سے آ گئے۔ "لڑکیو! تم آ گئیں؟" دونوں بہنیں مسکرائیں۔ چچا نے باری باری دونوں کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور انھیں ساتھ لے کر سٹیشن سے باہر آ گئے۔ اُنھیں تانگے پر بٹھا کر چچا نے راسیں ہاتھ میں لیں اور کچی سڑک کا سفر شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر درخت تھے اور گندم کی نوخیز کونپلیں دُور دُور تک سبزۂ نورستہ کی چادر بن کر پھیلی تھیں۔ تانگہ اُچھلتا کودتا نالے تک پہنچ گیا۔ نالے پر پُل نہیں تھا اور نالے کے اندر پایاب پانی تھا۔ جب تانگہ نالے کے اندر پہنچا تو کیچڑ میں پھنس کر رہ گیا۔ چچا نے کہا "بھئی! بڑی مصیبت ہوئی۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آ رہا۔"

چچا نے غصے سے گھوڑے کو دو تین چابک بھی لگائے۔ گھوڑے نے زور مارا لیکن تانگہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ سامنے کے کنارے پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا اور ہری ہری دوب کا ہموار فرش اور اس جھنڈ سے بانسری کا ایک نغمہ پھوار کی طرح گرا تو چچا جمال نے پکار کر کہا "اوئے احمد! اِدھر تو آ۔"

"آیا بھائی آیا۔"

سامنے کی ڈھلوان سے ایک درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم والا نوجوان اُترنے لگا جس کے ہاتھ میں بانسری تھی۔ پانی کے قریب پہنچ کر اُس نے بانسری کو تہمد کی ڈب میں اُڑس لیا اور جوتے اُتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ تہمد کا لنگوٹ کس کر وہ پانی کے اندر آ گیا۔ اُس نے زرینہ کی سیٹ کے ساتھ والا پہیہ تھاما تو چچا نے گھوڑے کو چابک لگایا اور پہیہ ایک دھچکے کے

ساتھ کیچڑ میں سے نکل گیا اور تانگہ سامنے کی ڈھلوان پر چڑھتا ہوا چشم زدن میں ہموار سڑک پر پہنچ گیا۔ احمد نالے میں کھڑا تھا اور بڑی بے نیازی کے عالم میں تانگے کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک نظر زرینہ کو دیکھا لیکن یہ کم نگہی کی ایک اُڑتی سی جھلک تھی جو ہموار سڑک تک پہنچتے پہنچتے چند دھچکوں میں یوں گھل مل گئی تھی کہ ایک بھرپور نظر کے قالب میں بھی نہ ڈھل سکی۔

چچا ایک لمحے کے لیے بھی نہ رُکے کہ احمد کا شکریہ ادا کر لیں۔ زرینہ کو کچھ افسوس سا ہوا۔ تانگہ چند گز آگے بڑھا ہو گا کہ احمد بھی کنارے پر آ کھڑا ہوا۔ اُس نے بانسری منہ سے لگائی اور نغمے شبنم کے قطروں کی مانند برسنے لگے۔ اِن کے آہنگ میں گھن گرج نہیں تھی۔ زرینہ کی پیشانی پر اوس کا ٹھنڈا چھینٹا پڑا۔ تانگہ گاؤں کے گرد چکر کاٹتا ہوا گاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر کوٹھی کے سامنے آ کر رُکا تو زرینہ کی آنکھیں خود بخود مندھ سی گئیں۔ اُس نے احمد کا ہیولے دیکھا جس کے ہونٹوں سے بانسری لگی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں ایک مافوق الفطرت چمک تھی جو بڑے اضطراب کے ساتھ اُس کا استقبال کر رہی تھی۔ زرینہ کا رواں رواں کانپ گیا۔

"ایک کا ہیولے دوسرے میں کیوں مدغم ہو گیا تھا؟" اُس نے سوچا۔

"لڑکیو اُترو! تمھاری چچی پھاٹک پر کھڑی تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔ کامل میاں تو سوات کی سیر کو گئے ہیں۔ آج گھر پہ ہوتے تو کتنا لطف رہتا۔"

"کامل گاؤں میں نہیں چچا؟" شاہدہ نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں بیٹی۔"

"لیکن میں نے اُنھیں ابھی ابھی پھاٹک پر کھڑے دیکھا۔" زرینہ نے شاہدہ کے کان میں دھیمے سے کہا۔

"تمھیں دھوکا ہوا ہو گا زرینہ! پھر تم ہو بھی تو سدا کی پگلی۔ خواب دیکھنے والی شہزادی۔" شاہدہ نے بڑی بہن کی سی شفقت کے ساتھ زرینہ کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔

دونوں بہنیں بیک وقت گویا نیند سے بیدار ہوئیں۔ ایک دوسری کو پہچان کر حیران ہو گئیں۔ شاہدہ نے چائے دانی میں پتی ڈال کر پانی انڈیل دیا۔ "چائے پیو زرینہ!" شاہدہ نے سوئی سوئی آواز میں کہا اور تازہ مکھن میں تلے ہوئے ٹوسٹ اُس کی طرف بڑھا دیئے۔ زرینہ نے ایک پیالی چائے بنائی اور ایک دو گھونٹ ہی بھرے تھے کہ چچی آ گئیں۔ اُن کے پیچھے میلے کپڑے پہنے رجو تھی جس کے سر پر دودھ سے چھلکا ہوا ولٹوہہ تھا۔

"لڑکیو!" چچی نے بڑی پاٹ دار آواز میں کہا، "گاؤں میں آئی ہو تو خالص دودھ پیو۔ مکھن کھاؤ۔ گرم پانی پی پی کر کیوں اپنا کلیجہ جلا رہی ہو۔ رکھ دے ولٹوہہ رجو۔" چچی نے خود بڑھ کر رجو کے سر سے ولٹوہہ اُتارا اور گھڑونچی پر رکھ دیا۔

"رجو بیٹی! ذرا شہر کی ان لڑکیوں کو اپنا چہرہ تو دکھا دو۔" چچی نے مسکرا کر کہا اور رجو نے میلی چادر سے چہرے کو اور بھی ڈھانپ لیا۔

شاہدہ نے کہا "چچی جان! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ پہلے رجو کا تعارف تو کروا دیا ہوتا ہم سے۔"

"رجّو پچھلے سال سے یہیں میرے ہاں کام کرتی ہے۔ دو چار دن ننھیال رہ کر کل شام آئی تھی۔ رجّو! یہ شاہدہ اور زرینہ ہیں۔ شہر سے آئی ہیں کہ گاؤں میں رہ کر ہوا بدلیں پر جب سے آئی ہیں گھر کی چار دیواری میں بند ہیں۔"

چچی کے اصرار پر رجّو ایک پیڑھی پر بیٹھ گئی تو زرینہ نے کہا "رجّو! دکھاؤ نا چہرہ تو ہمیں۔" رجّو اور بھی سکڑ سمٹ گئی۔

شاہدہ نے چائے کی ایک پیالی بنا کر رجّو کی طرف سرکا دی تو چچی نے کہا "پی لے رجّو، دیکھ لینا زیادہ گرم نہ ہو۔"

رجّو نے کھدر کی چادر میں لپٹا ہوا ہاتھ باہر نکالا تو شہر کی لڑکیاں حیران رہ گئیں۔ یہ ہاتھ اُجرا اُجرا ہاتھ تھا جس کے کھردرے پن میں گدرایا ہوا حسن تھا۔ لمبی لمبی نازک انگلیوں کی مخروطی پوریں سرخ تھیں اور ناخن برتن مانجھنے، آٹا گوندھنے اور اُپلے تھاپنے کی وجہ سے کچھ بد رنگ سے اور ٹوٹے ٹوٹے سے تھے اور جب رجّو نے شرماتے شرماتے چہرے سے چادر کا پلّو ہٹایا تو شاہدہ اور زرینہ حیرت کے مارے دم بخود رہ گئیں۔ اتنا معصوم چہرہ کہ جیسے تازہ تازہ لہو کا غازہ پھیر ہوا ہو اور گال جیسے انار کے پھول اور آنکھیں اگر کنول کے ساغر تھیں تو ان میں شبنم سے ڈھلے ہوئے چنبیلی کے پھولوں کی مہک بھی تھی اور سیاہ بالکل سرخ سرخ گالوں پہ یوں گر رہی تھیں جیسے آگ کے ساتھ کھیل رہی ہوں اور ابھی جل جائیں گی۔

"شاہدہ! دیکھا دودھ اور مکھن پہ پلی ہوئی جوانی کو۔ میری مانو تو اب یہیں رہ جاؤ دونوں بہنیں۔ شاہدہ! تم نے بارھویں کا امتحان پاس کر لیا ہے نا؟"

"جی! چچی جان! اور میں نے بی۔ اے کے پہلے سال میں داخلہ بھی لے لیا ہے۔"

"کیا کرو گی اتنا پڑھ کر۔ یہیں گاؤں ہی میں تو . . . . ." یہ چچی کا بڑا پسندیدہ موضوع تھا۔

بے چاری شاہدہ نے بات کاٹ کر کہا "چچی جان! آپ رجّو کو زیادہ ایسا کرے گی نا؟"

"کیوں نہیں۔ پچھلے سال سے میرے پاس رہ رہی ہے۔"

چائے پی کر شاہدہ اور زرینہ صحن میں آ گئیں۔ دو چار لمحے دھوپ میں کھڑے رہ کر دونوں اندر سے کرسیاں اٹھا لائیں۔

کرسیاں بچھا کر دونوں بیٹھ گئیں تو زرینہ نے کہا "شاہدہ! تم نے رجّو کی شکل و صورت میں کوئی مشابہت دیکھی؟"

"نہیں تو۔"

"سوچو . . . . . تاریخ ہندوستان کی کسی دلآویز ہستی سے۔"

شاہدہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا "تمہارا اشارہ نور جہاں کی طرف ہے نا؟"

زرینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تو شاہدہ نے ذرا چڑ کر کہا "بہت دور کی کوڑی لائی ہو۔ کہاں نور جہاں کہاں یہ گنوارن۔"

"نہیں شاہدہ تم انصاف سے کام نہیں لے رہیں۔" زرینہ کی آنکھوں میں مدھم سی شرارت تھی۔

"تم کیوں مسکرائیں زرینہ؟" شاہدہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"یونہی . . . . . شاید اس لیے کہ تاریخ کی نور جہاں تو گلاب کی پنکھڑی سے بھی نازک تھی اور عطر گلاب کی موجد اور یہ گاؤں کی نور جہاں اُپلے تھاپنے کی ماہر اور اس کے کپڑوں سے کھٹی لسّی کی بو باس بھی آتی رہی۔" زرینہ نے شوخی سے کہا۔

"اتنا مت اتراؤ زرینہ۔ میں نے تو رجّو کو دیکھ کر اتنا احساسِ کمتری محسوس کیا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے اور میں نے پہلی بار"

شاہدہ کچھ اور کہنے ہی والی تھی کہ چچی اندر سے آ گئیں۔ شاہدہ اُٹھی اور کشیدہ کاری کا سامان لے آئی۔ زرینہ اندر سے ایک کتاب لا کر پڑھنے لگی۔ صحن میں گرم گرم دھوپ کا گہرا سکون چھا گیا تھا۔ باہر باغ کے کسی درخت پہ ایک گلدم چہکنے لگا۔ اُس کی چہک میں تو خیز دھوپ کا سیال نغمہ تھا کہ قطرہ قطرہ ہو کر گر رہا تھا جیسے آبشار کا دھیما سا راگ ہو کہ دھوپ اور سایوں میں گم ہو ہو کر اُبھر رہا ہو۔

اچانک چچی نے کہا "لو آ بھی گئے وہ۔"

"کون ؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"تمہارے چچا پر اتنی جلدی ......"

"نہیں چچی جان! یہ تو کامل بھائی ہیں۔" زرینہ نے کہا۔

شاہدہ کی انگلیوں میں سوئیاں رک گئیں۔ کامل نے اٹیچی کیس فرش پر رکھتے ہوئے کہا "زرینہ تم ...... اور شاہدہ ...... آج تو کمال ہو گیا ...... میرے استقبال کے لیے ...... اور میں ثریا تن سنگھ بھی نہیں کہ سوات کی کوئی ماؤنٹ ایورسٹ ہی فتح کر کے لوٹتا۔ میں اتنے بڑے اعزاز کے قابل کہاں تھا۔"

"کامل بھائی! اتنی بھی کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ خاکی سوٹ میں ثریا تن سنگھ تو نہیں البتہ برفانی ریچھ کے شکاری ضرور معلوم ہو رہے ہیں۔" زرینہ چہکی۔

"شاہدہ!" چچی نے شاہدہ کو محبت بھری نظروں سے تکتے ہوئے کہا "تم نے کوئی بات نہیں کی۔"

"میں ...... چچی جان ...... میں تو سوچ رہی تھی کہ کامل آئیں گے تو اُن کے ایک کندھے سے بندوق لٹک رہی ہوگی اور دوسرے کندھے پر کیمرہ ہوگا۔"

"کیمرہ بڑے ٹرنک میں سٹیشن پر پڑا ہے۔ بندوق میں ساتھ لے کر ہی نہ گیا تھا۔ شاہدہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری خواہش کے مطابق پورا نہیں اُتر سکا۔" کامل نے ہنس کر کہا۔ زرینہ نے صحن میں ایک اور کرسی بچھا دی۔ چچی باورچی خانے میں چلی گئیں اور سردیوں کا خوشگوار دن چٹکیوں میں بیتنے لگا۔ زرینہ چہک چہک کر باتیں کرتی رہی۔ شاہدہ خاموش رہ کر کنکھیوں سے کامل کو دیکھتی رہی جیسے ان بکھری بکھری جھلکیوں سے اسے اپنے من میں بسا لینا چاہتی ہو۔

زرینہ نے کہا "کامل بھائی! اگر آپ دو چار دن اور نہ آتے تو شاہدہ باجی بیراگن بن کر سوات کی طرف نکل جاتیں۔"

"زرینہ!" شاہدہ نے شرم اور غصے سے پکار کر کہا۔

کامل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"کامل بھیا! مجھے تو ڈر تھا کہ پنجاب کی شاعری میں ایک اور قصے کا اضافہ ہو جاتا۔ قصہ کامل شاہدہ۔" زرینہ کی شوخ نگاہوں میں شرارت کی پسی ہوئی بجلیاں تھیں لیکن کامل یکایک بجھ سا گیا۔

شاہدہ حجاب سے پکار کر کہنے لگی "زرینہ جب سے گاؤں آئی ہے آدھی رات کو دریچہ کھول کر ایک راگنی کا سواگت کرتی ہے۔"

"کون سا دریچہ؟" کامل نے چونک کر پوچھا۔

"وہی جو بائیں باغ کی طرف کھلتا ہے۔"

"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے زرینہ!" کامل نے ہنس کر کہا "اس دریچے سے ساون کا پہلا جھونکا آتا ہے۔ اس برابر بہار کی نمدار پھوار ہوتی ہے اور انھیں آم اور جامن کے کومل پتوں سے پہلی بار کوئل کی راگنی جنم لیتی ہے۔"

بات ختم کر کے کامل چپ چاپ اپنے آپ میں کھو گیا۔

"لڑکیو! کھانا تیار ہے۔ کامل کو بہت بھوک لگ رہی ہوگی۔" چچی نے کہا اور شاہدہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ زرینہ اور کامل اکیلے رہ گئے تو ایک مدت بعد کامل نے کہا "زرینہ! جو کچھ شاہدہ نے کہا سچ ہے؟"

"سچ!" زرینہ نے حیران ہو کر کہا۔ "وہ تو ایک سپنا ہوتا ہے جو آنکھ کھلتے ٹوٹ جاتا ہے۔"

"زرینہ! بائیں باغ کے اس دریچے سے یہ راگنی ضرور در آتی ہے۔ میں نے تو یہ سپنا اس وقت دیکھا تھا جب گھٹائیں امڈی ہوئی تھیں اور آموں میں ٹپکا لگ رہا تھا اور آدھی رات کو برہا کی ماری ایک کوئل جی کوک رہی تھی اور سردیوں کی آدھی رات کا یہ سپنا! ...... میں حیران ہوں۔ یہ مدھر سی شبنم کی کسی بوند پہ تھرتھرائی ہوگی زرینہ؟"

کامل نے زرینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ زرینہ نے کانپ کر آنکھیں جھکا لیں اور دھیمے سے کہا "یہ تو نیند کا ایک مذاق ہے کامل بھائی۔"

"نہیں!" کامل نے بڑے تیقن سے کہا۔

"کھانا کھا لو کامل۔" چچی نے باورچی خانے سے پکار کر کہا۔

کامل بادلِ نخواستہ اٹھا۔ کھانے کی میز پر بہت کم باتیں ہوئیں۔ تب کامل آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا اور رجّو میز پر سے برتن اکٹھے کرنے لگی۔ برآمدے میں آ کر شاہدہ نے زرینہ سے کہا "میں حیران ہوں زرینہ!"

"کس بات پر؟"

"رجّو اس گھر میں پچھلے سال سے کام کر رہی ہے لیکن اس سے میز پہ کھانا لگانے کا کام نہیں لیا جاتا۔"

"یہ کون سی حیرت کی بات ہے۔" زرینہ نے جواب دیا۔

"میں نے چچی سے ذکر کیا تو وہ مسکرا کر کہنے لگیں تمھارے کامل اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ اکثر باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے ہیں۔" شاہدہ نے کہا۔

"اچھا ہے۔ کون سا اتنا بڑا کنبہ ہے کہ ہر روز کھانے کا میز لگے۔ یوں بھی تو سادگی میں لطف ہے باجی۔"

"لیکن رجّو اس گھر کی نوکرانی ہے زرینہ!" شاہدہ کے لہجے میں تھوڑی سی تلخی تھی۔

سہ پہر کی چائے پی کر چچی نے باورچی خانے کا کام رجّو کو سونپا اور شاہدہ اور زرینہ کو ساتھ لے کر کنوئیں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ کامل تھکا ہوا تھا۔ ساتھ نہ جا سکا۔ جب وہ پھاٹک پر پہنچیں تو چچا بھی تحصیل سے آ گئے۔ ان کے چہرے پر غصہ تھا۔ کہنے لگے "بھئی لڑکیو! تمھیں سردیوں میں گاؤں آنے کی کیا سوجھی؟ گرمیوں کی چھٹیوں میں آتیں تو ساون بھادوں کی جھڑی کا مزا اٹھاتیں۔ کامل میاں آ گئے؟"

"آ گئے۔" زرینہ نے کہا۔

"اچھا ہوا آ گئے۔ اس سال بی اے کر لیں تو انھیں مال کے محکمے میں بھرتی کروا دوں خواہ پٹواری ہی کیوں نہ لگیں۔"

"نہیں چچا! وہ تو ایم اے میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔" زرینہ نے کہا۔

"نہیں جی! بڑے دیکھا! اتنا پڑھ لکھ کر ارسطو بھی بن گئے تو ہمیں کیا؟ کالج میں پروفیسر ہونے سے تو بہتر تھا کہ محکمۂ مال میں بھرتی ہوتے۔ آج کہیں ڈی سی نہیں تو مال افسر ضرور لگے ہوتے اور خاندان کا وقار ۔ ۔ ۔ ۔"

"چلو لڑکیو! شام پڑ رہی ہے۔" چچی نے بات کاٹ کر کہا "آج تمھارے چچا کو تحصیل میں کرسی نہیں ملی ہو گی۔"

کنواں گاؤں سے ایک میل دور تھا۔ گندم کی مخملیں وسعتیں دور افق سے جا ملی تھیں۔ پگڈنڈی زرد زرد دھوپ میں چمک چمک کر کھلا رہی تھی۔ "لڑکیو! سردیوں کا دن تو یوں چٹکیوں میں گزر جاتا ہے۔ ہم نے دیر کر دی۔" چچی نے کہا۔

"سردیوں کا دن جوں جوں ڈھلتا ہے، طبیعت اداس ہوتی چلی جاتی ہے۔" شاہدہ بولی۔

"نہیں تو۔ ابھی ڈوبتے سورج کا نظارہ تو دیکھنا۔ کتنا دلفریب ہو گا۔" زرینہ نے کہا۔

یکایک، ایک طرف سے بانسری کے نغموں کی پھوار آئی تو چچی نے کہا "یہ وہ پاگل سا لڑکا احمد ہے۔ کچھ کام نہیں کرتا۔ سارا دن بانسری منہ سے لگائے رہتا ہے۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔" کماد کے کھیت کی اوٹ سے احمد یوں اچانک سامنے آ نکلا جیسے کوئی ابھرا ہو۔ اس نے بانسری منہ سے ہٹا کر چچی کو سلام کیا۔ چچی نے ہنس کر پوچھا "احمد! کیا کر رہے ہو؟"

"یونہیں موج میلہ ماسی!" چچی کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور احمد پگڈنڈی سے ہٹ کر کماد کے کھیت میں کھڑا ہو گیا۔ چچی اس کے پاس سے گزر گئیں۔ ان کے بعد شاہدہ۔ موج میلہ سر جھکائے کھڑا رہا۔ جب زرینہ پاس سے گزرنے لگی تو اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور زرینہ یونہی مسکرا پڑی۔ موج میلہ زرینہ کی اس مسکراہٹ میں الجھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے زرینہ کی آنکھوں میں ڈری ڈری نگاہوں سے جھانک کر دیکھا تو زرینہ جھینپ سی گئی۔ یہ ایک نظر! ۔ ۔ ۔ ۔ اور پگڈنڈی کے پیچ و خم میں گہرائیاں اور گیرائیاں پیدا ہو گئیں۔ اس نے ایک قدم بڑھایا تو موج میلہ کا ہیولیٰ دھندلا پڑ گیا اور کماد کے کھیت کے متوازی پگڈنڈی کا ایک بل ختم ہوا تو ایک دوسرے موڑ سے کامل بھیا کا سراپا یوں ابھر آیا جیسے کالی گھٹاؤں سے ایک ستارہ لیکن اس میں آب و تاب تھی۔ زندگی اور گرمی تھی۔ یہ تو ایک حقیقت تھا۔ خواب نہیں تھا۔ اس پر تصور کی دھندلاہٹ ابھی نہیں تھی حالانکہ کامل بھیا کو ابھی ابھی وہ گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی تو یہ ہیولیٰ شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو گیا۔ ایک سرد جھونکا آیا اور اس دوش پر نغمے کی ایک پھوار اور سردیوں کی اداس شام نے اس کے کان میں سرگوشی کی "زرینہ! یہ دوسری بار ہے تو نے موج میلہ کی بانسری کی ایک لے میں سے کامل بھائی کے سراپے کو تحلیل ہوتے دیکھا۔"

"زرینہ!" شاہدہ نے دو قدم پیچھے آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں شاہدہ۔"

اور دور افق کی گولائیوں میں درختوں کے پیچھے سورج ڈوب گیا اور شفق پھول کر گل و گلزار بن گئی اور سرسبز کھیتوں پر سنہری سائے لہرانے لگے۔ جب وہ کنویں سے لوٹ کر آئیں تو اندھیرا چھا چکا تھا اور گاؤں میں دیوں کی ٹمٹماہٹیں تھیں۔

"خوب سیر رہی زرینہ ؟" کامل نے جو برآمدے میں کرسی بچھائے بیٹھا تھا پوچھا۔
"خوب! رستے کے ایک موڑ پر موج میلہ نے بانسری بجا کر ہمارا سواگت کیا۔"
"موج میلہ! وہ تو اِس گاؤں کا راجا ہے۔ میرا تو لنگوٹیا ہے۔ کھو تو کل اُس سے جی بھر کر بانسری سنیں۔"
"نہیں ... ..." زرینہ کی آواز تھرتھرا گئی۔
"نہیں!" کامل نے حیران ہو کر دُہرایا۔

اِس اثنا میں شاہدہ نے ہر کمرے میں لیمپ روشن کر دیئے۔ برآمدے میں روشنی کی کرنیں آئیں تو چچی بولیں "شاہدہ کتنی سگھڑ بیٹی ہے۔ میں تو سدا کی پھوہڑ ہوں۔ شاہدہ اس گھر میں آ گئی تو اِس کی کایا پلٹ کر رکھ دے گی۔" کھانے میز پر سجا او چچی کی موجودگی میں کوئی خاص باتیں نہ ہو سکیں۔ ڈرائنگ روم میں دھیمی سی روشنی تھی اور یہاں کامل ایک چشمے کی طرح اُبل پڑا۔ سوات کے نظارے۔ چھوٹے چھوٹے لطیفے۔ ہلکی پھلکی سدا بہار کہانیاں۔ یکایک کامل خاموش ہو گیا جیسے جھرنے کے منہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ ایک لطیفے کو اَدھورا چھوڑ کر باورچی خانے میں چلا گیا تو شاہدہ نے اُداس لہجے میں کہا "زرینہ! تمھیں کچھ عجیب سا احساس نہیں ہوتا؟"
"کیا ؟"
"کامل کچھ بدل سے گئے ہیں۔"
"نہیں تو ... ..."
"پھر میرا احساس غلط ہے۔" شاہدہ نے کہا اور باورچی خانے سے چچی کی بانٹ دار آواز آئی۔
"بیٹا کچھ دنوں سے تیرے خیالات بدل گئے ہیں۔ رجّو اس گھر کی نوکرانی ہے۔ میں اُس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتی ہوں لیکن اُسے گھر کا ایک فرد کیسے سمجھ لوں۔ تم پسند کرو گے کہ وہ تمھارے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھائے۔"
"یقیناً" کامل نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔
"یہ نیا تجربہ بھی کر لینا بیٹے پر پہلے رجّو سے تو پوچھ لینا کہ وہ اس کے لیے تیار بھی ہے یا نہیں۔"
کامل واپس آیا تو اُس کے چہرے پہ جھوٹی مسکراہٹ کی پرچھائیاں تھیں۔
"امّاں جان بھی کتنے پرانے خیالات کی عورت ہیں۔ انسان کو انسان نہیں سمجھتیں۔ کھانا کھا لینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے وہ بیچاری رجّو کے سر پہ رکھ کر اُسے چلتا کرتی ہیں۔"
"رجّو!" شاہدہ کے ہونٹ مسکرانے کی کوشش میں کانپ کر رہ گئے اور وہ ہونٹ بھینچ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔
"کامل بھیا! جب شاہدہ باجی نے پہلی بار رجّو کو دیکھا تھا تو اُن کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔"
"سچ ؟" کامل نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔
"کامل بھائی! کبھی آپ نے غور کیا رجّو کی شکل و صورت میں ایک خاص مشابہت ہے۔"
"نہیں ... ..."

"تاریخِ ہندوستان کی ایک نہایت دلفریب ٹہنی ہے جس کا ایک ہاتھ پنگھوڑا جھلا رہا ہے اور دوسرا ہاتھ حکومت کی باگ پر رہا ہے"

کامل کافی دیر سوچتا رہا۔ تب اُس کی آنکھیں صبح کے ستارے کی مانند چمک کر روشن ہو گئیں۔ اُس نے وفورِ جذبات کے ساتھ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "زرینہ! یہ الہام تمہیں کیسے ہوا؟"

"مجھے!" زرینہ نے حیرت بھری نگاہوں سے پوچھا۔

"یہ تو میرے تخیل کی ادھوری سی تشبیہہ تھی۔ تمہیں اتنے عظیم الفاظ کہاں سے مل گئے؟ زرینہ! تو نے اتنا اُونچا راز کیسے پا لیا؟ میری روح مدت سے اِس کی تلاش میں سرگرداں تھی" کامل نے تیز تیز کہا۔ اُس کے لہجے میں بڑی گھمبیرتا تھی۔

"کامل بھائی!" زرینہ نے عام سے لہجے میں کہا "آپ تو بہت اُونچے اُڑ گئے۔ میں نے تو بڑی معمولی سی بات کی تھی۔ زمین کی بات"

رات بہت لمبی تھی!

شاہدہ حسبِ معمول صبح سویرے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے بائیں باغ والی کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک بھیگا جھونکا آیا تو زرینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ابھی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سو گئی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے صبح کی سرخیاں جھلک رہی تھیں۔ وہ چادر اوڑھ کر برآمدے میں آئی تو کامل اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

"زرینہ! آج رات تو نے وہ سپنا دیکھا؟"

کامل کے اس اچانک سوال پر زرینہ کا تن بدن تھرا سا گیا۔

"میں نے آج کوئی سپنا نہیں دیکھا کامل بھائی!"

"سچ کہہ رہی ہو زرینہ؟"

"آپ کو یقین نہیں آ رہا کامل بھائی" زرینہ نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"یہ تو یہ راگنی تو کسی بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے"

"ہو گی — لیکن میں نے تو کسی طوفان کو سر اُٹھاتے نہیں دیکھا"

"یہ راگنی جب پہلی بار میری روح سے ہم کلام ہوئی تھی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ آج میری زندگی کا پہلا دن شروع ہوا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ میرے رویں رویں میں رچ گئی۔ اب یہ ایک گہرا دُکھ بن گئی ہے۔ میں اِس سے بھاگتا ہوں۔ یہ دامن پکڑ کر میرے پیچھے بھاگتی ہے گویا یہ میرا سایہ ہو۔ میں اِس سائے سے نجات حاصل نہیں کر سکتا زرینہ"

"میں ابھی اِس منزل پہ نہیں پہنچی" زرینہ نے کامل کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

"زرینہ! تم مجھے سمجھ سکتی ہو۔ میرا اور تمہارا درد ایک ہے"

زرینہ کے جسم کو ایک یخ بستہ لہر چھو کر گزر گئی۔ اُس نے کپکپا کر کہا "میں نہیں سمجھ سکتی کامل بھائی!"

"نہیں زرینہ! میں تم سے التجا کرتا ہوں مجھے ضرور سمجھنے کی کوشش کرو" کامل نے بڑے خلوص سے کہا اور زرینہ کی آنکھوں

میں خوف کی ایک جھلک پیدا ہو گئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں کامل بھائی!"

"زرینہ! میں آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہوں۔ اگر تم نے میرے دل کا راز نہ سنا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

زرینہ نے باورچی خانے کی طرف قدم بڑھا لیے۔

"کامل بھائی! شاہدہ باجی چائے تیار کر چکی ہو گی۔ آئیے! ناشتہ کیجئے!" زرینہ نے کہا۔

اور اتنا کہہ کر بھاگ کھڑی ہوئی جیسے ابھی آتش فشاں پھٹ جائے گا۔ زمین کانپے گی۔ آسمان روئی کی طرح دھنکا جائے گا اور ستاروں کی دھول اڑ کر ساری دنیا پر چھا جائے گی۔

ناشتے کے بعد کامل انھیں ساتھ لے کر گاؤں کے اردگرد گھومتا رہا۔ یہ دن بڑا خوشگوار تھا۔ نرم گرم دھوپ کسی شاعر کے احساس کی طرح لطیف اور منزہ تھی۔ نالے کے کنارے۔ پائیں باغ میں۔ کنوئیں پر۔ کامل ہر جگہ ان کی تصویریں اتارتا رہا۔ نالے کے کنارے ایک ٹیلے پر ان کی موج میلے سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ کامل موج میلے کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آیا۔ کامل نے موج میلے سے بانسری پر چند دھنیں سنانے کی فرمائش کی۔ زرینہ خوف زدہ ہو کر شاہدہ کے پیچھے چھپ گئی۔ موج میلے نے ہنس کر کامل کو ٹال دیا۔ کامل اصرار کرتا رہا اور زرینہ کا دل دھڑکتا رہا جیسے موج میلے نے بانسری منہ سے لگائی تو آتش فشاں کا دہانہ پھٹ پڑے گا اور وہ گھٹنوں کے بل گر کر کامل بھائی کی پوجا کرنے لگ پڑے گی لیکن موج میلہ مسکراہٹ کی آڑ میں انکار کرتا رہا۔ کامل ناگواری کا احساس لیے ہوئے انھیں ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر زرینہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر لیٹ کر وہ ایک کتاب پڑھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ ذہن میں شفاف دھوپ کا سا سماں تھا لیکن اس کے باوجود زرینہ کے خواب الجھے ہوئے تھے۔ کچھ واضح نہیں تھا جیسے خوابوں کی وادی پر سنہری دھند چھائی ہوئی ہو۔

شاہدہ نے اس کا کندھا ہلا کر کہا "چلنے نہیں ہو گی زرینہ؟"

"نہیں بھیجد و رجو کے ہاتھ باجی!" زرینہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔

"رجو!" شاہدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا "چچی اسے ساتھ لے کر کب کی کنوئیں پر جا چکی ہیں!"

"تو چلو میں تمہارے ساتھ باورچی خانے میں چلتی ہوں!" زرینہ اچک کر بستر میں سے نکلی۔

صحن میں زرد اداس سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

"زرینہ! نجانے اس دفعہ گاؤں میں میرا جی کیوں نہیں لگا؟ کیوں نہ کل ہم لوٹ چلیں!"

"کامل بھائی کیا کہیں گے!"

"وہ ہمیں نہیں روکیں گے۔ تم نے دیکھا نہیں، وہ کچھ بدل سے گئے ہیں!"

"نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" زرینہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔

"زرینہ! جب چچی کنویں پر جانے گئیں تو کامل صحن میں بیٹھے تھے۔ چچی کے جاتے ہی وہ بھی باہر نکل گئے۔"

زرینہ کو اپنی روح میں ایک عجیب سے کھوکھلے پن کا احساس ہوا لیکن اس نے مسکرا کر کہا۔

"شاہدہ باجی! محبت کے سفر میں ایسی منزلیں بھی آیا کرتی ہیں۔ کبھی اندھیرے کبھی اجالے۔"

شاہدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی اداس آنکھوں میں مسکراہٹ تھی اور دھیرے دھیرے یہ مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگ گئی تو زرینہ شاہدہ سے لپٹ گئی۔ "میری پگلی باجی!" اور شاہدہ سے لپٹے لپٹے ماحول پر خوابوں کے دھندلکے چھا گئے۔ ایک دھواں سا بکھر گیا اور اس کے ایک مرغولے سے کامل بھیّا کا سراپا دھیرے دھیرے تشکیل پانے لگا تو زرینہ نے کانپ کر شاہدہ کو چھوڑ دیا۔ اس نے سوچا "مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں کامل بھائی کو کس روپ میں دیکھنے لگ پڑی ہوں۔ شاہدہ ٹھیک کہہ رہی ہے ہمیں یہاں سے چلا جانا چاہیے۔"

دھیرے دھیرے ایک اور دن بیت گیا۔

ایک اور رات آ گئی۔ آج اسے بہت دیر کے بعد نیند آئی اور نیند کی دیوی نے ابھی جادو کا آنچل پھیلایا بھی نہ تھا کہ روح کے دریچے پر اسی دھیمی سی سُر نے دستک دی۔ اس نے لپک کر سرہانے کی کھڑکی کھول دی۔ پائیں باغ میں خوابوں کا گہرا سکون تھا۔ تب اندھیرے میں ایک سرسراہٹ ہوئی اور دور سے ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ بانسری کا ایک نرم خرام نغمہ بھیگ بھیگ کر اندر آیا۔ اس نے کھڑکی بند کر دی اور تکیے پر سر رکھ دیا۔ تکیے کا ٹھنڈا لمس نیند کا گہرا خمار بن گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کامل بھائی اس کے بستر کے ساتھ ساکت و صامت کھڑے تھے۔ شاہدہ باجی کا بستر خالی تھا۔

ابھی کامل کے ہونٹ کھلے بھی نہ تھے کہ زرینہ نے کہا۔

"کامل بھائی! آج رات اس راگنی نے پھر میرے خواب محل کے دریچے پر دستک دی۔"

"سچ؟" کامل کے لہجے میں مسرت کی کھنک تھی۔

"ہاں ...... نہیں ......" زرینہ تذبذب میں پڑ گئی "یہ تو ایک پریشان خواب تھا۔"

"میں نے بھی پہلے اسے پریشان سپنا سمجھا تھا پر جب میں نے اس کی تعبیر دیکھی تو میری دنیا لرز اٹھی۔"

"تعبیر! ...... کون سی تعبیر؟ ......" زرینہ نے نڈھال سی آواز میں پوچھا۔

"یہ تعبیر ایک خوفناک حقیقت بن کر آئی زرینہ! میں نے صدیوں کی روایات کے محلوں کو دھڑام سے گرتے ہوئے دیکھا۔ اب میں آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہوں۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو زرینہ! میں صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں۔"

"نہیں ......"

"زرینہ! میرے خواب کی تعبیر تُو ہے۔"

"زرتجو!" زرینہ نے کانپ کر کہا۔

"یہ وہی رنگنی ہے جو میری روح کے دریچے پر دستک دیتی تھی۔ اب وہ میرے وجود میں رچ گئی ہے۔"

زرینہ کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھیں حیرت کے لبریز کٹوری بن گئیں۔

"میں نے راز افشا کر دیا ہے۔ میرے دل سے بوجھ اُتر گیا ہے۔ زرینہ! مجھے اُمید ہے تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو گی۔ میرا اور تمہارا درد ایک ہے۔ مجھے شاہدہ کے جذبات کا بڑا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں دل کا نازک آبگینہ ٹوٹ جائے تو دنیا کی ساری مدھر راگنیاں اپنی موت آپ مر جاتی ہیں لیکن ان کی راکھ سے ایک نیا نغمہ بھی جنم لیتا ہے۔"

کامل اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

زرینہ بُت بنے بستر پر بیٹھی رہی۔ کمرے کی فضا سرد اور منجمد سی تھی۔ نجانے کہاں سے ایک شعلہ لپکا۔ زرینہ نے شرارے اور انگارے اُڑتے ہوئے دیکھے۔ دو شرارے اُس کی آنکھوں میں آ گرے تو وہ دہکتے ہوئے سورج بن گئیں۔ اُس کا چہرہ تمتمایا اور کنپٹیوں میں دھماکے سے اُٹھے۔

کامل نے کمرے سے نکلنے کے لیے قدم بڑھایا تو زرینہ نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"کامل بھائی! خواب دیکھنے کے بعد آج رات میں اچانک جاگ اُٹھی تو میں نے کھڑکی کھول دی۔ پھر میں نے جاگتے میں ایک اور سپنا دیکھا۔ میں نے بھیگے ہوئے لمحے پر بانسری کا ایک نغمہ سنا۔"

"بانسری کا نغمہ!" کامل چونک اُٹھا۔

"بانسری کا نغمہ جو دُور بہت دُور سے آ رہا تھا۔ اس میں کسی کے دل کا درد بھی تھا۔"

"آدھی رات کو بانسری پر کس نے نغمۂ محبت گایا؟"

"میں نہیں جانتی۔ یہ نغمہ ہوا کے دوش پر آیا تھا۔ دیکھیے کامل بھائی! میں نے اپنا راز کہہ دیا۔ میرا اور آپ کا درد ایک ہے۔ آپ اور صرف آپ مجھے سمجھ سکتے ہیں۔"

"نہیں .... نہیں ......" کامل نے لکنت کے سے انداز میں کہا۔

"دیکھیے کامل بھائی!" زرینہ نے اُس کا دامن پکڑ کر کہا "مجھے سمجھیے!"

"میں نہیں سمجھنا چاہتا۔ تم روایات سے باغی ہو۔ آج تک ہمارے خاندان کی کسی لڑکی نے اس قسم کا نغمہ نہیں سنا۔ یہ کون تھا جس نے تجھے بانسری پر پکارنے کی جرأت کی؟" کامل نے غصے سے لرز کر پوچھا۔

"نجانے کون! یہ آپ کے گاؤں میں اتنی مدھر بانسری کون بجاتا ہے کامل بھائی؟"

"وہ پگلا ...... وہ سورج مکھیا ......" کامل کچھ کہہ کر رہ گیا۔

"کون جانے! ...... شاید! ...... میرے خواب کی تعبیر ......"

"زرینہ!" غصے کے مارے کامل کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ "ہمارے خاندان میں ......"

اور کامل جملے کو نامکمل چھوڑ کر شاہدہ کی چارپائی پر گر گیا۔ زرینہ مسکرائی۔ یک لخت اُس کی آنکھیں چمکیں۔ دوسرے لمحے

کمرے کے ماحول پر دھند سی چھا گئی۔ کامل کا سراپا اس میں تحلیل ہو گیا۔ دھند کے غبار سے ایک نئے کامل کا ہیولے دھیرے دھیرے تخلیق کی سب منزلیں طے کر گیا۔ کامل کے ہونٹوں پہ بانسری تھی اور اس سے نغمے ٹپک رہے تھے۔ ٹپ ٹپ جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ رہی ہو۔ یہ نغمات مسلسل۔ ۔ ۔ یہ راگنیوں کا جلوس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور زرینہ کا دکھ نغموں کو تال دے رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"کیوں؟ زرینہ! کوئی خواب دیکھ رہی ہو؟"

زرینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سامنے شاہدہ کھڑی تھی۔ اس کے انگ انگ سے بہار کے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ کامل کمرے میں موجود نہ تھا۔

"نہیں تو شاہدہ!" زرینہ دھیمے سے بولی۔

"کیوں شاہدہ؟ یہ کیا مذاق ہے؟ امی جان کہہ رہی ہیں تم گاؤں سے جانے کے لیے پر تول رہی ہو۔ ابھی تو چھٹیاں باقی ہیں۔ میں ابھی نہیں جانے دوں گا!" کامل برآمدے میں سے چہکے۔

زرینہ نے شال اوڑھی اور کمرے سے باہر نکلنے کے لیے بڑھی تو کامل بھائی چپکے سے اندر آ گئے اور اس سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھ گئے۔ زرینہ ایک لمحے کے لیے رک گئی اور سپنوں کا دریچہ کھٹ سے بند ہو گیا۔

چچی نے باورچی خانے سے پکار کر کہا "لڑکیو! پانی ابل رہا ہے۔ آ کر چائے تیار کر لو"۔

شاہدہ اندر سے بولی "جاؤ زرینہ پتی ڈال آؤ چائے دانی میں اور رجو سے کہنا وہ چائے کے لیے میز لگائے۔ آخر وہ اس گھر کی نوکرانی ہے۔ اسے کچھ تو سلیقہ آنا چاہیئے"۔

زرینہ مسکرائی۔ بڑی پُر اسرار لطیف سی مسکراہٹ۔ سرما کے ڈوبتے ہوئے سورج کی ایک کرن جو سیاہ ابر پارے کی گرفت سے نکلنے کی کشمکش میں مصروف ہو!

آپٹکس

امر سنگھ

غر ـــ ر ـــ ر . . . .

اسکوٹر کا دبا دبا شور . . . .

ایک شربتی فیتہ دُور تک بچھا ہوا۔ مجھے معلوم ہے (یہ علم مجھے یہاں سے ہر روز گزرنے کی وجہ سے حاصل ہے) کہ میرے دونوں طرف مکان اور عمارتیں، جامن اور املتاس کے پیڑ پیچھے کو بھاگتے جا رہے ہیں۔ مگر عدیم الوجود ہیں۔ وجود صرف اُن نادر پرندوں کے انڈوں کا ہے جو ہوائی جہاز کے ذریعے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے لائے گئے ہیں اور جنہیں میں ذُو لوجیکل پارک کی نرسری میں اِنکو بیٹر میں لگا کر آ رہا ہوں اور وجود ہے اِن کے موہوم مستقبل کا . . . . اور . . . . . . اور اس شربتی فیتے کا جو میرے سامنے دُور تک بچھا ہوا ہے۔ میرے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک غیر مرئی سوراخ ہے جو بڑی تیزی سے اس فیتے کو نگلتا جا رہا ہے۔

بلکلخت یہ فیتہ ٹوٹ گیا ہے۔ یہ ایک دم بے حد چوڑا ہو گیا ہے۔ تحت السطح پانی پھوٹ نکلا ہے اور سڑک میں گڑھا پڑ گیا ہے۔ نادر انڈے عدیم الوجود ہو گئے ہیں۔ گڑھے کو اسکوٹر کا مڈگارڈ نگل گیا ہے۔ اور اب بڑی تیزی سے اس فراخ فیتے کو ہڑپ کیا جا رہا ہے۔

وہ . . . . . ! وہ کون میرے گھر کے پھاٹک پہ کھڑی ہے ؟

یہ ـــــ ! یہ تو میری بیوی ہے۔ جو پھاٹک پہ دونوں کہنیاں ٹکائے اُس کے ساتھ جھول رہی ہے اور میرا انتظار کر رہی ہے۔ یہ اس کا معمول بن چکا ہے۔ جب سے میرا لڑکا اسکالرشپ لے کر ہارورڈ چلا گیا ہے اور لڑکی اِندور جہاں اُسے بی۔ ایس۔ سی میڈیکل میں داخلہ مل گیا ہے۔

کیوں بہکاوے دیتے ہو دوست! کس کو شک ہے کہ یہ تمہاری بیوی نہیں۔ یہ تو تمہاری بیوی ہے ہی۔ مگر وہ کون ہے ؟ وہ . . . . . جو پھاٹک کے دوسرے پٹ کو بغل میں دبائے کھڑی ہے ؟

وہ ــــ وہ ــــ وہ ــــ یہ تو وہ پیچھے مڑ کر دیکھ رہی ہے! میری بیوی نے مجھے آتا دیکھ لیا ہے شاید ــــ اور شاید اُسے بتا دیا ہے اور میری بیوی ــــ میری بیوی ــــ میری بیوی نے کہنیاں پھاٹک پر سے اُٹھا لی ہیں۔ اور اب غالباً اُس کے چہرے پر سے بے زاری کے تاثرات مٹ گئے ہوں گے۔ اور میری بیوی ......

میری بیوی ......

پھر بیوی ــــ! مگر وہ ــ

وہ ...... ہاں وہ ہماری نئی پڑوسن ہے۔ جسے یہاں آئے صرف چار دن ہوئے ہیں اور آتے ہی وہ میری بیوی کے ساتھ گھل مل گئی ہے۔ یہ میری بیوی کی خوبی ہے! پتہ نہیں کیا جادو ہے اِس کی شخصیت میں! جو کوئی بھی اِس سے ملتا ہے گرویدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور پھر میری بیوی ......

پھر وہی بیوی کی رٹ! تم جتنا چاہو پہلو بچاؤ مگر میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا ...... آخر تم مان کیوں نہیں لیتے کہ یہ عورت روزِ اوّل سے ہی تمہارے ذہن پر سوار ہو چکی ہے۔ اور تم دُور سے ہی، محض اُس کا ہیولا دیکھ کر ہی اُسے پہچان لیتے ہو۔ آج بھی اُس کے ہیولے پر ہی نظر پڑتے ہی تمہارے دل کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

نہیں تو ...... نہیں تو ......

جھوٹ مت کہو ......

نہیں نہیں ...... ہاں! شاید یہ ٹھیک ہی ہے۔ اِس کے ہیولے کو دیکھتے ہی دیکھتے ہی کیا محض اِس کا تصوّر کرتے ہی میرے دل کی حالت ایک ثانیے کے لیے کچھ ایسی ہو جاتی ہے۔ جیسے مچھلی کے حلق میں کانٹا پھنس گیا ہو۔ ایسے، جیسے شکاری نے اُسے پہلا جھٹکا دیا ہو۔ جیسے لفٹ پانچویں منزل سے ایک دم نیچے اُترنے لگے۔

لیکن یہ بات غلط ہے کہ وہ میرے اعصاب پر سوار ہے۔ غلط مطلب نہ لو۔ اگر وہ اعصاب پر سوار رہے بھی تو کیا؟ اِس طرح تو میرے اعصاب پر یہ اسکوٹر بھی سوار ہو گیا تھا۔ کافی عرصہ یہ سوار رہا تھا۔ اور پھر جب میں اِسے خریدنے کے قابل ہوا تھا تو اُس وقت تک یہ میرے اعصاب پر سے اُتر چکا تھا۔ اور پھر میں نے یوں خرید لیا تھا جیسے ریستوران میں چائے کا کپ پی لیا جائے محض دوستوں کا ساتھ دینے کے لیے، گپیں ہانکنے کے لیے۔

تو ــ تو ــ تمہارا مطلب ہے ــ ــ!

میں پھاٹک پر پہنچ گیا ہوں - اسکوٹر کا شور بند ہو گیا ہے - پڑوسن کا وجود شدت سے نمایاں ہو گیا ہے - میری نظر اس کے سراپا سے پھسلتی ہے اور اس کے پیٹ پر آ کر ٹھہر تی ہے - ایک بار —— دو بار —— اور پھر بار بار .....

اُف میرے خدایا ..... ! یہ کیا ہو رہا ہے ؟ میرا سر کندھوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے بے قرار ہو رہا ہے - یہ مچل رہا ہے کہ اُڑ کر اس کے پیٹ کے سامنے جا لٹکے اور پھر وہیں لٹکا رہے - آہ —— میرے کندھے شل ہوتے جا رہے ہیں بے بس —— .

" آپ آ گئے ؟ "

" ہاں "

(شکریہ میری جان ! تم نے میرے کندھوں میں نئی جان ڈال دی ہے)

نظر ایک بار پھر سارے پیکر کا طواف کرتی ہے اور کریپ کی قمیص کے پردے میں سے نمایاں ہوتے ہوئے مدوّر پیٹ پر جا ٹکتی ہے -

اُف ! یہ پیٹ کس قدر حسین ہے ! واہ —— کیا رٹا رٹایا جملہ ہے حسین —— کس قدر مبہم لفظ ہے - کس قدر بے معنی - کسی بھی حسن کا اظہار کرنے کے نا اہل —— یہ عورت ، اس کا پیٹ ، کیا عجیب عجیب باتیں مجھے سمجھا رہا ہے ، کیسے نئے نئے احساس ، کیا کیا خیال اور اس کا حسن ! حسن تو بے معنی ہے مگر اس پیٹ کا حسن کس قدر معنی خیز - آخر کیا معنی ہیں اس کے ——— حسن تو ایک ما بعد الطبعیاتی رشتہ ہے جو مخصوص لمحہ فرد کی شخصیت اور مفعول کے درمیان قائم کرتا ہے - حسن کس شدت کے ساتھ انفرادی ہے اور لمحاتی بھی - جیسے یہ مدوّر پیٹ میرے لیے - جیسے ، جیسے اِموکا انڈہ کریٹ کے بیچ روئی میں ٹکا ہوا جو آج ہی آسٹریلیا سے آیا ہے ——— جب میں نے کریٹ کھول ہٹائی کی اوپر کی تہ ہٹائی تھی تو وہ اسی پیٹ کی طرح ٹکا ہوا تھا اور اس کا اوپر کا مدوّر حصّہ ہی نظر آ رہا تھا ———

اِموکا انڈہ ——! یہ میں کیسی شاعری کرنے لگا ہوں - اور شاعری بھی کیا ادھوری چیز ہے ؟ اِموکا انڈہ کہنے سے اس پیٹ کے حسن کا خاک اندازہ نہیں ہوتا - اِمو کے انڈے کے مدوّر پیکر پر کہیں بھی وہ ہلکی سی ہمواری نہیں ہوتی جس کے عین مرکز میں ناف کا نظر نواز حصّہ ہوتا ہے (اس پیٹ میں ناف نظر نہیں آتی - قمیص کی سطح سے محض اس کی غمازی ہوتی ہے - مگر مجھے معلوم ہے —— یہ علم بھی عجیب جان لیوا چیز ہے —— کہ اس حصّے میں ناف ہے - اور ناف کا وجود بے حد شدت سے

نمایاں ہے "

امو کا انڈا ! یہ تو حسن کو بے جان بنانے والی بات ہے ۔ امو کے انڈے کو دیکھ کر اُس گداز لمس کا قطعی احساس نہیں ہوتا جو اِس پیٹ کو دیکھ کر ہوتا ہے ۔ میری روح تک اِس گداز لمس کی شبنمی ٹھنڈک سے سرشار ہوتی جا رہی ہے ۔ میرے رخسار کو ایک عجیب سکون بخش ملائمت کا احساس ہونے لگا ہے ۔ جیسے چلچلاتے زخم پر ٹھنڈی ٹھنڈی مرہم لگا دی جائے ۔ جیسے پیاس سے تپتی ہوئی زبان پر آئس کریم ....

لاحول ولا قوۃ ، یہ کیسی بے تابی میرے دل میں اُٹھنے لگی ہے ؟ اُف ، کیا شدت کی پیاس ....

" بہت دیر لگا دی آج تو —— ؟"

" دیر ! ہاں ہاں لگا دی ہے دیر "

[تم کیوں اِس عورت کو لے کر یہاں کھڑی ہو جاتی ہو ۔ یہ کیا تک ہے آخر ؟]

بیوی کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا ہے ۔ پھر ایک دم سُرخ ۔ ماتھے پر شکن ۔ چہرے کے سارے خطوط تن گئے ہیں [illegible] دل ڈوبنے لگا ہے ۔ خطوط ڈھیلے پڑ گئے ہیں ۔ شکن غائب ہے ۔ چہرے کی سُرخی ہونٹوں میں جا سمٹی ہے اور تبسم بن کر [illegible] ۔ انتظار کرتے ہوئے کسی سے "

" اوہ ! معاف کرنا بہن —— وہ —— "

[اِس [illegible] دکھاوا بار بار کا مگر کس قدر سُرخ ہے اِس قدر [illegible]]

" چلیے ، معاف کیا "

" شکریہ —— ! "

[کس قدر پیاری ادا ہے ۔ اور شکریہ بھی !]

" —— دراصل یہ —— یہ اسکوٹر بگڑ گیا تھا ۔ بہت پریشان کیا کمبخت نے ۔

[جھوٹ بولے بنا چارہ نہیں ۔ کچھ تو بات بنانا ہوگی]

لیکن یہ کمبخت پڑوسن کیوں مسکرا رہی ہے ۔ لو —— یہ اس کی مسکراہٹ [illegible] بکھر بن گئی ۔ پیکر ہنسنے لگا ہے ۔ کریپ کی قمیض کے نیچے اِمو کا [illegible] کڑاہی میں دودھ اُبال کھانے کے بعد کڑھنے لگے ۔

یا ابوجہل —— اب کیا ساری رسوئی اُٹھا لاؤ گے بیوی کی ؟

" اچھا بھئی ! اندر تو چلو "

[اِس کمبخت پڑوسن سے تو پیچھا چھوٹے کسی طرح]

"نہیں۔ اندر جانے کا وقت نہیں۔"

"کیوں؟"

"تمہاری ممانی آرہی ہیں۔ اور گاڑی کا وقت ہونے والا ہے۔"

"کون ممانی؟"

بیوی نے تار نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ سراج ممانی آرہی ہیں۔ میں کلائی کی گھڑی دیکھتا ہوں۔ گاڑی آنے میں صرف بائیس منٹ باقی ہیں۔ جلدی سے میں اسکوٹر کو کک لگاتا ہوں۔ اسکوٹر غرّاتا اٹھتا ہے۔ میری بیوی میرا بازو دیکھ لیتی ہے۔

"کیوں؟"

یہ پڑوسن کیوں ہنسے جا رہی ہے۔

"ممانی کو تو خیر پیچھے بٹھا لو گے مگر ان کا سامان کہاں لادو گے؟"

"اوہ——!"

[حد ہے حماقت کی]

"لو۔ وہ ٹیکسی آرہی ہے——ہاں۔ خالی ہے آوارہ! ——ٹیکسی——!"

بیوی نے خود ہی ٹیکسی روک لی ہے۔ میں اسکوٹر کو اندر کی طرف دھکیلنے لگتا ہوں۔ بیوی روک دیتی ہے کہ وہ خود ہی اسکوٹر اندر چھوڑ دے گی۔ اور مجھے چلے جانا چاہیے۔ میں اسکوٹر کو وہیں اسٹینڈ لگا دیتا ہوں۔ اور ٹیکسی کی طرف بڑھتا ہوں۔ بیوی میرے ساتھ ساتھ آرہی ہے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھتا ہوں تو وہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔ وہ کچھ کہہ رہی ہے اور میں جانتا ہوں مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ میرے ارد گرد ایک مسکراہٹ کا دھواں چھا رہا ہے اور سب آوازیں اسی میں جذب ہوتی جا رہی ہیں۔ ٹیکسی چل دیتی ہے۔ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھتا ہوں۔ بیوی کو ویو (WAVE) کرتا ہوں۔ پڑوسن پھاٹک کے سہارے کھڑی مسکرا رہی ہے۔

زمین میرے نیچے سے پھسلتی جا رہی ہے۔ ...... گھر، اس کا پھاٹک، میری بیوی اور——اور پڑوسن سب پیچھے رہ گئے ہیں۔ لیکن وہ مسکراہٹ——! یہ برابر میرا پیچھا کر رہی ہے......

یہ لو——یہ ایک بادل کا ٹکڑا بن گئی ہے۔ اور میرے سامنے ایستادہ ہو گئی ہے——

اور——اور ایک پیکر میں ڈھل گئی ہے۔ یہ پیکر، وہی پیکر، وہی وجود۔ اس کا ایک ایک عضو کس قدر واضح۔ کس قدر نمایاں، کس قدر مانوس...... ایک ایک عضو، ایک ایک خال——

ہائیں——! یہ کیا؟ اس کی تو آنکھیں ہی نہیں سارا وجود شدت سے نمایاں ہے مگر آنکھوں کا وجود ہی نہیں——یہ میری نظر اس کے سارے سراپا کو ٹٹولنے لگی ہے۔ تعجب ہے! اس پیکر کا وجود تو ہے مگر جسم نہیں——مجھے جسم نظر نہیں آتا——میرے خدا! وہ پیٹ——وہ چیں پیٹ پھر سارے وجود میں کس قدر شدت کے ساتھ نمایاں ہو گیا ہے، بھرا

مرکز حسوں پرت اُترنے لگا ہے اور بائیں رخسار کے بل وہیں پیٹ سے جا لگا ہے اور وہ ملائم گداز، گرم مس ——— دھڑکتا ہوا احساس! لیکن یہ کیا احساس ہے؟ اس پیٹ کا کوئی رنگ ہی نہیں ——— صرف قمیض کا رنگ ہے۔ کریپ کا کریم رنگ ———

خوب ———! تو تم اِس پیٹ کو عریاں دیکھنا چاہتے ہو؟ یہ کیا بڑھ بس ہے میاں! تمھیں شرم آنی چاہیئے۔ یہ بڑھ دسن جسے تم بار بار عورت کے نام سے یاد کرتے ہو تمھاری لڑکی کے برابر ہے۔ کیا ہوا اگر وہ ایک بچّے کی ماں ہے۔ تمھاری لڑکی بھی اگر ڈاکٹری کی تعلیم کی طرف مائل نہ ہوتی اور میٹرک پاس کرنے کے بعد اُس کی شادی ہوگئی ہوتی تو آج وہ بھی ایک دو بچوّں کی ماں ہوتی۔

نہیں۔ نہیں۔ میں اس کو نہیں دیکھونگا۔ میں اسے ذہن ہی سے نکال دونگا۔ میں اسٹیشن جا رہا ہوں۔ میری ممانی آرہی ہیں۔ ممانی ——— ممانی ——— سراج ممانی ———

ایک بچہ . . . . اِس کے چاروں طرف ایک دُھندھ سی اٹھ رہی ہے۔ ایک گھر جس کا کرنٹ فیوز ہو گیا ہے۔ تاریکی میں ڈوبی ایک چنگاری دمک رہی ہے . . . . . در و دیوار کا کچھ احساس سا اُجرتا ہے۔ ننھے ننھے روزن کھلتے ہیں۔ کچھ اشکال نمایاں ہوتی ہیں ———

ایک ماں ہے (مجھے علم ہے، شاید بچے کو بھی ہوگا) مگر اِس کا وجود کھو چکا ہے۔ عرصہ ہوا لا حاصل ہو چکا ہے۔ کبھی بے حاصل تھا۔ بے انتہا شدت سے، غالباً بے حد نا شدت سے (تب بچے کو علم نہیں تھا، احساس تھا مگر اب محض علم ہے) لیکن ایک دن ایک دم اِس ماں کا وجود لا حاصل ہو گیا ——— بے معنی ہو گیا ———

——— بچہ ایک دن چند عجیب الاشکال چیزوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ دیکھ کر، چھو کر، چکھ کر جاننے کی کوشش کر رہا تھا (بعد ازاں اُسے پتہ چلا اور بہت دیر کے بعد وہ بتانے کے قابل ہوا کہ یہ کھلونے تھے ——— ایک بندر، ایک کچھوا، ایک بطخ، ایک گھوڑا اور ایک گیند) اِن سب کی الگ الگ شکلیں تھیں جن کو وہ پہچاننے اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر ایک کا الگ الگ رنگ تھا۔ الگ الگ روپ تھا۔ اچانک وہ بطخ جسے وہ پکڑے ہوئے تھا اور جس کی گردن کو منہ میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر دُور جا پڑا۔ وہ اُس کے پیچھے لپکا۔ وہ اِسے دوبارہ پکڑنے ہی کو تھا کہ گیند اُس کی نظر کے رستے میں حائل ہو گئی۔ گیند کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھیوں میں، ننھی ننھی ہتھیلیوں میں، نرم نرم سی گدگدی مچلنے لگی۔ اور اُس نے جھٹ سے گیند دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔ وہ اپنی انگلیاں گیند میں گڑونے لگا۔ اِس کی گدراہٹ کی مٹھیاں بھرنے لگا . . . . . یہ نرم تھی مگر اس کا گداز کہاں گیا تھا؟ اس کی گرمی کہاں گئی تھی؟

اُسے اپنے پیٹ میں بائیں طرف ایک اُلجھن سی محسوس ہونے لگی۔ اُس کے من میں ایک گیند بس رہی تھی جو اس گیند کی طرح گول نہ تھی۔ جو نرم تھی گداز تھی اور گرم تھی جس کے لئے آنکھیں نہیں ہونٹ مچلتے تھے جس کے اوپر اس کے بیچ کی جو ایسی ایک چیز تھی جسے منہ میں ڈالتے ہی اس میں سے ایک ایسی چیز جھرنے لگتی تھی جیسی گیلی گیلی چیز اپنے منہ میں ہر وقت موجود

رہتی تھی مگر اس کے برعکس کس قدر لذت آفریں (اب تو مجھے معلوم ہے اِسے دودھ کہتے ہیں) اور پیٹ کی اینٹھن کو یہ کس طرح شانت کر دیتی تھی۔

اینٹھن نے ایک اور انگڑائی اُس کے پیٹ میں لی۔ اُس کے ہونٹ مچل اُٹھے۔ دونوں گیندوں کا فرق مٹ گیا تھا۔ اُس نے گیند ہونٹوں میں دبا لی اور ربڑ کی چوچی تلاش کرنے لگا۔ ہونٹ بھٹکتے رہے بھٹکتے رہے۔ چوچی اُسے نہ ملی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا، پھیکا پھیکا، بے جان سا ذائقہ اُس کی زبان پر گھل گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا یہ وہ گیند نہ تھی۔ اس کے تیز رنگ اُس کی آنکھوں میں کھٹک رہے تھے۔ اُس نے گیند پھینک دی۔

اینٹھن ایک ٹیس بن کر پیٹ میں مچلی۔ دل پر جیسے ایک چٹکی بھری گئی۔ ایک غبار سا سینے سے اُٹھا اور دماغ پر چھا گیا اور پھر آنکھوں میں اُتر آیا ———

——— اور بچہ ایک دم رونے لگا۔

اور پھر وہ شدید طور پر حاصل اور پُر معنی وجود بھاگا آیا۔ (بعد ازاں اُسے سکھایا گیا کہ یہ ماں ہے، اِسے امی کہنا چاہیے) بچہ اس کی پھرتی پر حیران رہ گیا۔ کافی عرصے کے بعد یہ پھرتی اُس کے دیکھنے میں آئی تھی ایک ثانیہ کے لیے رونا اُس کے حلق میں اٹک گیا۔ مشکوک نظر سے اُس نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اُس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ لمبوتری سی سخت اور گرم گرم چیز جس کے منہ پر ربڑ کی چوچی معمول سے زیادہ لمبی گول اور موٹی ہوتی ہے (اور جو نرم تو ہوتی ہے مگر رسیلی اور گداز نہیں) اُس کے منہ میں ٹھونسی گئی تو وہ مدافعت کرے گا۔ وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ اس سے پیٹ کی اینٹھن تو بند ہو جاتی ہے مگر یہ اینٹھن کسک بن کر، ہلکی ہلکی سُلگتی بن کر دل میں جا بیٹھتی ہے۔ اور پھر اس میں وہ لُطف، وہ ذائقہ بھی نہیں ہوتا جو گیند والی ربڑ کی چوچی میں سے جھرنے والے رقیق میں ہوتا ہے۔ (میرا خیال ہے کچھ اِسی قسم کے احساس تھے مگر اب تو مجھے دونوں اقسام کے دودھ کا ذائقہ بھول چکا ہے)

لیکن بچے نے سُکھ کا سانس لیا۔ ماں کے چہرے پر مسکراہٹ تھی (اُس کے ہاتھ میں دودھ کی فیڈر بوتل نہ تھی) یک لخت اُسے احساس ہوا کہ وہ رونا بھول گیا ہے۔ اور اگر وہ یونہی خاموش رہا تو عین ممکن ہے کہ ماں واپس چلی جائے۔ اور

——— اور بچے نے پھر رونا شروع کر دیا۔

ماں نے آگے بڑھ کر بچے کو اُٹھا لیا۔ اُس کے منہ سے پچکارنے اور بہلانے کے بول نکل رہے تھے۔ بچے نے محسوس کیا کہ اِن بولوں میں کچھ اجنبی سا رنگ ملا ہوا تھا مگر اُس نے اِس کی طرف دھیان نہ دیا۔ وہ اُس کپڑے کو کھینچنے لگا جس کے نیچے اُسے معلوم تھا کہ وہ گیند چھپے ہوئے ہیں جو پیٹ کی اینٹھن بھی مٹا دیتے ہیں اور دل کی کسک بھی۔

ماں نے کپڑا اُس کے ننھے ننھے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ وہ مچلنے ہی لگا تھا کہ ماں نے کپڑا اوپر سرکا لیا۔ ابھی وہ اِس نوازشانہ پھرتی پر حیران ہی ہونے والا تھا کہ اُس کی نظر چھلتے چھلکتے گیندوں پر پڑی بے صبری سے وہ ان کی طرف لپکا۔ ایک جھلک میں اُسے خیال آیا کہ ربڑ کی چوچی اور اس کے اردگرد کے ہالے کا رنگ کچھ بدلا ہوا تھا (میں دیکھ سکتا ہوں۔ ہلکے نسواری کی بجائے اِن کا رنگ سیاہ ہو رہا تھا) لیکن پیٹ کی اینٹھن اور دل کی کسک نے اُسے بے تاب کر دیا۔ اُس نے جھٹ ربڑ کی

چونچ ہونٹوں میں دبالی۔

یہ کیا —————؟ جان بخش سپاری کی بجائے ایک جان لیوا کڑواہٹ اُس کے منہ میں گھلنے لگی۔ اُس نے منہ گیند پر سے ہٹا لیا۔ زبان کے ساتھ وہ اِس کڑواہٹ کو ہونٹوں سے باہر دھکیلنے لگا۔ لعاب اُس کی ٹھوڑی کی طرف بہہ نکلا (ابھی اُس نے تھوکنا نہیں سیکھا تھا) مگر کڑواہٹ اور زیادہ تیز ہو گئی۔ اُس نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں فتحمندی کی چمک۔ ماں نے گیند بچے کی طرف بڑھائی ——— یہ آج اِس قدر سخاوت کیوں ———؟

اُس نے دیکھا دونوں گیندوں کا رنگ کس قدر قابلِ نفرت ہو رہا تھا۔ اُسے یاد آیا یہ کڑواہٹ ان ہی میں سے رِس کر اُس کے منہ میں آئی تھی۔ اُس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں گیند کو پیچھے دھکیل دیا۔ ماں نے اُس کے ساتھ ضرور کوئی شرارت کی تھی۔ ایک دھچکا سا اُس کے دل کو لگا۔ کڑواہٹ سارے منہ میں بھر گئی۔ اور وہ زور زور سے چلّانے لگا۔

ماں نے اُسے گود میں لینے اور بہلانے پھسلانے کی کافی کوشش کی مگر بچہ مچل مچل کر اُس کے ہاتھ سے نکل نکل گیا۔

اُس کا رونا تیز ہوتا گیا اور چلانا بلند تر۔

اور پھر اِس منظر میں باپ وارد ہوا (مجھے علم ہے وہ باپ تھا ——— ڈیڈی ——— مگر بچے کو اس وقت علم نہیں تھا) اس کا وجود دو گونہ تھا۔ نگہ نہایت غیر متوازن طور پر پُر معنی۔ یہ وجود بے حد خوفناک تھا اور سہم آلود کبھی کبھار نرم اور ملائم اور اکثر فیاض (وہ بہت سی چیزیں دیتا تھا، دلچسپ اور مزیدار، جن میں کھلونے بھی ہوتے تھے) لیکن زیادہ تر اُس کی آواز میں ناراضگی اور خفگی ہوتی تھی — اور اس آواز کو سن کر بچے کا دل اکثر ماں کے اُس کپڑے کے نیچے چھپ جانے کو چاہنے لگتا۔ جہاں وہ جان بخش گیندیں چھپی رہتی تھیں۔

باپ ماں سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ شاید اُسی کے رونے کے متعلق۔ اس وقت بھی اُس کی آواز میں کرختگی تھی مگر اس بار اِس کرخت آواز کو سن کر ننھے کا دل ماں کی طرف مائل نہ ہوا کیونکہ ماں ایک عجیب چالاک سی ہنسی ہنستے ہوئے باپ کو کچھ بتا رہی تھی اور اس میں ایک دبا دبا سا لطف بھی لیتی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا مفہوم بچہ سمجھ نہ پایا مگر باپ کی اتنی بات وہ ضرور بھانپ گیا تھا: پڑا رونے دے تھک کر خود ہی چپ ہو جائے گا۔

اور یہ مفہوم کانٹے کی طرح ننھے کے دل میں چبھ گیا اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔

اِس وقت ایک اور شخصیت نمودار ہوئی جس کا وجود ابھی تک محض ضمنی ہی رہا تھا۔ اُس نے بچے کو بچکار [illegible] کی طرف بڑھانے اور ساتھ ہی اُس بچے نے محسوس کیا، اُس نے ماں اور باپ کو جھاڑ جھپٹ کی اور ڈانٹ پلائی۔ خاموشی سے ڈانٹ سنتے رہے ——— اور جب اُس نے بچے کو بچکارا تو یہ بے سہارا بچہ اسے [illegible] میں چلا گیا۔ اس کے بعد [illegible] وجود [illegible] بنتا گیا۔

[illegible]

[illegible] سامنے آئی [illegible] ان کی [illegible]

[illegible] کڑواہٹ گھلنے لگی [illegible]

[illegible] گیندیں [illegible] ماں [illegible]

گیا اور دادی اماں (یہی وہ ضمنی شخصیت تھی) کا وجود بامعنی ہوتا گیا۔ اور آخر سب سے زیادہ پُرمعنی ہو گیا۔

بچہ اب دادی اماں کے ہاتھ سے ہی دودھ پیتا۔ اُن ہی کے ہاتھ سے کھانا (دادی امّاں نے اب اُسے تھوڑا تھوڑا کھلانا بھی شروع کر دیا تھا) اُن ہی کی گود میں کھیلتا اور رات کو اُن ہی کے ساتھ سوتا۔ ماں اور باپ جب کبھی اُسے زبردستی گود میں لے بیٹھتے تو اپنی جسمانی بے بضاعتی کی وجہ سے چاروناچار وہاں ٹکا رہتا مگر جوں ہی اُن کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوتی وہ بھاگ نکلتا۔

یہ تھا ماحول جس میں ممانی کا وجود پہلے پہل وارد ہوا تھا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ وارد نہیں ہوا تھا۔ پہلے تو یہ محض متعارف ہوا تھا۔ گھر بھر میں اُس کی باتیں ہوتی تھیں۔ باتیں جو منافقانہ تھیں (ماموں نے اپنی مرضی اور پسند سے گھر بھر میں کسی کو بتائے بغیر ممانی کے ساتھ شادی کر لی تھی اور اس طرح یہاں صدیوں کی مریادا کو بھنگ کیا تھا۔ وہاں خاندان کے بزرگوں کے روایتی تقدس کو بھی پامال کیے تھے۔ مگر مزے کی بات ہے کہ بُرا سب ممانی کو کہتے تھے) سبھی لوگ پریشان تھے کہ ماموں اب ممانی کو ساتھ لے کر گھر آنے والے تھے۔

بچے نے خیال کیا (منافقانہ باتوں سے) کہ ممانی جب یہاں آئے گی تو سبھی لوگ دھکے مار مار کر اُسے باہر نکال دیں گے لیکن جب وہ آئی تو بچہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بجائے باہر نکالنے کے سبھی لوگ اُس کا سواگت کر رہے تھے۔ ممانی نے اُسے گود میں لینا چاہا تو وہ سمٹ کر دُور ہو گیا۔ سبھی لوگ چور نظروں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر ماموں اور ممانی کی خاطر داری کرتے، اُس کی تعریفیں کرتے، صدقے اُتارتے اور بلائیں لیتے جا رہے تھے۔

اب جو ممانی نے اُسے بلایا تو بچہ اُس کی گود میں چلا گیا اُسے بے ضرر سمجھتے ہوئے۔ اُسی قسم کے احساس اور رویے کے ساتھ جس قسم کے احساس اور رویے کے ساتھ سبھی لوگ اُس کی خاطر تواضع کر رہے تھے۔

اور پھر ماموں اور ممانی ساتھ والے مکان میں رہنے لگے جس کا آنگن اس گھر کے ساتھ مشترک تھا۔ اس وقت تک ممانی کا، یہ وجود توجیہا تھا مگر غیر متعلق سا۔

پھر یہ وجود متعلق کب ہوا تھا؟ ہوا تو ضرور تھا۔

دُھند۔ پھر چھانے لگی ہے اور پھر ایک دم جیسے دھوپ نکل آئی ہو۔ ہر چیز پوری طرح نمایاں ہو گئی ہے۔

ایک اسپیشل ٹرین ہندوستان بھر کے تیرتھ استھانوں کی یاترا کو جا رہی تھی دادی اماں کا ارادہ بھی اس میں جانے کا ہو گیا تھا۔ ننھے نے ضد کی کہ وہ بھی ساتھ جائے گا ورنہ دادی اماں کو بھی جانے نہیں دے گا۔ اور پھر سب رضامند ہو گئے کہ ہاں، وہ بھی دادی اماں کے ساتھ جائے گا۔ ننھا بے حد خوش تھا۔

...... گاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ ایک برتھ پر دادی اماں کا بستر بچھ رہا تھا۔ دادی امّاں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں۔ بچہ اُن کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ خوشی سے چہک رہا تھا۔ امّی اور ڈیڈی دونوں پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑکی میں سے جھانک جھانک کر دادی اماں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کرتے کہ اِن باتوں کے کِنائے ننھے کی سمجھ نہ آتے۔

ڈیڈی نے ایک دو بار اُسے باہر آنے کے لیے کہا تھا مگر وہ احتیاطاً ہی باہر نہیں گیا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ گاڑی

چلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی - ایک بے تابی بار بار بچے کے دل میں سر اُٹھاتی : گاڑی اب چلتی کیوں نہیں، اُس نے کئی بار امّی سے، ڈیڈی سے اور دادی اماں سے دریافت کیا تھا - ہر بار اُنھوں نے کہا تھا : جب ساری سواریاں آجائیں گی تب چلے گی -

بچہ کھڑکی سے باہر غیر معمولی بھیڑ کو دیکھنے لگا (پیشتر ازیں بھی وہ ایک دو بار گاڑی کے چھوٹے موٹے سفر کر چکا تھا) اس نے اب محسوس کیا کہ ڈیڈی اور امّی کچھ فکر مند ہو رہے تھے - مگر آنے والے سفر کے جوش میں اُس نے زیادہ خیال نہ کیا - اور پھر ڈیڈی بڑی نرمی اور گھلاوٹ کے ساتھ اُسی سے باتیں کرنے لگے - بہت سی باتیں میٹھی میٹھی باتیں - وہ بہت مہربان نظر آرہے تھے - بچہ خوش تھا کیونکہ جب کبھی وہ اِس طرح مہربان ہوتے تو بچے کو اچھے لگنے لگتے - کیونکہ اس کے بعد وہ اُسے کئی طرح کی چیزیں دلاتے تھے -

کھڑکی کے سامنے ایک ریڑھی والا آکھڑا ہوا - ریڑھی میں بہت سے کھلونے تھے - ایک کوک والے کھلونے نے بچے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی - یہ ایک جھولا تھا جس میں ایک ننھا منّا بازیگر جھولا جھولتے ہوئے قلا بازیاں لگا رہا تھا - بچے کا جی للچانے لگا -

" ننھے ! کھلونے لوگے ؟ " ڈیڈی نے پوچھا -

" ہاں ! "

" تو آؤ دلائیں "

اور بچہ بڑھے ہوئے بازوؤں میں چلا گیا - ڈیڈی اُسے ریڑھی کے قریب لے گئے اور اُس سے کھلونے پسند کرنے کے لیے کہا - بازیگر اُس نے پسند کیا - ڈیڈی نے وہ دلا دیا -

اِس وقت ریل گاڑی نے ایک دم چیخ ماری - بچہ چونک اُٹھا - مڑ کر اُس نے گاڑی کی طرف دیکھا - گاڑی بدستور کھڑی تھی - ڈیڈی نے اُس کی توجہ پھر کھلونوں کی طرف لگا دی -

گاڑی نے پھر چیخ ماری - ڈیڈی اُسے کھلونے اُٹھا اُٹھا کر دکھانے لگے - بچے نے مڑ کر دیکھا گاڑی چلنے لگی تھی - ایک دھچکا اُس کے دل کو لگا - کھلونے اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑے -

" دادی اماں ! " وہ بازو پھیلا کر تڑپا - مگر ڈیڈی نے اُسے مضبوطی سے تھامے رکھا -

گاڑی تیز ہوگئی -

" دادی اماں ، دادی اماں ! " اُس نے پکارا - گاڑی کے پہیے جیسے اُس کے دل پر سے گذر رہے تھے - دادی اماں نے سر کھڑکی میں سے نکالا - ڈیڈی نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ سر اندر کر لے - دادی اماں نے سر اندر کر لیا -

" ڈیڈی ! امّی ——— ؟ "

[تم لوگوں نے میرے ساتھ فریب کیا ، میرے ساتھ زبردستی کی]

اور بچہ زور زور سے رونے لگا - بازو پھیلائے وہ چلانے لگا " دادی اماں ، دادی اماں ، دادی اماں ...... ! "

گاڑی تیز ہوتی گئی، اور تیز، اور تیز ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہوگئی (اب کوئی اُمید نہ رہی تھی)
ایک سسکی، گہری سسکی بچے کے سینے سے اُٹھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

[دادی اماں تم نے بھی میرے ساتھ دھوکا کیا —— تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا دادی اماں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔]
۔ ۔ ۔ ۔ سبھی لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ زیادتی کرتے ہیں۔ کرتے رہیں۔ کرتے رہیں۔ لیکن میں اب نہیں روؤں گا۔ نہیں روؤں گا۔ نہیں روؤنگا یہ لوگ جو جی چاہے کریں۔ میں ان کی ایک نہیں مانونگا۔
میں کچھ کھاؤنگا نہیں۔ پیونگا نہیں —— کسی سے نہیں بولونگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور بچہ خاموش ہوگیا۔

امی نے اُسے کھانا دیا۔ اُس نے کھایا نہیں۔ امی نے اُسے دودھ دیا۔ اُس نے پینے سے انکار کردیا۔ ڈیڈی نے اُسے کھلونے دیئے۔ اُس نے چھوئے تک نہ۔ رات کو امی نے اُسے اپنے ساتھ سلایا۔ امی سوگئیں تو وہ اُٹھ کر زمین پر لیٹ گیا (یہ سمجھتے کیا ہیں آخر!) اور وہیں پڑا پڑا سوگیا۔ دوسرے دن ڈیڈی نے اُسے اپنے ساتھ سلایا۔ رات اُس نے پھر ایسے ہی کیا اور ڈیڈی نے اُسے الگ چارپائی پر سلا دیا۔ اور وہ سویا رہا (میں اپنی تنہائی کے ساتھ ہی سوؤنگا)

امی اُسے نہلائیں وہ چپکے سے نہا لیتا (پہلے کی طرح رونا اور شور نہ مچاتا) امی اُس کی کنگھی کرتیں۔ وہ دم سادھے کنگھی کروا لیتا۔ وہ منہ پر لگاتیں۔ وہ چپ چاپ پڑا رہتا۔ وہ اُس کے کپڑے بدلتیں وہ خاموشی سے کپڑے بدلوا لیتا ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر چپ چاپ کسی کونے میں، کسی تنہا جگہ پر جا بیٹھتا اور بے معنی نظروں سے ہر چیز کو گھورتا رہتا۔ جیسے سبھی کچھ اجنبی تھا۔ امی اور ڈیڈی اُسے اُٹھا کر اپنی گود میں لے لیتے تو وہ منمنانے لگتا اور اُن کی گرفت سے نکل کر دُور جا بیٹھتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسی طرح وہ بیٹھا تھا برآمدے کے زینے پر، نہایا دھویا، بنا سنورا۔ اور اُس کے قریب پڑا تھا دلیے کا وہ پیالہ جو امی نے اُسے دیا تھا اور جسے اُس نے چھوا تک نہ تھا۔ اور ہار کر امی اُسے وہیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اُس کے پیٹ میں جیسے کوئی دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔ مگر وہ پیٹ کو کہنیوں سے دبائے بیٹھا تھا۔

ممانی وہاں آئیں اور امی سے ننھے کا حال پوچھا۔ امی نے حال بتایا اور کہا کہ ننھا روٹھا ہوا ہے اور کسی طرح نہیں مانتا (اور ننھے کو پتہ چلا کہ یہ سارا وطیرہ جو اُس نے اختیار کر رکھا ہے۔ اِسے روٹھنا کہتے ہیں) اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہرگز ہرگز نہیں منے گا۔

ممانی اُس کے پاس آئی اور پچکار کر اُسے گود میں لینا چاہا۔ مگر وہ منمنایا اور تلملا کر اُس کے بازوؤں سے نکل گیا۔ ممانی نے گہری نظروں سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر اُس کے پاس بیٹھ کر اُسے پیار کرنے لگی۔ اُسے بہلاتے ہوئے کہنے لگی: یہ امی بہت بُری ہیں اور ڈیڈی بھی۔ تم میرے بیٹے بن جاؤ۔ اِن کے پاس مت رہو۔ آؤ تم میرے ساتھ چلو، میرے گھر چلو، میرا بیٹا بن کر میرے ساتھ رہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور بچے کے ضبط کا بندھ ٹوٹ گیا۔

ممانی نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ اب کے وہ چپ چاپ چلا گیا (یہ وجود بے حد متعلق ہوگیا تھا) ممانی اُسے اپنے گھر لے گئی۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر اُس نے ننھے کو اپنے زانوؤں میں دبا لیا۔ اُس کے آنسو پونچھے۔ بہلایا، چپ کرایا۔ بڑے دُلار کے ساتھ ایک ننھے سے چمچے کے ساتھ اُسے فیرنی کھلائی اور پھر اُسے اپنے ساتھ لگا کر پیار کرنے لگیں۔

ممانی نے اسے لوریاں سنائیں۔ ننھے کی "گھوڑیاں" گائیں۔ اور ننھا ہچکیاں لیتا اُس کے زانوؤں میں دبا اُس کے ساتھ لگ کر سوگیا۔ نیم خوابیدہ حالت میں وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کا سر ......

ٹیکسی رک گئی ہے۔ ڈرائیور دروازہ کھولے مؤدب کھڑا ہے کہ میں باہر نکلوں۔ گاڑی پہنچ چکی ہے۔ مسافروں کی بھیڑ اسٹیشن کی ڈیوڑھی میں سے برآمد ہو رہی ہے۔ اندر جانا فضول سمجھ کر میں ڈیوڑھی میں ہی ممانی کو تلاش کرنے لگتا ہوں۔ اچانک کوئی میرا بازو تھام لیتا ہے۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ یہ ممانی ہے۔ میں اُس کے پاؤں کی طرف جھکتا ہوں۔ وہ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر پھر جھٹ مجھے سیدھا کرتی ہے اور پھر سینے سے لگا لیتی ہے۔

ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ ممانی مجھ سے سب کی خیر خیریت پوچھ رہی ہے۔ ایک جھٹکا سا لگتا ہے۔ (ٹیکسی بڑے آرام سے چلی جا رہی ہے)

گھر کے پھاٹک پر وہ کھڑی ہے —— میری بیوی اور ...... اور ...... وہی ...... وہی پڑوسن۔ لفٹ ایک دم پانچویں منزل نیچے اُترنے لگی ہے۔ اُف میرے خدا! مجھے کیا ہوا جا رہا ہے۔ مجھے صاف صاف بیوی سے کہہ دینا پڑے گا کہ وہ اس طرح پڑوسن کو ساتھ لے کر گیٹ پر کھڑی نہ ہوا کرے۔

"ٹیکسی، روکو!"

ٹیکسی رک گئی ہے۔ ممانی اور میں باہر نکلتے ہیں۔ نوکر سامان اندر لے جا رہا ہے۔ ممانی میری بیوی سے گلے لگ کر ملتی ہے۔ میری بیوی ممانی سے پڑوسن کا تعارف کراتی ہے۔ میں غور سے دونوں کو دیکھتا ہوں۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ جاتا ہے۔

اُف میرے خدا! پڑوسن کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی جگہ اگر ممانی کی بڑی بڑی آنکھیں لگا دی جائیں۔ تو وہ بالکل، ہو بہو ویسی لگنے لگے جیسی ممانی اُن دنوں لگتی تھیں۔ جب اُنھوں نے مجھے ایک ننھے سے بچے کو اپنے زانوؤں میں دبا کر اور سر کو اپنے پیٹ کے ساتھ بھینچ کر رونے بسورنے کو چپ کرایا تھا ——

کُتّے

عرشِ صدیقی

لڑکیاں گھر شادی ہونے پر چھوڑتی ہیں لیکن پروین کو اپنا، اپنے پیارے پاپا کا گھر پاپا کے اس دنیا سے روٹھ جانے پر چھوڑنا پڑا۔ یہ کوئی شادی تو نہ تھی کہ ماں باپ کے گھر سے رخصت ہوتے وقت وہ قیمتی جہیز ساتھ لے کر جاتی۔ اس کا اُسے ہوش ہی کب تھا ——— مگر ڈولی اُسے اتنی عزیز تھی، اس قدر پیاری تھی کہ جب وہ چچا کے گھر پہنچی تو ڈولی اس کے ساتھ اس کی گود میں تھی۔

اب اِس واقعہ کو دس ماہ ہونے کو آئے تھے۔

ممی تو اسے قطعاً یاد نہیں تھیں۔ ماں باپ کی یہ اکلوتی بچی ابھی دو برس کی بھی نہ ہوئی تھی کہ ممی اِس جہانِ فانی سے بہت دور جا بسی تھیں۔ ہاں ممی کا ذکر اس نے بارہا سنا تھا۔ پاپا اکثر اُن کی تسبیح پڑھا کرتے تھے اور گھر کی پرانی خادمہ اُن کے ذکر سے کبھی نہ تھکتی تھی۔ ان کی کتنی ہی تصویریں پاپا کے البم میں محفوظ تھیں اور وہ دو بڑے سائز کی تصویریں جو پاپا نے اپنے کمرے میں سجا رکھی تھیں اتنی پیاری تھیں کہ دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہو۔ پروین نے بارہا چاہا کہ ممی کی اِن تصویروں میں جان پیدا ہو جائے مگر یہ کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ تصویر بہرحال تصویر ہے۔ اِس میں رنگ ہو سکتا ہے، حسن ہو سکتا ہے، زندگی تو نہیں ہو سکتی۔ تصویر کی انتہائی تعریف یہ ہے کہ یہ تصویر تو بس جیسے مُنہ سے بولنے لگی۔ ہے گویا اصل تعریف یہاں بھی زندگی کی حرکت کی ہے رنگوں کی نہیں کہ محض رنگ تو بے جان چیزیں ہیں۔

اُس شے کا غم جو اپنی ہونے کے باوجود کبھی اپنے قبضے میں نہ رہی ہو اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا اس شے کے چھن جانے کا ہوتا ہے جو برسوں اپنے پاس رہ چکی ہو اور دل کو بے حد عزیز بھی ہو۔ بچہ بے جان کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ چند لمحے یا چند دن اِن کو اپنے پاس رکھتا ہے تو ان سے اس قدر مانوس ہو جاتا ہے کہ کسی کھلونے کے ٹوٹ جانے یا گم ہو جانے پر وہ گھنٹوں بلک بلک کر روتا ہے۔ ماں کو تو یوں سمجھو کہ پروین نے دیکھا ہی نہ تھا کیونکہ دو سال کی بچی کو کیا یاد رہ سکتا ہے کہ اس کی ماں کون تھی، کیسی تھی۔ لیکن پاپا تو ایک عمر اس کے ساتھ رہے تھے۔ ان کے جانے کا جس قدر بھی غم ہوتا، کم تھا۔

وہ چچا کے گھر آئی تو پاپا کی موت کا روح فرسا منظر اپنے ذہن میں محفوظ لائی تھی۔ گھر بھر میں کہرام مچا تھا۔ یہ اس کی باقاعدہ زندگی کا اولین اور عظیم ترین صدمہ تھا اور اب اس کے بعد کوئی اور صدمہ، صدمہ نہ تھا۔ جب لوگ اس کے پیارے پاپا کو کندھوں پر اٹھائے لیے جا رہے تھے تو اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اُس کے آرام سکھ اور چین کا جنازہ لیے جا رہے ہوں۔

گھر کی حالت بالکل ابتر تھی۔ وہاں سوائے اس کے اور اس کی پرانی آیا کے اور کون تھا جو گھر کا خیال رکھتا مگر پروین کو اس

بات کا ہوش ہی کہاں تھا۔ پھوپھی روتی دھوتی آئی تھیں مگر جلد ہی شاید اس خیال سے کہ گمشدہ چیزوں کا غم کرنا بے کار ہے خود کو سنبھال کر موجودہ اشیا میں دلچسپی لینے لگیں اور قبل ازیں کہ کوئی گھر کی طرف دھیان دینے کے قابل ہو، سلائی کی دونوں مشینیں، ریڈیو، چاندی کا پاندان اور وہ ڈنر سیٹ جو پروین کے پاپا نے ابھی ابھی منگوایا تھا اور جو ابھی استعمال میں بھی نہ آیا تھا، اپنے ہاں چلتا کیے ——
خالہ ذرا دیر سے پہنچیں۔ جہاں دیدہ عورت تھیں۔ سمجھ گئیں کہ پروین کی پھوپھی کوئی کارِ نمایاں سرانجام دے چکی ہیں۔ صاف صاف کہنا مناسب نہ سمجھا اس لیے جملہ عورتوں کو اکٹھا کر کے عربی کے الفاظ سے پُر اردو میں ایک تقریر کی جس میں دُنیا کی بے ثباتی کے احوال کے بعد انھوں نے بتایا کہ یتیم بچوں کے مال کو ہاتھ لگانا حرام ہے —— اور پھر انھوں نے بغیر کسی چیز کو ہاتھ لگائے ملازمہ کے ذریعے اپنی بہن کے تمام قیمتی ملبوسات و زیورات اپنے گھر پہنچا دیے۔ ان کا جواز یہ تھا کہ ان کے بہنوئی کے خاندان کے لوگ ان کی بہن سے متنفر تھے اس لیے صرف وہ خود ہی اس قابل تھیں کہ بہن کی یادگاروں کی حفاظت کر سکیں۔ کہتے ہیں کہ جب بھی انھیں اپنی بہن یاد آتی وہ اس کے ملبوسات و زیورات زیبِ تن کر کے سہیلیوں سے ملنے چلی جاتیں تاکہ غم غلط ہو جائے اور یہ یاد ان کو اکثر ستاتی رہتی تھی۔

پروین بظاہر سب کچھ دیکھ رہی تھی لیکن فی الحقیقت اس کی آنکھیں اور کان اور تمام دوسری حسیات پاپا کے خیال کے علاوہ ہر دوسرے خیال کے لیے مردہ ہو چکی تھیں۔ آنکھیں منتظر تھیں کہ وہ پھر چلتا پھرتا، ہنستا بولتا نظر آئے اور کان چاہتے تھے کہ "پاپو بیٹی" "چنو بیٹی" کہنے والے لب پھر صدا آشنا ہو جائیں!

خادمہ نے اُسے گھر کے حالات سے باخبر کرنا چاہا مگر اس عالمِ بے خبری سے رہائی اس کے بس کی بات نہ تھی۔

اس اثنا میں پروین کے چچا کو بھی اس سانحے کی اطلاع ہو چکی تھی۔ وہ دُور رہتے تھے۔ اس لیے ذرا دیر سے پہنچ سکے۔ اور گمشدہ بھائی کی قبر سے لپٹ لپٹ کر روتے رہے۔ اور جب انھوں نے پروین کو سینے سے لگایا تو ان کا ضبط جواب دے چکا تھا، عالم اُسے بیان کرنے سے قاصر ہے۔ وہ آخر مرد تھے۔ انھوں نے خود کو سنبھالا اور پروین کو تسلی دینے لگے

پروین نے صرف سُن ہی رکھا تھا کہ اس کا ایک چچا ہے لیکن اُسے کبھی دیکھا نہ تھا۔ دونوں بھائی ایک د…
تھے اور آپس میں تعلقات بالکل منقطع تھے۔ اصل میں پروین کے پاپا نے ایک اجنبی عورت سے شادی کر لی تھی۔ خاندان …
مخالف تھے۔ چچا نے خاص طور پر بھائی کے اس اقدام کو بُرا محسوس کیا تھا۔ وہ دن تھا اور بڑے بھائی کی موت کا …
ایک دوسرے کا منہ نہیں دیکھا۔ پھوپھی بہن تھیں۔ کبھی کبھار مل لیتی تھیں اور اب کوئی سولہ برس کے بعد بھائی بھائی کے …
بلکہ بھائی کی بیٹی کو جو تنہا رہ گئی تھی۔ سہارا دینے۔ پروین نے جب چچا کو پہلی بار دیکھا اور اس کی زبان سے …
الفاظ سنے تو اسے یوں لگا جیسے پاپا پھر زندہ ہو گئے ہوں۔ لیکن یہ محض خیال تھا جو زیادہ دیر ساتھ نہ دے سکا۔ پاپا کی …
تلخ حقیقت تھی کہ اس سے توجہ ہٹانا ناممکن تھا۔

دو دن رک کر چچا نے بھائی کے تمام معاملات کو سمیٹا اور پروین کو لے کر اپنے گھر آ گئے۔

چچی کو پروین کے آرام کا بڑا خیال تھا۔ ان کے کوئی بیٹی نہ تھی صرف پانچ بیٹے تھے۔ چنانچہ انھوں نے …
اپنی وہ تمام محبت جو ابھی تک بیٹی کے ارمان میں محفوظ رکھی تھی اُسے سونپ دی۔ ان دونوں بزرگوں کی محبت کے زیرِ اثر پروین …
حد تک خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو ہی گئی —— لیکن پاپا ہر وقت اس کا محبوب ترین موضوع تھے۔ ادھر کسی نے ان کا ذکر …

اور اُدھر وہ ہمہ تن گوش ہوتی جیسے اس کو اپنا محبوب ترین موضوع مل گیا ہو۔

ممی کے انتقال کے بعد پاپا نے شادی نہ کرکے جو عظیم قربانی دی تھی اس کی عظمت کا احساس پروین کو ہو چکا تھا۔ پاپا صرف پاپا نہ تھے وہ تو اس کی ممی بھی تھے۔ بچپن کا زمانہ جو صرف پاپا کے زیر سایہ گذرا تھا اُسے خوب یاد تھا اور بچپن کے ان ماضی کے اوراق اُلٹتے رہنا ہی اس کا سب سے بڑا کام تھا۔

وہ چھوٹی سی تھی تو پاپا کے لائے ہوئے بے شمار کھلونوں سے کھیلتی رہتی تھی۔ بے جان کھلونے اس کا دل لبھاتے تو وہ کتنے پیارے پیارے لگتے تھے اور پھر کبھی کبھی ایک دم وہ اُداس بھی ہو جاتے تھے۔ پروین کو اس تبدیلی کے معنی اب سمجھ آ رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ مصلحے کی مرغی، چینی کی بلی یا لکڑی کے گھوڑے کو کہتی "بھاگو" اور وہ کھلونا ذرا بھی حرکت نہ کرتا تو اُسے بہت غصہ آتا۔ چینی کے کئی طوطے اس نے ہوا میں اُچھالنے کی کوشش میں توڑ دیئے۔ شاید وہ لاشعوری طور پر اس بات کی خواہشمند تھی کہ گھر کی خاموش فضا میں ایک ہنگامہ پیدا ہو جائے۔ اُسے باہر جاکر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ پاپا کا خیال تھا کہ یوں بچوں کا اخلاق بگڑ جاتا ہے۔ گھر میں ممی کے نہ ہونے کی وجہ سے خواتین اور لڑکیوں کی آمد تقریباً بالکل بند تھی۔ کبھی کبھی اس کی پھوپھی یا خالہ آجاتی تھیں۔ بس۔ ایسے میں ہمیشہ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے سب کھلونے، کبوتر، مرغ، گھوڑے بکرے، ہاتھی زندہ ہو کر اس کے ساتھ کھیلنے لگیں۔ بے جان کھلونوں سے بیزاری کا اظہار اس روز زیادہ ہوا جب پاپا نے اسے ایک زندہ بلی لا دی۔ اس کا نام اس نے "پسی" رکھ لیا کیونکہ کہانیوں میں اس نے یہی نام پڑھا تھا۔ اس کے لیے وہ ایک کھلونا تھی جس میں جان پڑ گئی ہو۔ وہ دوسرے کھلونوں کی طرح مردہ نہ تھی۔ اس میں زندگی کی حرارت تھی۔ جب وہ اس کو اپنی رانوں پر بٹھاتی تو وہ اپنی نرم اور گرم کمر اس کے پیٹ سے لگا دیتی۔ یہ اسے بہت بھلا لگتا۔ وہ خود بھی تو ایسے ہی پاپا کی گود میں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ پھر پاپا اس کے لیے پنجرے میں بند ایک طوطا بھی لے آئے۔ اب اس نے ایک بار پھر چاہا کہ اس کے باقی کھلونے بھی جاندار بن جائیں۔ اس نے انھیں مار مار کر حکم دیا "بولو، کھیلو، ادھر آؤ، اُدھر جاؤ" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر اس نے تمام کھلونے الماری میں اور آتشدان پر سجا دیئے۔ جیسے سب تصویریں ہوں، پیاری مگر بے جان، ممی کی تصویروں کی طرح!

لیکن وہ بے فکر نہ ہو سکی تھی بلکہ ان کھلونوں میں جان ڈالنے کے ذرائع سوچتی رہتی تھی۔ [illegible] ذکر کیا تو وہ [illegible] ہنسے اور پھر انھوں نے بتایا کہ جان [illegible] کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے اور جس سے چاہے چھین سکتا ہے۔ [illegible] سنتے ہی اس نے دیر تک خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ [illegible] تمام کھلونوں میں [illegible] جان پڑ جائے۔ [illegible] زندہ ہو کر [illegible] [illegible]

ایک روز یوں ہوا کہ طوطے کا پنجرہ کھلا رہ گیا اور [illegible]

[illegible] پھڑپھڑاہٹ سنی اور دوسرے ہی لمحہ دیکھا کہ وہ بے چارہ [illegible] کو بہت مارا۔ کئی دن وہ پسی سے ناراض رہی لیکن [illegible]

چوہا دانوں میں و باتے اس کے سامنے آموجود ہوتی۔ اب پروین کو پُسی سے سخت نفرت ہو گئی۔ اس نے پُسی کو خوب مارا اور گھر سے نکال دیا لیکن وہ پھر واپس چلی آئی مگر پروین کو اب اس کی معیت ہرگز گوارا نہ تھی۔ اس نے پاپا سے کہہ کر اسے کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں سے وہ پھر واپس نہ آسکی۔

پُسی سے جدائی کے بعد اس کی توجہ ایک بار پھر کھلونوں کی جانب مبذول ہوئی۔ لکڑی کا بنا ہوا اونچے کوہان والا اونٹ جو پاپا صرف چند روز پہلے لائے تھے کتنا پیارا تھا جیسے بس قدم اٹھانے ہی والا ہو۔ چینی کی بلی اور چوہے جو ساتھ ساتھ رکھے تھے، پُسی کی جلا وطنی کے بعد دُور دُور کر دیے گئے لیکن اس کے ذہن میں عجیب سا خوف کچھ یوں طاری رہا کہ چند ہی روز بعد اس نے بلی کو اٹھا کر گودام میں ڈال دیا —— بڑی مشکل یہ تھی کہ اب وہ اتنی چھوٹی نہ رہی تھی کہ بے جان کھلونوں سے بہل سکے۔ بالخصوص اپنے مرحوم طوطے اور پُسی کی معیت میں کچھ وقت گذار کر یہ بات مشکل تر ہو گئی تھی۔ کھلونوں میں اب اس کی توجہ کا سب سے بڑا مرکز آنکھیں گھمانے والی گڑیا تھی۔ گو اس کا جسم بے جان تھا مگر آنکھوں میں توجان تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی آنکھوں کی جان کو اس کے پورے جسم میں پھیلا دے گی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ خوراک پہلے پیٹ میں جاتی ہے اور وہاں سے جسم کے ہر حصے میں پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے طے کیا کہ گڑیا کی جان آنکھوں میں سے نکال کر اس کے پیٹ میں ڈال دے گی۔ لیکن اس کوشش میں گڑیا کی آنکھیں بھی بے جان ہو گئیں۔ گڑیا مر گئی اور وہ کئی روز تک اداس رہی۔

پاپا اس کے شوق کو پہچان گئے تھے۔ وہ اس کے لیے چابی سے چلنے والے کئی کھلونے لاتے۔ اسے یہ کھلونے بہت اچھے لگے اور یوں چند برس اور بیت گئے۔

پھر وہ وقت بھی آگیا جب کھلونوں سے کھیلنے کے دن بہت پیچھے رہ گئے اور چابی سے چلنے والی اور جاندار چیزوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو گیا۔ اب پاپا اس کے لیے ایک چھوٹا سا پیارا پلا لائے جو رفتہ رفتہ بڑا ہو کر ایک بڑی پیاری سی کتیا بن گیا۔ یہی ڈولی تھی۔ یہ نام اسے پاپا نے ہی دیا تھا۔ ڈولی پروین کو بے حد عزیز تھی۔ وہ اسے کم ہی نظروں سے اوجھل ہونے دیتی تھی —— اور اب تو یہ پاپا کی نشانی بن کر رہ گئی تھی اس لیے پاپا کی چھوڑی ہوئی چیزوں میں اسے وہ سب سے زیادہ پیار کرتی تھی۔

بچی کو جانوروں سے کوئی پیار نہ تھا لیکن سب سے بڑے بیٹے مجیب نے اسے کتوں کو برداشت کرنا ضرور سکھا دیا تھا۔ پروین سے اس نے کہا تھا "میرے مجو کو بھی کتوں سے بڑا پیار ہے" مجیب کو تو اس نے یوں کہا تھا جیسے مجو کوئی بچہ ہو۔

مجیب کو پیار سے مجو ہی کہا جاتا تھا۔ وہ فوج میں کپتان تھا اور صرف عید کے عید گھر آتا تھا۔ فوج سے باہر اس کا جی ذرا کم ہی لگتا تھا۔ عمر پچیس کے لگ بھگ تھی مگر ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ ماں کو اپنے کپتان بیٹے پر بڑا ناز تھا۔ اس کے خیال میں وہ ولی تھا ورنہ دوسرا بیٹا اسد ماں باپ کی اجازت کے بغیر ہی دو شادیاں پرانی بھی کر چکا تھا اور اب تیسری کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔ کپتان بیٹے کی ایک بہت بڑے سائز کی تصویر بڑے کمرے میں لگی تھی جس میں موٹے موٹے ہونٹوں، گھنی مونچھوں اور بھاری جسم والا کپتان مجیب دو السیشن کتوں کی زنجیریں تھامے وردی پہنے کھڑا تھا۔ کتے آگے کو زور مار رہے تھے اور زنجیریں لوہے کی سلاخوں کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دو السیشن کتے ایک بل ڈاگ کو گھسیٹنے کی بے کار کوشش کر رہے ہوں، یا جیسے پرانے یونان کا کوئی سورما، دو منہ زور گھوڑوں کی لگامیں تھامے رتھ پر کھڑا ہو۔

پروین جب اس گھر میں آئی تھی اس وقت صرف سب سے چھوٹا بیٹا سعید خضر ہی گھر پر تھا۔ اس کی عمر چوبیس برس کی تھی۔ وہ ماں کا بے حد لاڈلا تھا اور زیادہ وقت گھر پر ہی رہتا تھا۔ شاہزادوں کے ناز و انداز والا یہ البیلا نوجوان شاعر بھی تھا اور ابھی تک اپنے سپنوں کی شاہزادی کی تلاش میں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جہاں اس کا دل عشق کی تنویر کا گہوارہ تھا وہاں وہ بھٹکی ہوئی دنیا کیلیے خضر راہ بھی بن سکتا تھا۔ جبھی تو اس نے اپنا تخلص خضر رکھا تھا۔

پروین کو اس کی باتیں بہت بھلی لگتی تھیں اور وہ اس کی رفاقت میں خاصا سکون بھی پاتی تھی۔ وہ جب اپنے ارادوں کی نہایت کے دروازے اس پر کھولتا تو وہ ایسا محسوس کرتی جیسے باغ عدن سے عطر بیز ہواؤں کے جھونکے آ رہے ہوں۔ شکل و صورت کا وہ اتنا پیارا تھا کہ بارہا اُسے یہ گمان گزرا کہ اس کے بچپن کا کوئی گڈا جاندار ہو گیا ہے اور بڑا ہو کر سعید خضر بن گیا ہے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ بچپن کے اس کھلونے کو اُٹھا کر ہوا میں اُچھال دے مگر اس خیال پر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتی۔ اس کے سوا اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

اسد کپتان مجیب سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ یعنی کبھی کبھی وہ عید کی ملاقات بھی گول کر جاتا تھا۔

ان کے علاوہ چچی کے دو بیٹے اور تھے: افتخار اور امجد۔ افتخار افریقہ میں کوئی بڑا کاروبار کرتا تھا اور سال کے سال ایک اچھی بڑی رقم ماں کو روانہ کر دیتا تھا۔ وہ ہر سال آنے کا وعدہ کر کے بھول جاتا تھا۔ امجد سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بچپن سے ہی سب سے زیادہ لاڈلا رہا تھا اور اب جوانی میں بھی وہ کوئی فکر یا گھر کا کوئی کام کرنے کا قائل نہ تھا۔ اس لیے سب اس کو پیار سے امجد حرامخور کہتے تھے۔ وہ صرف باپ کے سر پر سیر و تفریح اور شکار کو ہی اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا تھا۔ پہاڑوں کی سیر اس کا محبوب مشغلہ تھا کیونکہ یوں سیر و تفریح اور شکار کے تمام لطف ایک ساتھ حاصل ہو جاتے تھے۔ وہ کسی تہوار پر گھر سے غیر حاضر نہیں رہتا تھا۔ اسے خوشی کی کسی تقریب کی اطلاع مل جاتی تو وہ جہاں بھی ہوتا سب کام چھوڑ کر اس تقریب میں شرکت کے لیے موجود ہوتا۔ اس کی بھی ایک تصویر بڑے کمرے میں آویزاں تھی۔ بندوق کی نالی کندھے کے عقب سے آ کر اس کے بائیں رخسار کو چھوتی ہوئی سر سے اوپر نکل گئی تھی۔ تصویر میں وہ بھی ڈولی کی طرح نرم و نازک سا لگا۔ اس نے ڈول کو گود میں لے کر بھینچا تو اسے تصویر پر ترس آنے لگا کہ کہیں بیچارہ بندوق اُٹھاتے اُٹھاتے تھک نہ جائے۔ اور پھر وہ مسکرا دی۔ اس کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ جو چیز یا بالخصوص جو شخص اسے پسند آتا وہ اس کا مقابلہ اپنے بچپن کے کسی کھلونے سے ضرور کرتی تھی اور یہ مقابلہ اسے اتنا دلچسپ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کبھی اس عادت کو ترک کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

پروین کو یہاں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ سعید خضر کو محسوس ہونے لگا جیسے اس کے اشعار ملک و قوم اور معاشرہ و سیاست کے موضوعات سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور غزل کی وہ پرانی روایت جسے اس نے فرسودہ اور بے کار سمجھ کر درخور اعتنا نہ سمجھا تھا اس کے ذہن اور قلم پر قبضہ کئے جا رہی تھی۔ اسے پیانو بجانا خوب آتا تھا لیکن اب سے پہلے وہ پیانو پر صرف غالب کی غزلیں گایا کرتا تھا کیونکہ اس کی اپنی نظمیں ایک خاص مقصد کے تحت لکھی گئی تھیں جن کا پیانو پر گائے جانا ممکن نہ تھا۔ مگر اب وہ غزلیں کہتا تھا اور اپنی ہی غزلیں پیانو پر گاتا تھا۔ کئی بار اُسے یوں بھی محسوس ہوا کہ اگر وہ اپنی تازہ غزل پیانو پر نہیں گائے گا تو پاگل ہو جائے گا اور اُسے یہ بوجھ ہلکا کرنا ہی پڑتا تھا۔ دل میں وہ جانتا تھا کہ وہ غزلیں پیانو پر کیوں گاتا ہے، کہ اس کی توجہ معاشرتی موضوعات سے کیوں ہٹ گئی ہے اور کہ اب اس کے قلم پر کس کی حکمرانی ہے لیکن وہ کوئی بات کہتے ہوئے ڈرتا تھا یہ ڈر بھی رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ آخر میں

نے اپنے جی میں ایک فیصلہ کیا اور موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔

پروین کو خضر بھلا لگتا تھا مگر صرف ایک کھلونے کی طرح جسے اُٹھا کر طاق پر یا آتشدان پر رکھ کر دُور سے ہی دیکھا جا سکے اس کے لیے وہ ڈولی سے کم اہم تھا۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ وقت گذرتا بھی اسی کے ساتھ تھا کیونکہ وہ زیادہ گھر پر ہی رہتا تھا۔ وہ اکٹھے ناشتہ کرتے تھے۔ اکٹھے کھانا کھاتے تھے اور ایک دوسرے کو لطیفے سناتے تھے۔ پروین اس کے چھوٹے موٹے کام بھی بخوشی کر دیتی تھی لیکن جب بھی اس نے ڈولی کو اپنے ساتھ کہیں لے جانے کی خواہش ظاہر کی پروین راضی نہ ہوئی۔ ڈولی سے اس کو اتنا پیار کیوں تھا یہ جاننا اب کچھ مشکل نہیں رہا۔ گذشتہ واقعات نے اسے باپ کی طرح عزیز بنا دیا تھا۔ ایک بار اس کے انکار پر سعید بہت رنجیدہ ہوا۔ پروین کو ترس آ گیا اور اس نے ڈرتے ڈرتے ڈولی کو اس کے ہمراہ بھیج دیا۔ ڈولی تو چلی گئی لیکن وہ خود متفکر ہو گئی۔ وہ بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتی یوں جیسے کوئی ماں اپنے ننھے بچے کے لیے فکرمند ہو جاتی ہے جو تنہا باہر نکل گیا ہو۔ آخر خضر واپس آ گیا۔ پروین نے دیکھا کہ وہ خونخوار سے کتے دُور کھڑے ڈولی کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے اسے کھا جانا چاہتے ہوں ——— سعید خضر پر پروین کی بے چینی واضح ہو گئی تو اس نے پھر کبھی ڈولی کو پروین سے جدا کرنے کی خواہش نہیں کی۔ اور شاید اب اسے یہ رعایت دوبارہ مل بھی نہ سکتی کیونکہ پروین کو ڈر تھا کہ کہیں وہ کتے ڈولی کی جان بھی یوں نہ نکال دیں جیسے اس نے بچپن میں اپنی گھومتی آنکھوں والی گڑیا کی جان نکال دی تھی۔

عید قریب تھی۔ پروین کو اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ وہ دوسرے بھائیوں سے بھی ملے گی۔ اسے اپنے بھائیوں سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے وہ گیت سنے تھے جن میں بہنیں اپنے بھائیوں سے پیار کا اظہار کرتی ہیں، ایسی کہانیاں پڑھی تھیں جن میں بھائی بہنوں کی سب سے بڑی خوشی بن جاتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کا بھی کوئی بھائی ہوتا اور اب جو ایکدم کئی بھائی ملے تھے تو وہ بڑی خوش تھی۔

ایک روز وہ کپتان شعیب کی تصویر کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے اپنا چینی کابل ڈاگ یاد آ رہا تھا اور اس مشابہت پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔ اچانک سعید خضر بھی وہاں آ نکلا۔ یہ منظر دیکھ کر خضر کچھ ایسا پریشان ہوا کہ خود پر قابو کھو بیٹھا۔

" تمھاری طبیعت بھی ایک عجوبہ ہے " اس نے کہا " یا تو جانوروں سے پیار کرتی ہو یا تصویروں سے یا پھر غیر حاضر لوگوں میں دلچسپی لیتی ہو۔ اپنی امی کو یاد کرتی ہو۔ یا بابا کو ڈھونڈتی ہو اور پوچھتی ہو کہ مجیب بھائی کب آئیں گے، کہیں افتخار بھائی نے شادی تو نہیں کر لی، افریقہ میں۔ اسعد گھر میں کیوں نہیں رہتے۔ احمد کو آپ لوگ حرامخور کیوں کہتے ہیں۔ یہ سب بھائی کب آئیں گے۔ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں ——— " اس کی سانس اُکھڑنے لگی تھی۔

" اس میں جلنے کی کیا بات ہے؟ " پروین نے خضر کا سلسلہ گفتگو توڑتے ہوئے کہا " ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا "۔

" تو تمھیں کیا اچھا لگتا ہے؟ کیا اچھا لگتا ہے تمھیں؟ " خضر ایک دم جذباتی ہو گیا جیسے ماحول کو بھول گیا ہو " کیا اچھا لگتا، نہیں؟ ——— یہ ڈولی؟ یہ جانور، کھلونے، تصویریں، انیسٹی کتے اور یہ بُل ڈاگ، یہ جنگلی جانور، کپتان مجو جس کی تصویر کو دیکھ دیکھ کر تمھارا جی کبھی نہیں بھرتا؟ "

پروین حیران تھی کہ خضر کی تمام نرمی ایکدم کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا اور نقوش میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔
"کیا ہو گیا ہے تمھیں؟ ذرا اپنا چہرہ تو دیکھو" اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"میرا چہرہ؟" خضر نے غصہ اور شدتِ جذبات سے اور زیادہ مغلوب اور زرد ہوتے ہوئے کہا "میں جانتا ہوں میرے چہرے کو کیا ہوا ہے۔ یہ تم ہو جو کچھ نہیں دیکھ رہی ہو جس کی آنکھیں بند ہیں ——— مگر تمھیں کیا، تمھیں تو دلچسپی ہے جانوروں سے یا جانور نما انسانوں سے ——— پسی، ڈولی، السیشن کتے، بل ڈاگ مجو، یہ ہیں تمھارے محبوب، تمھیں انسانوں سے کیا واسطہ!" اتنا کہہ کر اچانک اس کے لہجے میں پھر نرمی آ گئی شاید اس لیے کہ اس کے ان الفاظ کو سن کر پروین ایک دم زرد ہو گئی تھی۔ "کاش تم شاعر کے دل میں جھانک سکتیں پروین! کاش تم جان سکتیں کہ خضر کے شعروں میں کون چھپا بیٹھا ہے! کاش تمھیں معلوم ہو سکتا کہ خضر کو بھی آج ایک ساتھی کی ضرورت ہے! ——— میں نے اپنے جذبات کو کتنی دیر دل کے نہاں خانے میں قید رکھا مگر یہ سرکش گھوڑے آخر بے قابو ہو ہی گئے ——— آج خضر گمراہ ہے ——— کاش تم اسے راستہ دکھا سکو!"

خضر کی آواز میں اتنا کرب تھا کہ پروین خوفزدہ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے۔ آخر اس نے ڈولی کو اٹھا کر سینے سے یوں لگا لیا جیسے اب وہ خود مامون و محفوظ ہو گئی ہو!

ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ خضر کے چہرہ کی نرمی ایک بار پھر شکست کھا گئی اور وہ بولا "خضر کو تمھاری ضرورت ہے اور تم خضر سے زیادہ اس کتیا کو چاہتی ہو ——— اس کو سینے سے لگائے پھرتی ہو ——— اس ڈولی کو ———" اور اس نے ڈولی کی طرف یوں ہاتھ بڑھایا کہ پروین اور زیادہ ڈر گئی۔ خضر اسے بہت خوفناک نظر آنے لگا بالکل پسی کی طرح ——— پروین ایسی گھبرائی کہ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور ڈولی آزاد ہو کر کمرے سے باہر بھاگ گئی اور سعید خضر کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ اس کے سینے پر آ رکا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی چوہیا ہے اور خضر پسی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس میں چلنے کی بھی ہمت نہیں رہی لیکن کسی نہ کسی طرح وہ وہاں سے بھاگ نکلی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر تکیے میں منہ دے کر دیر تک روتی رہی ——— اسے یوں لگا جیسے وہ خضر سے نفرت کرنے لگے گی۔

رات کو اسے بخار ہو گیا۔ خضر کسی کام کا بہانہ کر کے کئی روز گھر سے غائب رہا۔ جب وہ واپس آیا تو بہت خاموش، افسردہ اور شرمندہ سا تھا۔ پروین کا بخار تو جلد ہی جاتا رہا لیکن وہ برابر سہمی سہمی سی نظر آتی رہی۔

ابھی یہ واقعہ تازہ ہی تھا کہ اچانک اسد آ پہنچا۔ وہ ہمیشہ غیر متوقع طور پر آتا تھا اور پھر اسی طرح اچانک رخصت بھی ہو جاتا تھا۔ وہ بادل کا ایک بڑا ٹکڑا تھا جو آتے ہی پھیل کر سارے گھر پر چھا جاتا تھا اور برس کر واپس چلا جاتا تھا۔ خاموش بیٹھنا اس کے لیے گناہ تھا۔ پروین سے تو اس نے زیادہ باتیں نہیں کیں لیکن اپنی ماں کا دماغ خوب چاٹا گیا۔ اس کا زیادہ وقت یہ ثابت کرنے میں صرف ہوا کہ وہ دو عورتیں جنھیں وہ بیویاں بنا کر چھوڑ چکا تھا اس کے اہل نہیں تھیں اور کہ گذشتہ تجربات کی روشنی میں اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ انتخاب میں کوئی غلطی نہ کرے۔ ماں نے پیار آمیز غصہ میں جواب دیا "تجھے تو شاید زندگی بھر اپنی پسند کی بیوی نہ مل سکے گی" مگر اسد نے مسکرا کر کمرے کے اندر داخل ہوتی ہوئی پروین کی طرف دیکھ کر کہا "آپ غلط سوچ رہی ہیں امی! اب کے میں نے بڑی اعلیٰ ہستی منتخب کی ہے۔"

پروین نے یہ بات سن لی اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم دروازے کی چوکھٹ پر ہی رک گئے۔ وہ اسد بھائی سے ملنے چلی تھی لیکن ابھی وہ اُسے بھائی کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نفرت کا بیج اس کے دل میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ یہ کس قسم کے بھائی تھے۔ جن کا کردار لٹیروں کا کردار تھا۔ بھائیوں سے ملنے کی خواہش کی شدت کی جگہ اب ایک دبے ہوئے احساسِ خوف نے لے لی تھی۔

امجد آیا تو گھر کی رونق میں بڑا اضافہ ہوا۔ پروین نے اُسے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ وہ واقعی پیارا تھا۔ بالکل ڈول کی طرح نرم۔ تیز اور چالاک۔ اس نے سیاہ چشمہ آنکھوں سے اُتارا اور مسکرا کر پروین کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اپنی ممی کی طرف بڑھایا۔

"پروین ——— پروین ——— تمھاری تایا زاد بہن" ماں نے تعارف کروایا۔

"تایا زاد بہن؟" امجد نے بات کاٹ دی "آہا ——— آہا ——— بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر ——— یقین جانیے ——— اتنی ——— اتنی (اس نے یوں ہاتھ پھیلائے جیسے پورے کرۂ ارض کو ہاتھوں میں تھام لینا چاہتا ہو) ——— میرا مطلب ہے ——— کہ السلام علیکم" اور اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیئے۔

پروین گھبرا گئی۔

"امی ؟" امجد چلایا "یہ کیسی تایا زاد بہن ہے ؟ نہ سلام، نہ سلام کا جواب، نہ مصافحہ نہ بات !"

"پروین، ہاتھ ملا لو بیٹا، یہ تمھارے بھائی ہیں، امجد" چچی نے کہا۔

"امجد حرامخور ؟" غیر ارادی طور پر پروین کے منہ سے نکلا۔ گھر میں جب بھی کسی نے امجد کا نام لیا ساتھ حرامخور کا استعمال ضرور ہوا۔ پروین کے کان اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اب غیر شعوری طور پر یہ خطاب اُس کی زبان پر آگیا۔

"دیکھا امی، ابھی سے میری آپ کی لڑائی" امجد نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ ہر شخص کو آپ پہلے سے ہی میری بے عزتی کرنے پر تیار رکھتی ہیں۔ آخر لوگ کیا کہیں گے ——— اور یہ ہماری نئی نویلی پیاری سی بہن کیا سوچے گی ؟"

"تو کیا تو حرامخور نہیں ہے ؟" اسد نے سوال کیا۔

پروین کو اس سوال پر ہنسی آگئی۔ امجد کو شور مچانے کا ایک اور موقعہ ملا "امی لو دیکھو یہ محترمہ ابھی سے مابدولت پر ہنسنے بھی لگیں۔ ظلِ سبحانی کے ساتھ یہ سلوک! میں نے بھی اگر ان محترمہ کو اپنے جیسا حرامخور نہ بنایا تو نام بدل لوں گا۔"

"تو کیا حرامخور کی جگہ کام چور یا بے شرم رکھو گے ؟" اسد نے پھر چٹکی لی۔

"بھیا" امجد نے کہا "کاش آپ مجھ سے ایک سال بڑے نہ ہوتے۔ برابر کے ہوتے۔ کاش ہم دونوں جڑواں بھائی ہوتے پھر میں آپ کو آزادی سے اِن باتوں کا مزا چکھاتا۔"

"تو مجھے برابر کا ہی سمجھ لے۔"

"اچھا ؟"

"ہاں!"

"اچھا!"

"ہاں"

"پھر سوچ لیجیے، معاملہ خطرناک ہے"

"سوچ لیا ہے، بس باتیں مت بنا"

"لیجیے، پھر سنبھلیے ——— سنبھلیے" یہ الفاظ کہتا ہوا امجد، اسد کے گلے سے لپٹ گیا اور دونوں قہقہے لگاتے ہوئے باہر صحن میں چلے گئے۔

"دیکھا تم نے پروین، کتنے اچھے ہیں میرے بچے، کتنے زندہ دل ہیں!" ماں نے نہال ہوتے ہوئے کہا۔

پروین کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ کم از کم امجد نے اُسے دوبارہ بہن کہا تھا۔ اس کے دل کو بڑی تقویت ملی۔ امجد کا رتبہ اس کے دل میں بڑھ گیا۔

بہت دیر نہ ہوئی تھی کہ امجد واپس آگیا اور بڑی بے تکلفی کے انداز میں پروین سے گویا ہوا "پروین ——— تمہارے بھائی بے ڈکار کو بہت بڑی شکست دے کر آیا ہوں"

"بھائی بے ڈکار؟" پروین نے حیرانی سے سوال کیا۔

"ہاں، ہاں، تم نہیں جانتیں؟ ——— یہ بھی کمال ہے کہ ہمارے بارے میں تو آپ کو ہماری سب خرابیوں سے آگاہ کر دیا گیا اور دوسروں کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتایا ——— بہرحال یہ کام اب میں کیے دیتا ہوں ——— یہ جو اسد بھائی ہیں نا یہی ہیں بھائی بے ڈکار، اس لیے کہ یہ دو بیویاں بغیر ڈکار لیے ہضم کر گئے ہیں اور اب تیسری کی فکر میں ہیں۔ ان سے بچ کے رہنا"———

"جی!" پروین کی زبان سے صرف یہ ایک لفظ نکلا اور کشیدہ کاری کا فریم اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد وہ پھر چپ سی ہو گئی۔ اگلی صبح وہ ابھی خود پر قابو پانے کی کوشش میں ہی مصروف تھی کہ امجد نے اس سے سوال کیا "پروین، تم نے کبھی پہاڑ کی سیر کی ہے؟"

"جی ——— نہیں"

"تو پھر تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا" امجد نے منہ بنا کر فیصلہ دیا "ممو کے انتقال سے تم افسردہ ہو۔ تمہاری صحت خراب ہو رہی ہے۔ تم چپ سی رہتی ہو۔ امی سے اجازت لے کر تم میرے ساتھ پہاڑ کی سیر کو چلو۔ میری طرح حرام خور بنو، شکار کھیلو، خوش رہو، تفکرات سے دور بھاگو، پھر دیکھو کیسی عمدہ بنتی ہے تمہاری صحت۔ یہ سب لوگ مجھ سے جلتے ہیں اسی لیے مجھے حرام خور کہتے ہیں۔ اصل میں یہ سب مجھ ایسا بننا چاہتے ہیں۔ حرام خور بننے میں بہت مزا ہے۔ سرسبز لہلہاتے کھیت، گنگناتے پہاڑی نالے۔ فردوسی وادیاں ——— ان سب سے ایسی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ تم گھر بیٹھ کر اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ تمہاری خاموشی اور افسردگی اگر چند ہی روز میں غائب نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دینا ——— میرا مطلب ہے امجد حرام خور کی بجائے کوئی اچھا سا نام دے دینا،

مثلاً امجد دانشمند یا امجد باشعور وغیرہ وغیرہ"

پروین کی غیر معمولی پریشانی اور خاموشی کا سبب تو دراصل وہ واقعہ تھا جو اس کے اور خضر کے درمیان پیش آچکا تھا لیکن چچی کا خیال تھا کہ عید قریب آنے کی وجہ سے اُسے باپ زیادہ یاد آرہا تھا اور اسی لیے وہ زیادہ اُداس ہو رہی تھی۔

پروین اب زندگی کے حقائق کے روبرو کھڑی تھی اور یہ تصادم رومانی خیالات کے لیے پیامِ موت تھا۔ یہ نوجوان نوابجانی جنھیں اس نے شروع میں اپنے کھلونوں کی طرح سمجھا تھا فی الحقیقت اس کے کھلونوں کی طرح بے جان اور بے طاقت نہیں تھے بلکہ اپنی مرضی دوسروں پر حاوی کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ غصہ آنے پر وہ کھلونوں کو اُٹھا کر پھینک سکتی تھی۔ انھیں توڑ سکتی تھی، انھیں آتشدان پر سجا سکتی تھی کسی کو مار مار کر گھر سے نکال سکتی تھی مگر اب صورتِ حال بالکل برعکس تھی اور وہ خود کو اس گھر کے افراد کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہی تھی بالخصوص خضر والے واقعے نے تو اسے بہت خوفزدہ کر دیا تھا۔ شادی کے بارے میں اس نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا لیکن اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ ان بھائیوں میں سے ہی کوئی نہ کوئی کبھی نہ کبھی اسے یوں دبوچ لے جائے گا جیسے اس کی ممی نے اس کے طوطے کا لقمہ بنا لیا تھا۔

امجد نے خود ہی امی کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا" امی۔ میں پروین کو پہاڑ پہ لے جاؤں گا ——— سچ سچ سچ ——— ذرا دیکھو تو کتنی دُبلی ہو رہی ہیں یہ۔ صحت کس قدر گر گئی ہے۔ رنگت کتنی زرد ہو رہی ہے۔ آپ نے بڑی بے پروائی دکھائی امی جان! کاش آپ مجھے پہلے ہی اطلاع کر دیتیں تو میں کب کا آکر انھیں لے جاتا ——— مگر اب بھی کیا بگڑا ہے۔ میں انھیں پہاڑوں کی سیر کراؤں گا، پھر دیکھنا چند ہی روز میں ان میں کتنی آب و تاب آجاتی ہے ——— امی میں ان کو بالکل اپنے جیسا صحت مند بنا دوں گا ——— ہیں ———" اور وہ مسکرا کر امی کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"ہاں ہاں لے جانا ——— مگر ابھی کوئی جلدی نہیں ہے" چند لمحوں کے توقف کے بعد امی نے جیسے ٹالنے کو یہ بات کہی۔

"نہیں نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں یہاں بہت آرام سے ہوں" پروین نے بے ساختہ کہا۔ کچھ دیر کو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے امجد میں خضر کی روح حلول کر آئی ہے اور وہی اس کی زبان سے اپنا مدعا بیان کر رہی ہے۔ اس کا چہرہ اور زرد ہو گیا۔ وہ بہت گھبرا گئی۔ اُسے وہاں بیٹھے رہنا مشکل لگا تو اپنے کمرے کی طرف بھاگ اُٹھی اور وہاں جا کر پھر تکیے میں سر دبا کر رونے لگی۔

چچی اور چچا دونوں کو یقین تھا کہ پروین کی یہ حالت عید کی آمد اور باپ کی جدائی کے غم کی وجہ سے ہے لیکن وہ سیدھے سادے بزرگ اس کی ذہنی حالت کا بالکل اندازہ نہ کر سکے۔ چچی سمجھتی تھیں کہ پروین خضر کی صحبت میں خوش رہتی ہے اس لیے انھوں نے خضر کو پروین کی افسردگی دُور کرنے پر مامور کیا لیکن وہ کسی کام کا بہانہ کر کے یہ کہہ کر غائب ہو گیا" اسد بھیا، اور ساجد بھیا جو ہیں اور اب حبیب بھائی بھی تو آجائیں گے"!

چچا نے پروین کو بار بار روتا دیکھا تو ان کا جی بھر آیا۔ انھوں نے دستِ شفقت اس کے سر پر پھیرتے ہوئے اُسے سمجھانا شروع کیا" روؤ نہیں پینو بیٹی، یوں تو باپ باپ ہی ہوتا ہے لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ تمھارا باپ مر گیا ہے۔ میں تمھارا باپ ہوں۔ تم

یوں سمجھو کہ تمہاری ماں بھی زندہ ہوگئی ہے اور تمہیں کتنے اچھے اچھے جوان بھائی مل گئے ہیں۔ تم مجھے پاپا اور چچی کو امی کہا کرو۔ تم ہماری بیٹی ہو۔ تم یوں سمجھو کہ تمہارے باپ کی روح نے اپنا لباس یعنی جسم بدل لیا ہے اور اب میرے جسم میں آگئی ہے۔ آنسو پونچھ لو، خوش رہو۔"

ان الفاظ کے ساتھ چچا کی اپنی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں اور وہ منہ پھیر کر اپنے کمرے میں چلے گئے جہاں غالباً وہ چچی کا دامن آنکھوں سے لگا کر کچھ دیر روتے رہے کیونکہ جب وہ باہر نکلے تو ان کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہے تھے اور چچی کا دامن بھیگا ہوا تھا اور وہ اداس سی نظر آرہی تھیں۔ پھر چچی نے پروین کو سمجھانا شروع کیا۔ پروین سوچنے لگی۔ شاید یہ دونوں بزرگ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں اور اس کی اداسی کا سبب صرف باپ سے جدائی ہی ہو اور دوسرے واقعات محض بہانہ بنے ہوں۔ مگر یہ دوسرے واقعات کچھ اتنے سنگین تھے کہ اس کا ذہن یہ دلیل قبول نہ کر سکا۔

اگرچہ بھائی کی موت کی وجہ سے یہ عید عید نہ تھی پھر بھی چچا کا حکم تھا کہ سب بچے عید پر گھر میں جمع ضرور ہوں گے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق ٹھیک ہی تو کہا ہے۔ ان بیٹوں کی آمد سے گھر میں بہت رونق آگئی تھی۔ لیکن جب عید سے دو روز قبل کپتان مجیب بھی آگئے تو گھر میں اس وقت وہ شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سب لوگ خوشی سے شور مچا رہے تھے۔ پروین کے ذہن میں خیال کی ایک لہر آئی کہ خوشی کے اظہار کے لیے شور مچانا ضروری ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک لرزہ خیز قسم کا قہقہہ لگائے مگر فوراً اسے خیال آیا کہ یہ تو دیوانگی کا عمل ہوگا اور وہ اپنے ارادے سے باز رہی۔

وہ سوچنے لگی کہیں میں واقعی پاگل تو نہیں ہوگئی جو ان سب لوگوں کی باتیں مجھے عجیب معلوم ہو رہی ہیں۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ میری تنہائی کی زندگی اور تربیت نے مجھے غلط احساسات و خیالات کا شکار بنا دیا ہے۔ میں پاگل تو ہرگز نہیں ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔ یہ میرے ہاتھ ہیں، یہ پاؤں ہیں، میں چیزوں میں تمیز کر سکتی ہوں۔ سوچ سکتی ہوں، ابھی ابھی میں نے اپنا قہقہہ دبا کر فرزانگی کا ثبوت دیا ہے۔ پاگل انسان خود پر قابو کب پا سکتا ہے —— تو پھر میرے خیالات ہی غلط ہیں۔ اسی لیے میں پریشان ہوں —— لیکن مجھے اس بات کا بھی تو یقین نہیں ہے —— اگر یہی حالت کچھ دیر اور قائم رہی تو پھر میں ضرور پاگل ہو جاؤں گی —— لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے —— میں خود کو سنبھالتی ہوں —— اب میں خوش رہنے کی کوشش کروں گی" —— اور یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی آئینے کے سامنے جا رُکی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی مسکراہٹ بھی اس کا تمسخر اُڑا رہی ہو۔

یہ صحن کا شور تھا جو پروین کو کمرے سے باہر کھینچ لایا تھا۔ اس کے سامنے صحن کے دروازے کے قریب بڑے کمرے والی ایک تصویر بہت بڑی ہو کر کھڑی تھی اور اس میں جان پڑ گئی تھی اور وہ بے ہنگم قہقہے لگا رہی تھی۔ یہ ایک بل ڈاگ تھا جو بڑے سائز کے دو السیشی کتوں کی زنجیریں تھامے کھڑا تھا۔ کتے آگے کو زور مار رہے تھے اور زنجیریں لوہے کی سلاخوں کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ امجد ٹین کا ایک ڈھول بنا کر فوجی انداز سے پیٹ رہا تھا اور اسعد دونوں ہاتھوں کا بگل بنا کر منہ سے بجا رہا تھا اور پیپ پیپ —— پیپ پیپ —— کی آوازیں لگاتار پیدا کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو پروین کو محسوس ہوا جیسے واقعی کوئی فوجی دستہ صحن میں آ اترا ہے —— کپتان صاحب اوپر کے ہونٹ پر موٹی موٹی مونچھیں سنبھالے شور انگیز قہقہے لگا رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ مونچھیں اب گریں اور اب گریں۔ پروین یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اگر وہ مونچھیں گر گئیں تو وہ آگے بڑھ کر انھیں زمین سے اٹھا کر بڑے بھائی کے سپرد کرے یا نہیں۔

"ہاہاہا — ہوہو — ہوہو — دھم دھما دھم — پیپ پیپ — پیپ پیپ — دھاں دھاں — دھاں دھاں" کے شور میں چچی نے پروین کا ہاتھ تھاما اور اسے مجیب کے پاس لے جا کر اس کا تعارف کروا دیا۔

"پروین ہاہاہا — او — پروین — ہو ہو ہو — ہاہا — گھڑ گھڑ گھڑ — بھا بھا بھا —"

پروین حیران تھی کہ یہ کس قسم کے قہقہے تھے۔ کیا فوجی ایسے ہی قہقہے لگاتے ہیں اور پھر ایک گلے سے اتنی متعدد آوازیں، اتنے متعدد قہقہے کیونکر نکل سکتے ہیں — اچانک کپتان صاحب نے ہاتھ بڑھا کر پروین سے وہ زوردار مصافحہ کیا کہ وہ لرز کر رہ گئی۔ ساتھ ہی السیشن کتوں نے بھی خوشی سے دیوانہ وار قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ ایسی گھبرائی کہ چیخ کر چچی کے پیچھے جا چھپی۔

"ہاہاہا — ہمارے کتوں سے ڈرتی ہے — ہوہوہو — گھڑ گھڑ گھڑ — بھا بھا بھا — تم کیا لڑکی ہے — یہ کاٹتا نہیں — ایں — دیکھو ٹائیگر، ہیلو لیپرڈ — یہ پروین بھی تمارا مالک ہے — ایں — دیل — تم ان سے ٹھیک بی ہیو (BEHAVE) کرنا — ایں (TEASE) نہیں کرنا — ایں — ہاہاہا — ہوہوہو — بھب بھب بھب — لو ان سے ہاتھ ملاؤ (SHAKE HANDS) — ایں — دوستی کرو — او ڈرتی ہے — ہاہاہا — ہوہوہو — بھب بھب بھب — گھڑ گھڑ گھڑ"

کپتان صاحب نے کتوں کی زنجیریں کھول دیں۔ پروین اور زیادہ چچی کے قریب ہو گئی۔ کتوں نے سب کے پاؤں سونگھنا شروع کئے۔ اسد کا ڈھول اور امجد کا بگل برابر فوجی انداز میں بج رہے تھے۔ آخر کپتان بھائی آئے تھے کوئی مذاق نہ تھا۔ شایانِ شانِ استقبال ضروری تھا۔

چچی اپنی جگہ حیران تھیں اور خوش بھی" او مجو کے بچے، سنبھال اپنے کتوں کو" انھوں نے پیار بھرے غصے سے کہا "ارے پکڑ انہیں۔ پریشان کئے دے رہے ہیں بے چاری پروین کو۔"

مجو کے بچے پر تو کوئی اثر نہ ہوا البتہ کتے خود ہی زمین سونگھتے اندر کمروں کی جانب چل دیئے اور پروین نے ایک بار آرام کا سانس لیا۔ مگر یہ سانس ابھی پورا بھی نہ ہوا تھا کہ کپتان نے ایک زوردار ہاتھ اس کے کندھے پر مارتے ہوئے کہا" او تم ڈرو نہیں ہمارے کتے صرف دشمن کو کاٹتے ہیں — ایک بار اُدر ملٹری میں ایک ENEMY سے DIFFERENCE ہوا — اینڈ دی فاٹ AND WE FOUGHT ہمارے دوست کتے ساتھ تھے — اُنوں نے FRONT سے وہ ATTACK مارا کہ ENEMY کو HOSPITAL جانا پڑا — مگر یہ دوست کو کچھ نہیں بولتا — اُدر ملٹری میں عورت لوگ کتے سے نہیں ڈرتا۔ تم چل کر دیکھو — وہ ان سے EMBRACE کرتا پیار کرتا — اور فوج میں تمارا FEAR ختم ہو جائے گا — ایں — ہاہاہا — ہوہوہو — بھڑ بھڑ بھڑ —"

پروین کو یوں لگا جیسے وہ کسی پاگل خانے میں کھڑی ہو جہاں ہر پاگل اپنی ڈفلی بجا رہا ہے تاکہ نووارد بھی ان جیسا پاگل ہو جائے۔

عین اس وقت ڈولی کے چلانے کی آواز آئی جسے سنتے ہی پروین بے قرار ہو کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ برآمدے کے سرے پر ہی وہ رُک گئی۔ دونوں السیشن کتے ڈولی کے درپے تھے اور وہ بے چاری دم پچھلی ٹانگوں میں دبائے حیران ہگوشہ عافیت

کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

"انھیں روکئے —— میری ڈولی —— یہ اُسے مار ڈالیں گے —— چچی جان انھیں روکئے" پروین نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"DONT FEAR —— ہاہاہا —— THEY WILL NOTHARM HER —— ہوہوہو —— وہ تو دوستی کرتا ہے —— LOVE کرتا ہے —— دیکھا فوجی کتنی جلدی دوستی کرتا ہے —— اور تم ڈرتا ہے —— ایں —— ہاہا —— ہوہوہو —— عجب عجب عجب" اور کپتان، سراسیمہ پروین کو، معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔

اچانک ڈولی جان کی اماں کی تلاش میں بھاگتی ہوئی باہر کے دروازے کے قریب پہنچی تو پروین نے آگے بڑھ کر فوراً دروازہ ایک لمحے کے لیے کھول دیا۔ ڈولی سیدھی باہر نکل گئی۔ دروازہ بند ہو گیا اور مجیب کے کتے اپنے پنجوں سے دروازے کو نوچنے لگے۔ اب کپتان صاحب نے اپنی امی کی چیخ و پکار پر دھیان دیا اور کتوں کو دوبارہ زنجیروں میں باندھ دیا گیا۔ اور جب تک کپتان اپنے کمرے میں داخل نہیں ہو گیا اسد اور امجد کا فوجی بینڈ برابر مصروفِ کار رہا۔

پروین بھی اپنے کمرے میں جا بیٹھی۔ وہ بہت تھکی تھکی سی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی طوفان آیا تھا جو گزر گیا۔ وہ خواب کی سی کیفیت میں آنکھیں موندے بڑی دیر تک بیٹھی رہی۔

نہا دھو کر کپتان صاحب مع اپنی امی کے برآمدے میں آ بیٹھے اور نیم غنودگی کی حالت میں پروین نے ان کی گفتگو کا ایک حصہ سنا!

"مجو بیٹا" پروین کی چچی کہہ رہی تھیں "تم کتنے بھی بڑے ہو جاؤ، کپتانوں کے بھی کپتان بن جاؤ، میرے لیے تو بچے ہی رہو گے۔ پچھلے سال بھی تم نے وعدہ کیا تھا کہ شادی کر لو گے مگر تم ٹال گئے اور ایک اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے جاتی رہی۔ جب تک بڑے بھائی کی شادی نہ ہو جائے چھوٹے سمجھتے ہیں کہ انھیں ابھی شادی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسد تو خیر بے شرم ہے، اپنی مرضی کر لے گا۔ تمھاری عمر بھی بڑھتی جا رہی ہے، اب میں تمھارا کوئی اعتراض نہیں سنوں گی۔ تم اتنے بڑے افسر ہو، جس لڑکی کی طرف اشارہ کرو گے تمھاری ہو جائے گی —— اور اب تمھارے اپنے گھر میں ایک چاند اترا ہے، میں تو کہتی ہوں تم اس چاند کو اپنا لو —— دیکھو پروین کتنی اچھی لڑکی ہے، میں نے اس سے اچھی لڑکی اب تک نہیں دیکھی۔ تمھارا بیاہ ہو جائے تو پھر چھوٹے میرے سامنے نہیں بول سکیں گے۔"

"ڈیل ممی —— ہم نے سوچ لیا —— بلکہ DECIDE کر لیا —— پروین ہم کو بہت GOOD لگی —— بہت سویٹ —— VERY SWEET —— ہاہاہا —— ہوہوہو ——"

"جیتے رہو بیٹا، تم نے جی خوش کر دیا" یہ الفاظ چچی کے تھے۔ اس کے بعد شاید اس نے بیٹے کی بلائیں لی ہوں گی۔ لیکن پروین اور کچھ نہ سن سکی۔ اس کا دل ڈوبتا رہا اور وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی رہی کہ کیا ہونے والا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے لیکن وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس گھر سے بھاگ جائے مگر اسے یوں لگا جیسے اب ایک بل ڈاگ دروازے پہ پہرہ دے رہا ہے اور وہ کہیں نہیں جا سکتی۔

یہ واقعات صبح کے تھے۔ ڈولی دوپہر تک واپس نہ آئی۔ پروین سخت فکرمند تھی۔ چچی اپنے بیٹوں کے ساتھ اس قدر مصروف تھیں کہ کسی کو بھی ڈولی کا خیال نہ آیا۔ پروین بار بار کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی مگر دیر تک ڈولی کی صورت نظر نہ آئی اور جب اچانک وہ نظر آئی تو پروین کا غم اور بڑھ گیا۔ پروین نے دیکھا کہ ڈولی بھاگی آ رہی ہے اور کئی آوارہ کتے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ گھر کے قریب آئی مگر اس سے قبل کہ پروین نیچے جا کر دروازہ کھول سکے آوارہ کتے اس کے سر پہ آموجود ہوئے اور وہ پھر کسی جانب بھاگ نکلی۔

پروین نے خادمہ کو یہ منظر دکھایا اور اُسے حکم دیا کہ ملازم اور مالی کے ذریعے ڈولی کو تلاش کروا کر گھر لے آئے۔ خادمہ "اچھا جی" کہہ کر معنی خیز انداز سے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

تلاش کے باوجود ڈولی نہیں مل سکی۔

پھر شام ہو گئی۔ مگر ڈولی گھر نہیں آئی۔

چچا بھی اب گھر آ گئے تھے۔ پروین کی پریشانی کو دیکھ کر اب سب کو تشویش ہوئی۔ کپتان صاحب کا خیال تھا کہ ڈولی گم نہیں ہو سکتی۔ ضرور واپس آ جائے گی۔

آج پروین کو بابا اس قدر یاد آئے کہ وہ زار زار رونے لگی۔ ڈولی ان کی یادگار تھی وہ بابا کا آخری تحفہ تھی۔ ان کا دیا ہوا آخری کھلونا تھی، زندہ جیتا جاگتا کھلونا۔ اور جب اس نے شام کے کھانے میں شرکت سے انکار کیا تو چچی نے پہلے تو پیار سے سمجھایا اور پھر غصے سے کہا "توبہ، کوئی جانوروں سے بھی ایسا پیار کرتا ہے کہ ان کی خاطر بزرگوں، بھائیوں اور کھانے اور ہر چیز سے روٹھ کر رونے لگے!"

یہ بات ایک تلوار تھی جو پروین کے دل کو کاٹتی ہوئی گذر گئی۔ اس کی سسکیاں تیز تر ہو گئیں اور آنکھوں کی جلن بڑھ گئی۔

کھانا بڑھا دیا گیا۔ سب لوگ اپنی اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے۔ آخر پروین کو بھی نیند آ گئی۔

غم نے نیند میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اس نے خواب میں بھی ڈولی کو دیکھا۔ وہ خود کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈولی تیزی سے سڑک کی سمت بھاگی آ رہی تھی مگر کئی تیز رفتار کتے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ شاید یہ وہی منظر تھا جو اس نے دن میں ایک بار دیکھا تھا اور جو اَب خواب بن کر سامنے آ گیا تھا ——— ڈولی اور کتوں کا گروہ گھر کے قریب ہوتے جا رہے تھے وہ خوش تھی کہ ڈولی اب گھر آ جائے گی ——— وہ اور قریب آ گئی ——— اور جب وہ بہت قریب آ گئی تو پروین نے غور سے دیکھا کہ وہ ڈولی نہیں تھی ——— اس کی صورت تو بالکل بدل چکی تھی ——— وہ تو ——— وہ تو وہ خود تھی ——— پروین یہ دیکھ کر بڑی حیران ہوئی کہ وہ تو وہ خود تھی جو گھر کی جانب بھاگی آ رہی تھی ——— اس نے اپنی پیشانی پہ ہاتھ رکھا۔ پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی ——— شاید بھاگ بھاگ کر یہ حالت ہو گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ واقعی وہ خود تھی جو کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اُسے دروازہ کھلا مل جائے مگر وہ تو بند تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ باہر دروازے کے قریب موجود ہے۔ اس لیے دروازے کے اور قریب ہو کر گھوم کر دیکھا۔ کپتان مجیب کے دونوں السیشن کتے اس کا پیچھا کر رہے تھے مگر ان کے علاوہ کچھ اور کتے بھی تھے وہ ان کتوں سے بہت خوفزدہ تھی۔ چنانچہ اور تیز بھاگنے لگی۔ کتوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی اور وہ اس کے قریب آ گئے۔ اس نے پھر گھوم کر

دیکھا۔ تعاقب کرنے والوں میں ایک بل ڈاگ بھی تھا۔ غور سے دیکھنے پر اُسے معلوم تھا کہ یہ تو کپتان مجیب خود تھے۔ دوسرے تعاقب کرنے والوں کے چہرے بھی اُسے شناسا سا معلوم ہوئے —— اس نے دماغ پہ زور دیا —— یہ تو —— یہ تو اسد اور خضر اور امجد تھے۔ پھر وہ سب اتنا قریب آ گئے، گویا حملہ کر دیں گے۔

چیخ کی آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے چچی اور خادمہ بھاگی آئیں۔ پروین کا جسم پسینے میں تر تھا اور وہ بُری طرح کانپ اور ہانپ رہی تھی، جیسے نامعلوم کتنی دور سے بھاگی چلی آ رہی ہو۔

چچی نے اُسے سر سے پاؤں تک اپنے ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے پریشانی کے ساتھ پوچھا "کیا ہوا بیٹی؟ کیا بات ہے؟ پروین بیٹی خیر تو ہے؟ کیا خواب میں ڈر گئی ہو؟"

"جی —— جی —— وہ —— وہ ——" پروین نے کانپتی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہا۔

"وہ؟ وہ کیا بیٹی؟" چچی نے پیار سے پوچھا۔

"وہ —— وہ —— کتّے —— کتّے!" پروین نے یوں ڈرتے ہوئے کہا جیسے کوئی گالی دے رہی ہو۔

اکیلا

وقار بن الٰہی

سچی بات ہے داؤد سے مل کر میں بے حد مایوس ہوا۔ اُس کی گفتگو اور اُس کے لباس کو دیکھ کر اگر میں کچھ سوچ سکتا تھا، تو یہی کہ —— "جعفری نے اس جیسے شخص کو اپنا دوست کیسے بنا لیا ہے —— ؟"

ایمانداری سے کہتا ہوں آج کی دوستی تو کالج میں انعام میں ملے ہوئے کپ پر چڑھی پالش کی طرح ہوتی ہے کہ چند دن گذرنے کے بعد پالش غائب ہو جاتی ہے اور نیچے سے سیاہ رنگ کی دھات منہ چڑانے لگ جاتی ہے۔ کچھ ایسی حالت دوستی کی بھی ہوتی جاتی ہے۔ جہاں تک کوئی اُمید وابستہ رہتی ہے، غرض پوری ہونے کی توقع رہتی ہے، دوستی بھی چلتی رہتی ہے بلکہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ مار کے کس خوبصورتی سے کہتے ہیں "وہ تو میرا لنگوٹیا ہے جی ——" اگر کسی کے پاس کھانے کے لیے پیسے، پہننے کے لیے کپڑے اور گھومنے کے لیے کار ہو تو اتنے دوست بن جاتے ہیں کہ جان عذاب میں پڑ جاتی ہے۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ داؤد کے پاس ان میں سے کچھ نہ تھا۔ اس کے باوجود اس کے اتنے سارے دوست تھے۔

ہم تین چار دوست تھے۔ جو شام کو پبلک لائبریری میں اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ وہاں سے نکل کے کسی سستے سے ریسٹوران میں بیٹھ کے چائے پیتے اور اگر باہر سڑک پر کوئی آنچل لہراتا ہوا دکھائی دیتا تو ہم مارد دھاڑ سے بھرپور تصویر دیکھ کے بکھر جایا کرتے۔ جعفری لائبریرین تھا۔ اتنا فراخ دل کہ کیا مجال جو کسی ممبر کو اُس نے کبھی کوئی کتاب دی ہو لیکن ہمارے لیے وہ چابیاں ہاتھ میں لیے پھرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اُسے چائے پلانے کو ہماری جیب میں پیسے ——

ایک شام کو جو اپنے دفتر سے نکل کے لائبریری پہنچا تو صبح سے منڈلاتے ہوئے بادل ایک دم برس پڑے وہ بھی ایسے جھما جھم کہ پل بھر میں جل تھل ہو گیا۔ جعفری کو سلام کر کے میں دریچے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ مجھے تیز بارش بہت بھلی لگتی ہے۔ سوچتا ہوں، چھپنے کی بجائے اگر کبھی سڑک پر نکل جاؤں تو کیسا رہے۔ باہر کی چیزوں کو پانی میں شرابور ہوتے دیکھ رہا تھا کہ جعفری میرے پاس آیا۔ رُک کے اُس نے ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھا، پھر چھینگ پر آئی ہوئی عینک کو اُوپر چڑھایا اور بڑے سپاٹ سے لہجے میں کہنے لگا۔

" آؤ، تمہیں ایک اُلّو کے پٹھے سے ملاؤں "—— میں نے فوراً مڑ کے دیکھا۔ جعفری بے تکلف اور بے ضرر قسم کا آدمی ہے۔ نہ کسی سے محبت، نہ کسی سے نفرت۔ زندگی سے اُسے نفرت نہیں، تو پیار بھی نہیں۔ لیکن جب کبھی وہ گالی دینے پر آتا ہے

تو پھر اس کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے اس کا بس چلے تو گالی نہ دے کچا چبا جائے ـــــ اور بس اسی لیے نہیں چلتا کہ بیچارے کے جسم پر گوشت نام کو نہیں۔ سر کے گنے چنے بالوں کو بٹتا ہوا وہ آگے چل دیا اور میں اس کے پیچھے۔ کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو اس نے ایک طرف لے جا کر تعارف کرایا۔

" داؤد صاحب ـــــ یہ میرے دوست عثمان ہیں اور یہ داؤد ـــــ" داؤد اپنی جگہ سے اٹھا، ہاتھ ملایا۔ نہ سرد مہری تھی نہ گرم جوشی۔ اور پھر سے کرسی میں دھنس گیا۔ اس کا حلیہ دیکھ کے میرے ذہن میں آیا بھی کہ جعفری سے پوچھوں "یہ کس بھنگی سے ملا رہے ہو" لیکن پوچھ نہ سکا۔ بارش ابھی شدت سے ہو رہی تھی اور شاہ صاحب، چودھری اور شریف ابھی تک آئے نہ تھے۔ کاؤنٹر کے پاس ہی دوسری کرسی میں میں بھی دھنس گیا۔

داؤد اور جعفری بڑے اطمینان سے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اکثر لائبریرینوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کبھی کسی نے کسی کتاب کے متعلق بات کی، یہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولنے لگ جاتے ہیں۔ لیکن جعفری کا معاملہ الٹ تھا۔ کسی بحث یا تفصیل سے اسے اختلاج ہونے لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے بہت کم کسی بحث یا رائے میں حصہ لیتے دیکھا۔ اب بھی وہ داؤد سے بات کر تو رہا تھا لیکن بے تعلق سا لگ رہا تھا۔ یوں جیسے وہ اس بلا سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ سچ پوچھئے تو داؤد کسی بلا سے کم تھا بھی کہاں۔ میں نے ذرا غور سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔

یہی کوئی پینتالیس پچاس برس عمر ہوگی اس کی۔ رنگ قریب قریب سیاہ تھا۔ چہرہ خوفناک تو نہ تھا لیکن دیکھنے والے کو وحشت ضرور ہوتی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، گال پچکے ہوئے اور اوپر کے اگلے دانت یوں باہر نکلے ہوتے جیسے کوئی ہنس رہا ہو۔ سارے چہرے پر چار چھ روز کی بڑھی ہوئی شیو کے سفید بال۔ بھنویں نیم سفید البتہ مونچھوں میں کہیں کہیں سیاہ بال دکھائی دے جاتا تھا۔ سر کے بال گھنے تھے۔ کنپٹیاں ہی سفید ہوئی تھیں۔ باقی بال سیاہ تھے۔ لیکن جانے کہاں کہاں کی اور کتنے دنوں کی گرد نے انھیں آپس میں جکڑ دیا تھا۔ کوئی گچھا اس طرف ہے تو کوئی دوسری طرف لٹک رہا ہے۔ اس نے گلابی رنگ کی سستی سی بش شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اوپر کے دو تین بٹن غائب تھے اور کاج چر کے اس کی ناک جتنے لمبے ہو رہے تھے۔ نیچے سلیپنگ سوٹ کا پاجامہ تھا جس پر بڑی اور سفید نیلی دھاریاں تھیں۔ وہ بھی ایسی کہ سفید تو اپنا رنگ بالکل ہی بدل چکی تھیں۔ ہاتھ بالکل سیاہ تھے اور ناخنوں کے اندر میل اور باہر نکوٹین کے نشان۔ پاؤں میں سلیپر تھے۔ سلیپر بھی ایسے جو بوٹ کاٹ کے بنائے گئے تھے اور بوٹ بھی جیسے کسی نمازی کے اٹھا لئے گئے ہوں۔ پنجہ چھوڑ کے باقی حصہ بلیڈ کے ساتھ کاٹنے کے باوجود پاؤں پھنس گئے تھے اور کناروں پر اچھا خاصا گوشت ابھرا دکھائی دے رہا تھا۔ ٹخنوں سے ذرا ادھر زخموں کے پرانے نشان تھے جو اکثر زیادہ چلنے اور تنگ بوٹ پہننے کی وجہ سے بن جاتے ہیں۔ سچ تو مجھے اس حلیے سے سخت نفرت ہو رہی تھی۔ جھلایا بھی لیکن اب اس بدبخت جعفری سے کیا کہتا۔

" جعفری صاحب۔ اس کتاب کا عنوان غلط ہے۔ مذاہبِ اسلام کیا ہوا۔ مذہبِ اسلام ہو تو بات بنتی ہے۔ یقین کیجئے ایک مدت سے اس کی تلاش میں تھا۔ لیکن ہاتھ آئی ہے تو آج۔ لے جاؤں نا میں اسے" ـــــ اس کی گفتگو بڑی عجیب لگی۔ ظاہری حالت تو گنواروں سے بھی گئی گذری تھی۔ اور پڑھنا چاہتا تھا مذہبی کتاب، پھر بھی میں نے اس سے بات نہ کی۔ چھوڑو جی۔ بھلا

یہ بھی کوئی آدمی ہے، بھلے مانس نے خوشبو کی ہوتی اور اچھے کپڑے پہنے ہوتے اور جعفری سے کہا ہوتا۔

" خدا وہ آئیڈیل میرج تو نکال دینا ——" تو میں نے اُسے گلے لگا لیا ہوتا۔ پر اب کون بات کرنے کی بھی زحمت گوارا کرتا۔

بارش رُک گئی تھی اور داؤد کتاب بغل میں دبائے جانے کے لیے اُٹھا ہی تھا کہ جعفری نے اُس کی آستین پکڑ لی۔

" بیٹھئے حضرت۔ چائے پی کے جائیے ——"۔ میرا خون کھول گیا۔ یہ جعفری بھی عجیب آدمی ہے۔ ابھی اس سے جان پہچان نہیں اور حضرت چائے کے لیے مدعو کر رہے ہیں۔ پھر میرے پاس تو فقط آٹھ آنے ہیں اور تین ہونے کی صورت میں نو آنے سے کم کہاں بات بنتی تھی۔ جعفری نے جلدی جلدی الماریاں بند کیں۔ کارڈ بکس میں رکھے۔ مہریں سنبھالیں، ہمیں لیا اور لائبریری کا دروازہ بند کر کے ہم کیفے کی طرف ہو لیے۔ لیکن میں اندر ہی اندر کڑھتا جا رہا تھا۔ داؤد اتنی کھسیانی ہنسی ہنستا تھا جیسے یہ چائے نہ ملتی تو وہ مر جاتا۔ ویسے اُس کی گلابی بُش شرٹ کی دونوں جیبیں خالی تھیں۔ آگے پیچھے چُپ چاپ چلتے ہم کیفے میں آئے تو سب سے آگے داؤد تھا۔ میں نے جعفری کا بازو کھینچ کے زہر اُس کے کان میں اُگل ہی دیا۔

" عجیب احمق ہو یار تم بھی۔ کس گدھے کو ساتھ لے آئے ہو۔ کاش! یہاں کتّوں کا داخلہ بند ہوتا ——" جعفری نے جیسے اُس کی وکالت کی۔

" نہیں عثمان۔ آدمی بڑا شریف اور پڑھا لکھا ہے "۔ اتنی دیر میں ہم بیٹھ چکے تھے اور داؤد نے شریف کا لفظ سُن لیا تھا، خود ہی کہنے لگا۔

" کیا بات ہے جعفری صاحب کی بھی —— ان جیسا بھلا آدمی کم از کم میں نے تو نہیں دیکھا "۔ اُس کی نگاہوں میں اُنس تھا، عقیدت تھی، محبت تھی اور میرے دل میں —— کرو اور کرو خوشامد۔ لیکن چائے تو میں پلا رہا ہوں اور خوشامد اُس کی کر رہے ہو۔ ہمت تیرے کی۔ جانے کس جنگل کا جانور ہے۔ بیٹھنے کی دیر تھی کہ داؤد نے اسلامی تاریخ کا ذکر چھیڑ دیا اور میں چپکا چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔

اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا جب داؤد اُٹھ کے گیا ہے۔ ہم دونوں کیفے سے باہر نکلے تو میرا پروگرام تھا کہ آج فری پاس پر فلم دیکھیں گے۔ لیکن داؤد نے سارا موڈ آف کر دیا تھا۔ جعفری بھی کچھ اُکتایا ہوا الگ رہا تھا۔ شاید دن بھر کی محنت کی وجہ سے یا اس لیے کہ ابھی ابھی اُس کی جیب سے بارہ آنے نکلے تھے۔ اُس کی شرافت اور علم کا وہ معتقد ضرور تھا لیکن اُس کے حلیے نے جیسے اُسے بھی بوکھلا رکھا تھا۔

تین چار روز بعد —— (بعد اس لیے کہ ان دنوں ہر روز بارش ہو جاتی تھی اور وہ بھی ایسے وقت جب دفتر سے چھٹی ملتی) جب لائبریری گیا تو اُس روز سبھی آئے ہوئے تھے۔ چودھری ایک انگریزی اخبار میں رپورٹر تھا اور اُسے تین سو روپے ملتے تھے۔ غالباً وہی ہم سب میں زیادہ پیسے پاتا تھا۔ اور وہی ہمارے لیے سینما کے فری پاس لایا کرتا تھا۔ جانے اُس ظالم نے کہاں کہاں یاری گانٹھ رکھی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہم اُس کی عزت کرتے تھے۔ اور ہمیشہ بڑے احترام سے پیش آتے تھے۔ شریف ایک بینک میں اور شاہ صاحب پوسٹ آفس میں کلرک تھے۔ سب کو بیٹھا دیکھ کے باچھیں کھل گئیں اور نہیں تو دن بھر کی تھکن

تو آتو جائے گی نا ——— سب کے سب ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے اور میں بھی داؤد کو جیسے بالکل ہی بھول گیا تھا۔ جیسا کہ رپورٹروں کی عادت ہوتی ہے کہ ایک بار پریس میں خبر دے آئیں تو پھر اس کی تشہیر کئے بغیر ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ چودھری کوئی تازہ تازہ خبر سُنا رہا تھا، وہ بھی کسی اغوا کی اور ہم سب بڑی توجہ سے سُن رہے تھے۔ خبر ختم کر کے چودھری نے میز پر زور سے ہاتھ مارا اور بولا ———

آج پتہ نہیں، میری جیب میں اتنے پیسے کہاں سے آ گئے ہیں۔ چلو سب کو چائے پلاتا ہوں اور چیم ——— بہت اچھی فلم آئی ہے۔ صرف بالغوں کے دیکھنے کی ہے۔ پاس دے آیا ہوں۔ لیکن جلدی کرو نا جعفری، تم میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو ———"

جعفری کی بوکھلاہٹ پر ہمیں ہنسی آ گئی۔ وہ کارڈ سمیٹنے لگا اور ہم شریف سے ایک اور قصہ سُننے لگ گئے۔ دوپہر میں کوئی عورت بینک میں روپے جمع کرانے آئی تھی اور شریف جیسے بے ہوش ہو گیا تھا کہ وہ عورت، عورت کم تھی اور کسی ٹیلر ماسٹر کا اشتہار زیادہ تھی۔ جعفری چائے کا پیالہ اُٹھا چکا تھا اور ہم قہقہے پر قہقہہ لگاتے ہوئے باہر نکلنے ہی لگے تھے کہ سامنے کی ایک الماری کے عقب سے اپنے اسی حلیے سمیت ایک کتاب بغل میں دبائے داؤد نکل آیا۔ ہم سب یوں چپ ہو گئے جیسے داؤد کو نہیں کسی سانپ کو دیکھ لیا ہو۔ اُلجھے اُلجھے سے قدموں سے وہ ہمارے پاس آیا، سلام کیا جس کا جواب ظاہر ہے کسی نے نہ دیا۔ پھر بولا:

" جعفری صاحب۔ یہ کتاب لے جاؤں ——— " جعفری کے چہرے پر سیاہی سی تیر گئی۔

" لے جائیے، ضرور لے جائیے " اُس نے جاتے ہوئے بھی سلام کیا جس کا پھر کسی نے جواب نہ دیا۔ وہ باہر نکل گیا تو جعفری بڑبڑا اُٹھا۔

" لے جائیے۔ لے جائیے۔ آپ کے باوا کا مال ہے۔ یہ لائبریری اُسی ہی کی تو بخشی ہوئی ہے " میں نے چودھری سے پوچھا۔

" چودھری صاحب۔ یہ ہے کون ——— " چودھری کا بھی موڈ جیسے آف ہو چکا تھا۔

" چھوڑو یار۔ کسی انسان کی بات کرو۔ اس تو بڑے کے متعلق تم کیوں اتنے پارٹی کولر (PARTICULAR) ہو رہے ہو۔"

ہم سب چائے پینے، سینما دیکھنے جا رہے تھے لیکن ہم میں سے کسی نے بھی اُسے ساتھ چلنے کی دعوت نہ دی۔ لائبریری سے نکل کے ہم جیسے بھول گئے کہ داؤد نام کا بھی کوئی شخص ہمیں ملا تھا۔ کسی کو کیا پڑی ہے، جو مفت میں اتنی سُہانی شام ضائع کرے۔

پتہ نہیں انسان اس کا عادی کیوں ہے کہ کسی کو دیکھ کے پہلی ہی نظر میں نفرت کرنے لگتا ہے۔ لیکن اس نفرت کے باوجود میرے دل سے کرید کا جذبہ نہ گیا۔ اور میری حالت کچھ ایسی تھی کہ جب تک داؤد کے متعلق نہ جان لوں گا، میرا کھانا ہضم نہ ہو گا۔ دو چار روز تو جعفری اور چودھری ٹالتے رہے۔ وہ بھی صرف وضع داری کے ہاتھوں اُس سے مل لیتے تھے، ورنہ نفرت تو وہ بھی کرتے تھے۔ پر ایک شام جب میں نے چودھری کا پیچھا نہ چھوڑا تو اُسے غصہ آ گیا۔ پرچ میں ڈالی چائے پھر سے پیالی میں انڈیل کے بولے۔

" یار۔ تم سے ایک بار کہا تھا کہ کسی گدھے کی ہسٹری شیٹ سُن لو، تو اچھا ہے لیکن داؤد کے متعلق کچھ نہ پوچھو۔ پر تم نہیں مانتے۔ تم ہی بتاؤ اس بھاگ دوڑ میں تو ہر روز ہی کتنے لوگ متعارف ہوتے ہیں۔ اب کون ہر کسی کے پیچھے بھاگتا رہے اور پھر ——— " آن کا لہجہ ذرا کڑوا تھا۔

داؤد کی کہانی ذرا مختصر سی تھی۔ کہ وہ تقسیم کے وقت ہندوستان میں اپنا سب کچھ لٹا آیا تھا۔ لٹایا بھی کچھ اس طرح کہ ایک ایک عزیز کو اپنے سامنے ذبح ہوتے دیکھا۔ پہلے وہ دہلی میں ایک بسکٹوں کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ والدین بے حد غریب تھے۔ چوتھی جماعت تک اُس نے پڑھا بھی تھا لیکن اب تو پیٹ بھرنے کو روٹی نہ تھی، اُسے پڑھاتا کون ——— لیکن بسکٹوں میں تمباکو لپیٹنے کے باوجود ذہن کی تشنگی ہمیشہ برقرار رہی۔ کارخانے سے نکل کے وہاں بھی وہ ہمیشہ ہی ایسی لائبریریوں میں بھٹکتا پھرتا کہ جہاں الماریاں بھری ہوتی تھیں۔ لیکن داؤد جیسے لڑکے کو سونگھنے کے لئے بھی نہ مل سکتی تھیں۔ پھر اُس نے ایسے دوست تلاش کر لیے تھے۔ جو شعر تعریفاً کبھی کبھی کتاب خرید لیتے تھے لیکن پڑھتے نہ تھے۔ گو کتاب ملتی تو وہاں سے بھی نہ تھی لیکن وہ کم از کم دیکھ تو لیتا تھا، چھو تو سکتا تھا۔ اور نہیں تو دو چار ورق ہی اُلٹ لیتا تھا۔ تقسیم سے پہلے ہی اُسے کارخانے سے چھٹی مل گئی۔ پھر جب وہ اپنے عزیز و اقارب اور والدین کے ساتھ روشن مستقبل کی طرف بڑھا تو یہ رشتے ایک ایک کر کے ساتھ چھوڑنے لگے جیسے وہ سب کے سب مٹی کے کھلونے ہی تو تھے یہاں تک کہ جب وہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا تو اُس کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا۔ اور وہ منہ اُٹھائے حدِ نظر تک پھیلی زمینوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب وہ اکیلا ہے، بالکل تنہا ———

یہاں آ کے اُس نے نوکری کے لیے دوڑ دھوپ نہ کی۔ اُس کے اندر کا انسان، اندر کی ساری گرمی، سارا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ایک ایسی بے حسی چھائی تھی کہ جو خون کے قطرے قطرے میں پھیل کے اُس کی ہر خواہش اور ہر آرزو کو کچل گئی تھی۔ ویسے دفتر میں نوکری کا سوال یوں پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اُس کے پاس تعلیم تھی ہی کہاں۔ اور جو کام وہ جانتا تھا، اب کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں اُس نے ایک کوٹھڑی کرائے پر لے رکھی تھی اور وہیں رہ رہا تھا۔ جانے وہ اُس کا کرایہ کہاں سے ادا کرتا تھا۔ گرمی سردی میں اُس کے جسم پر ایک سا ہی لباس دکھائی دیتا تھا۔ کھانے کو مل گیا تو کھا لیا، نہ ملا تو دس دس روز تک فاقہ کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، اُس کے گال پچکے ہوئے تھے۔ البتہ وہ لائبریریوں میں جاتا اب بھی تھا۔ اچھی کتاب کو دیکھ کے اُس کی رال اب بھی ٹپک پڑتی تھی۔ اور اگر جعفری اُن دنوں اُن کے کتابچے دیتا تو اُسے جیسے جنّت مل جایا کرتی تھی۔

یہ ساری باتیں چودھری نے جیسے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہیں۔ اس لیے کہ وہاں بیٹھے ہوئے اور لوگوں میں سے کسی کو بھی ان باتوں سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ اب تک جانے کس کس موضوع پر بات کر چکے تھے۔ دو مرتبہ چائے پی چکے تھے۔ اور ہم سے یوں لاتعلق ہو گئے تھے جیسے ہم اس ہوٹل میں موجود ہی نہ ہوں۔ اس وقت شریف بڑی دلچسپی اور چٹخارے سے ابھی مینوالا کے ایک رقص کا ذکر کر رہا تھا۔ اور باقی اُسی رقص کے ذکر کے نشے میں دُھت سن رہے تھے۔ چودھری نے تازہ چائے منگوائی اور پھر سرگوشی کی۔

" لیکن یار۔ تم سن کے حیران ہو گے کہ وہ تو اچھا خاصا شاعر ہے۔ گو آج تک اُس نے ذکر کبھی نہیں کیا، نہ ہی ہمیں کبھی اپنی کوئی غزل یا نظم سنائی ہے۔ لیکن ایک بار ——— ہوا یوں کہ میں ایک سٹوڈیو میں ایک تقریب کوَر کرنے گیا۔ کسی فلم کی رسمِ افتتاح تھی۔ سچ جانو، یہ دیکھ کے مارے حیرت کے میری آنکھیں پھٹ گئیں کہ ——— جنھیں ہار پہنائے جا رہے تھے اُن میں ایک داؤد بھی تھا۔ گو اُس کا چہرہ، اُس کی غلاظت، اُس کا لباس سب کچھ وہی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُس فلم کے تین گیت اُسی

نے لکھے تھے اور ان گیتوں کا معاوضہ اُسے صرف بیس روپے ملے تھے۔ اِدھر اُدھر کی افواہوں سے پتہ چلا کہ اُس کا دل چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ یوں بھی یار۔ اس سے بڑھ کے اور کون سی چوٹ ہو گی کہ انسان بھرے بازار میں تنہا رہ جائے۔ اس سے بڑا غم اور دُکھ کیا ہو گا۔" چودھری کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ لیکن میں اب تک تو شاعروں کو ایک بڑی چیز سمجھا تھا، پر جب پتہ چلا کہ داؤد بھی شاعر ہے تو مجھے ایک دم اس ساری قوم سے نفرت ہو گئی۔ بیکار، فضول، قوم کے عضوِ معطل ——— اتنے میں شاہ جی نے آواز دی۔

"اوئے کیوں اُس تخمِ بد کا ذکرِ بد کر کے اپنے آپ کو پاگل بناتے ہو ———" چودھری کے لہجے کی ہمدردی بھی ڈھل گئی اور ہم ایک بار پھر اُسے کوس کے سوچنے لگے کہ کیا ایسا کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ داؤد سے جان چھوٹ جائے۔ پھر ہم نے اپنی نئی اسسٹنٹ سیکرٹری پر تبصرہ آرائی کی اور بکھر گئے۔

ایک دو دن نہیں پورے دس دن داؤد ہمیں دکھائی نہ دیا تو جیسے ہم نے سکھ کا سانس لیا۔ ایک دو بار اُس کا ذکر بھی کیا تھا۔ لیکن یہ ذکر سے زیادہ اظہارِ تشکر تھا۔ جعفری کے منہ سے اگر کبھی کبھار یہ جملہ نکل بھی جاتا ——— "نہیں یارو۔ تم زیادتی کرتے ہو۔ وہ آدمی اچھا تھا ———" تو ہم اُسے اِس بُری طرح چھیڑتے، اتنے طعنے دیتے، داؤد سے اُس کی اَن کہی رشتہ داریاں قائم کرتے کہ بیچارے کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اتنے دنوں تک داؤد نہیں آیا تو ہمیں جیسے اطمینان ہو گیا۔ اطمینان بھی کچھ اس طرح کا کہ جیسے اپنے ہی گھر میں رکھی کوئی چیز اتنی بُری لگے کہ آپ تنگ آ کے اُسے باہر پھینک دیں اور پھر بڑے سکون سے بیٹھ جائیں کہ اب وہ شے آپ کو دکھائی نہ دے گی، جو پہلے ذہنی انتشار کا باعث بنتی تھی ———

لیکن ایک روز جو میں لائبریری کے دروازے پر پہنچا ہوں تو داؤد ——— سامنے جعفری کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میرے قدم وہیں رُک گئے۔ جی چاہا، واپس چلا جاؤں۔ لیکن پھر سوچا، میں تو جعفری سے ملنے آیا ہوں۔ داؤد سے کیا غرض۔ میں نے اُسے سلام بھی نہ کیا۔ چپ چاپ جعفری کے پاس بیٹھ گیا۔ جعفری بات تو کر ہی رہا تھا لیکن اُس کی آواز میں اگر محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی۔ کچھ دیر وہ باتیں کرتے رہے، پھر چپ ہو گئے۔ داؤد کا حلیہ ویسا ہی تھا۔ وہی چہرہ، وہی رنگت، وہی گلابی بُش شرٹ، نیلی دھاریوں والا پاجامہ اور پھٹے پھٹے سلیپر ——— کپڑے البتہ دُھلے ہوئے تھے۔ لیکن چہرے کی نحوست ——— بہت دیر انتظار کرنے کے باوجود جب چودھری اور دوسرے دوست نہ پہنچے تو ہم لائبریری بند کر کے ریستوران کی طرف ہو لیے۔ سارے راستے میں ہم نے کوئی بات نہ کی۔ صرف جعفری نے اتنا کہا تھا۔

"چائے بھی کیا چیز ہے، دیکھ کے ہی ساری تھکن نو دو گیارہ ہو جاتی ہے ———" اُس کے بعد پھر ہمارے لبوں پر قفل لگ گئے۔

ریستوران میں جا کے بیٹھے تو باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بیرا آیا تو جعفری نے محض تکلف کے طور پہ داؤد سے پوچھ لیا۔

"چائے پئیں گے نا آپ بھی ———" داؤد ہلکی سی کھسیانی ہنسی ہنسا۔ پھر کہنے لگا۔

"پہلے اگر کھانا منگوا دیں تو اچھا ہے۔ پھر چائے پی لیں گے ———" اُس کی آواز میں مجبوری تھی۔ جعفری نے نہ چاہتے

ہوئے بھی کھانے کا آرڈر دیا اور اپنے لیے چائے منگوائی۔ ہم چائے پیتے رہے اور داؤد کھانا کھاتا رہا۔ کھانا نہیں تھا پل پڑا تھا۔ اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ نہ جانے وہ کتنے دنوں کا بھوکا ہے، لیکن پھر بھی اُس کی بے تکلفی نے مجھے جیسے کاٹ کھایا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔

"سنا ہے آپ فلموں کے لیے گیت بھی لکھتے ہیں ———" میرا لہجہ ایسا تھا، جیسے کہنا چاہتا ہوں، سنا ہے تم جھک بھی مارتے ہو۔ روایتی قسم کی مسکراہٹ لبوں پر آئی جسے روٹی کے لقمے نے چھین لیا۔ آنکھیں پلیٹ کی سطح پر گڑائے کہنے لگا۔

"شاعر تو میں کہاں ہوں جی ——— نہ تعلیم ہے نہ مشاہدہ نہ فکر ——— ہاں! چند الفاظ جوڑ لیتا ہوں"

میں نے اصلی بات پوچھی "تو کیا فلم والے آپ کو پیسے نہیں دیتے ———" میں کہنا بھی چاہتا تھا کہ میاں! جب فلموں سے تمھیں پیسے ملتے ہیں تو ہمارے سر لوجھ کیوں ڈالتے ہو۔ رُک کے بولا ——— "دو چار روز روٹی کھلا دیتے ہیں میرے لیے یہی کافی ہے، نہ اُنھوں نے کبھی کچھ دیا، نہ میں نے مانگا۔ مانگ کے کروں گا کیا۔ مانگوں بھی تو کس کے لیے۔ تنہا آدمی ہوں اچھی بُری گزر رہی ہے ——— پھر پیسے سے کے اُنھیں جاننا ہے کیا ———" مجھے اُس کی یہ منطق نہایت واہیات لگی۔

اور جب چائے آئی کے سامنے آئی تو جعفری کو دیکھ کے وہ ایک بار پھر کھسیانی ہنسی ہنسا ——— "جعفری صاحب! کھانا تو آپ نے کھلا دیا۔ اگر بگلے کا ایک سگریٹ بھی منگوا دیں تو ———" جعفری کا لہجہ بڑا درشت تھا "میرے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں" داؤد پھر ہنس دیا "کوئی بات نہیں" جعفری کا تو اُس ریستوران میں حساب چلتا تھا، میری جیب میں البتہ پیسے ضرور تھے لیکن کون اب دو پیسے حرام کرتا، میں بھی چپکا بیٹھا رہا ——— داؤد نے ایک گھونٹ بھر کے پھر جعفری سے کہا۔

"مان گیا ہوں آپ کو تو جعفری صاحب۔ کس سادگی اور بے تکلفی سے کہا ہے کہ میری جیب میں تو ایک پیسہ بھی نہیں۔ واہ واہ۔ سبحان اللہ ———" اُس کے لہجے میں محبت تھی، جعفری بولا نہیں لیکن میں اندر ہی اندر کھول اُٹھا۔ کرو خوشامد۔ شاباش بیٹے کرو خوشامد۔ بہت پیسے کی ——— جعفری کا موڈ تو خراب ہے، آف ہونا ہی تھا کہ بیچارے کے سر مفت کے کھانے کے پیسے آ گئے تھے۔ سو وہی موڈ لیے وہ اُٹھا اور بات کیے بغیر گھر چلا گیا۔ میں نے داؤد سے بات تک نہ کی، سلام تک نہ کیا اور سائیکل پر بیٹھ کے گھر کی طرف ہو لیا۔

اگلے روز ہم سب لائبریری میں اکٹھے تھے۔ میں نے سارا قصہ دوسروں کو سنا دیا تھا۔ قصہ کیا سنا دیا تھا، اچھا خاصا افسانہ گھڑ لیا تھا۔ دوسروں نے بھی نمک مرچ لگا کے جو جعفری کو تنگ کیا تو وہ جیسے چلا اُٹھا۔

"بس کرو یار، میرے تو باپ کی بھی توبہ۔ جو اُس حرام زادے کو پھر منہ لگا جاؤں ———" حرام زادے کے لفظ پر ہم سب بےحد خوش ہوئے، خوب ہنسے۔

اُس شام چودھری نے ہمیں چائے پلائی۔ فلم دکھائی اور پھر بچھڑنے سے پہلے ہم نے طے کر لیا کہ اگر اگلے روز داؤد لائبریری میں آئے تو اُسے جوتے مار کے وہاں سے نکال دیا جائے۔ بڑا شاعر بنا پھرتا ہے۔ جیب میں کھانے کو نہیں اور اکڑ ہمیں دکھاتا ہے، ہونہہ ———

لیکن دوسرے روز ہم سب بہت دیر تک منہ لٹکائے بیٹھے رہے، انتظار کرتے رہے لیکن داؤد نہ آیا۔ دوسرے

روز ہی گیا، وہ تو پورے دو ماہ سے غائب تھا۔ جیسے وہ لائبریری کا راستہ ہی بھول گیا ہو۔ ہم نے بھی اُسے بھلا دیا، وہ یاد رکھنے کی چیز تھا ہی کب، جو اُسے یاد رکھا جاتا ——

اب تو ہمارا اپنا ملنا جلنا بھی کم ہو چلا تھا۔ شریف کی تبدیلی ہو گئی تھی اور وہ چلا گیا تھا۔ شاہ صاحب کو جانے کیا ہوا کہ ایک دم تسبیح سنبھال کے مصلے پر بیٹھ گئے اور چودھری کو دنیا کے بکھیڑوں نے اُلجھا دیا۔ ایک بار آیا بھی تو سخت متفکر تھا۔ اُس کے بڑے بیٹے کی شادی ہو رہی تھی۔ اُسی کے انتظام میں بیچارہ دن بھر بھاگتا رہتا تھا۔ بس لے دے کے اب تو جعفری اور میں ہی رہ گئے تھے، جو کم و بیش روز مل بیٹھتے تھے۔ جعفری کی تنخواہ بڑی قلیل تھی کھانے والا اچھا خاصا خاندان تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہر روز ہر شام جب تک ریستوران میں چائے نہ پیتا، اُسے آرام نہ ملتا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے چائے پینے جاتے تھے۔ کوئی دو ماہ گزر گئے۔ ان مہینوں میں نہ تو چودھری دکھائی دیئے اور نہ ہی داؤد کی خبر ملی۔ ایک روز تو میں نے جعفری سے پوچھ ہی لیا۔

"اس کا سراغ لگانا چاہیئے کہ چودھری نے شادی بیٹے کی رچائی ہے یا اپنی، جو وہ سرے سے غائب ہی ہو گیا ہے۔"

دوسرے ہی روز جب ہم لائبریری سے اُٹھنے لگے تو چودھری اچانک چلا آیا۔ جعفری نے تو دیکھتے ہی جیسے نعرہ لگایا۔

"بڑی عمر ہے آپ کی بھی چودھری صاحب۔ ابھی کل ہی آپ کو یاد کر رہے تھے۔" چودھری نے بیٹھ کے سگریٹ سلگایا اور پھر سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا۔ وہ خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے بھی میلے تھے اور ہونٹ خلافِ معمول بھینچے ہوئے تھے۔ ہم اُٹھے اور ریستوران کو ہو لیے۔ راستے میں پوچھا "کیا بات ہے چودھری صاحب۔ آپ راستہ بھولے بھی ہیں تو اتنے پریشان اور کھوئے ہوئے ہیں کہ ——" میز کے گرد بیٹھ کے چودھری بڑے دکھ سے بولا۔

"کیا کہوں یار۔ زندگی کے دکھ بڑے عجیب ہیں۔ ایک ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا گردن دبوچ لیتا ہے۔ بیٹے کی شادی میں اسی لیے ٹالتا آ رہا تھا کہ تھوڑا تھوڑا کر کے ہم کچھ بنا لیں گے۔ آخر بیٹے کی شادی تھی۔ ابھی کچھ ہوا تھا اور کچھ نہیں ہوا تھا کہ لڑکی والوں نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ شادی نہیں کرتے تو رشتہ کسی اور جگہ دے دیں گے۔ اب یار ——" چودھری نے جھک کے چائے کا گھونٹ بھرا اور پھر چپ ہو گیا۔ مریض سے نہ کونین کی گولی نگلی جاتی تھی نہ بیچارہ تھوک سکتا تھا۔ چودھری نہ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی چپ رہ سکتا تھا ——

"اب یار —— اور تیاری تو میں نے کر لی ہے لیکن کل شام بارات جائے گی۔ اور میری جیب میں ایک پیسہ تک نہیں ——" چودھری نے بڑے دکھ سے آنکھیں بند کر کے سگریٹ کا کش لیا اور دھواں یوں اُگلا جیسے سینے کا سارا درد اُگل رہا ہو۔ جعفری نے زمانے کے تھپیڑے کچھ زیادہ ہی کھائے تھے، اُس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں، کانپتی آواز میں بولا۔

"چودھری صاحب قسم خدا کی، گھر کا خرچ اُدھار پر چل رہا ہے۔ میرے پاس اگر دس روپے بھی ہوتے تو میں حاضر کر دیتا —— کاش! میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ——" میں نے اپنے دل کو کریدا۔ میرے پاس چھ سو روپے تھے تو لیکن

سردیاں آ رہی تھیں۔ سوٹ بنوانا تھے، کئی دوسری چیزیں خریدنا تھیں۔ چودھری کو دیکھ کے لیتا کس سے۔ میں نے بھی رسمی سے دو چار فقرے کہہ کر اپنی معذوری کا اظہار کر ڈالا۔

"نہیں بھائی۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ جانتا ہوں سب کے حالات ایک جیسے ہیں۔ پھر دس بیس سے کام بھی تو نہیں چلتا" تھوڑی دیر ہم یونہی سر جھکا کے بیٹھے رہے۔ بقیہ چائے وہیں ٹھنڈی ہو گئی۔ جو پی تھی اس کا لطف بھی کرکرا ہو گیا تھا۔ پھر چودھری اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو یار۔ ایک سیٹھ کے پاس چلتے ہیں۔ کسی زمانے میں میں نے اس کی بڑی مدد کی تھی۔" ہم اٹھ کے باہر نکل آئے۔ چودھری کہہ رہا تھا۔

"جس زمانے میں الیکشن تھے۔ میں نے اخبار کے ذریعے اسے خوب اچھالا تھا۔ میرے سہارے ہی تو وہ جیتا تھا۔"

گلیاں ناپتے، سڑکیں طے کرتے ہم شہر کے نسبتاً تنگ اور تاریک علاقے میں جا نکلے۔ چودھری نے ایک تین منزلہ مکان کے سامنے رک کے کال بیل پر ہاتھ رکھا اور دوسرے لمحے ہم سیٹھ صاحب کے سامنے تھے۔ انھوں نے بڑی گرمجوشی سے چودھری کا استقبال کیا۔ ذرا ذکر کو بلا کے چاء کا کہا اور جب کسی قدر رکتی آواز میں چودھری نے بات کی تو سیٹھ صاحب بولے۔

"یار چودھری سچی بات ہے، تم سے بڑھ کے اور کون سی شے پیاری ہو سکتی ہے اور پھر تمھارے تو میرے اوپر احسان بھی ہیں۔ لیکن یار! اس کاروبار کا تم سے کیا کہوں۔ ان دنوں تو، یوں سمجھو بالکل ہی ٹھپ ہے۔ خرچ ہی خرچ ہے اور آمدن نام کی نہیں۔ یار! تم کہو گے ——— بھئی! اگر دو چار روز تک پھر آؤ تو امید ہو سکتی ہے۔ اس وقت تو مجھے معذور سمجھو۔" ہمیں یقین تھا کہ چودھری اگر ایک بار بھی اور کہتا تو کام بن سکتا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ ایک مرتبہ بھی اس نے کتنی مشکل سے چند الفاظ کہے تھے۔ جیسے اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا ہو۔

اس کے سوا اور چارہ ہی کیا تھا کہ ہم اٹھیں اور چپ چاپ باہر نکل آئیں۔ ہم باہر چلے تو آئے پر مسئلہ وہیں تھا کہ پیسے کہاں سے لیں۔ لیکن تین منزلوں والے شاندار ڈرائنگ روم کے مالک سیٹھ کی بڑھ چڑھ کے تعریفیں کرنے لگے۔ وقتی طور پر جیسے بالکل بھول گئے کہ ہماری پریشانی کونسی ہے۔ آخری گلی رہ گئی تھی اور موڑ کاٹ کے ہمیں سڑک پر پہنچ جانا تھا۔ چودھری کہہ رہا تھا۔

"ایسے خدا ترس اور نیک لوگ روز روز تھوڑی ہی ملتے ہیں، یہ تو ———" پر منہ کی بات منہ ہی میں رہ گئی کہ ہم گلی میں داخل ہو چکے تھے اور اب اس بیٹھک کے سامنے کھڑے تھے کہ جس کے دروازے میں چوکھٹ کا سہارا لیے داؤد کھڑا تھا۔ ہم حیران ہی تو رہ گئے۔ بیٹھک خالی خالی لگ رہی تھی۔ داؤد نے ہمیں دیکھا تو کود کے گلی میں آ گیا اور ہم سے ہاتھ ملانے کے بعد جعفری سے تو وہ جیسے بغل گیر ہو گیا۔ گلی میں گو بجلی کی روشنی آ رہی تھی لیکن اس کا سیاہ چہرہ بالکل دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بازو سے پکڑے، گھسیٹتے ہوئے وہ جعفری کو بیٹھک میں لے گیا اور ہم بھی اندر چلے گئے۔ میں نے سوچا، دیکھیں تو سہی، رہتا کہاں ہے۔

چھوٹی سی بیٹھک تھی جس میں ایک بڑا میز پڑا تھا۔ میز پر دو اینٹیں اور ایک چادر پڑی تھی اور بس ——— اس کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی کپڑا، جوتا، برتن کچھ بھی نہ تھا۔ چادر وہ شاید سوتے ہوئے اوپر لیتا تھا اور میز پر ہی سوتا تھا۔ روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو مجھے دیکھ کے بڑی حیرانی ہوئی۔ تازہ شیو بنی ہوئی تھی۔ ہمیں میز پر بٹھا کے وہ خود دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

اُس کے چہرے پہ بہار سے بے عزت تھی، احترام تھا، خوشی تھی اور لجاجت بھی —— بڑے عاجزانہ انداز میں بولا۔

"میں کیا خدمت کروں آپ کی۔ دیکھئے نا، یہ جگہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے۔ چلئے، ہوٹل میں چل کے بیٹھتے ہیں۔" لیکن چودھری نے فوراً روک دیا۔

"نہیں بھئی۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک کام سے آئے تھے۔ اب چلیں گے ——"

جب تک ہم گلیوں میں چلتے رہے، سیٹھ کی تعریفیں کرتے رہے۔ تاکہ چودھری کا خیال بٹا رہے۔ لیکن اب پھر بیچارگی اُس کے چہرے پر تھی۔ داؤد کی نگاہیں پھر جھک گئیں۔ "معاف کیجئے گا۔ یہ جگہ یقیناً آپ کے بیٹھنے کے لائق نہیں پر —— آپ کیا کسی خاص کام سے آئے تھے۔ ویسے آپ پریشان سے لگ رہے ہیں۔" —— چودھری نہ جانے کیا جواب دیتا۔ مگر جعفری سے صبر نہ ہو سکا۔ گو وہ پیٹ کا ہلکا نہ تھا مگر چودھری کی پریشانی نہ دیکھ سکا۔

"بس ذرا سیٹھ کریم بخش کے پاس آئے تھے۔ چودھری صاحب کو کچھ روپوں کی ضرورت تھی ——" داؤد دیوار کا سہارا چھوڑ کے بڑی فکر سے بولا۔

"اچھا —— یہ کام تھا آپ کو ——" اور چودھری کو وہ سب کچھ ایک بار پھر کہنا پڑا، جو وہ کسی صورت نہیں کہنا چاہتا تھا۔ ڈوبتا تنکے کا سہارا بھی تو لے لیتا ہے۔

"ہاں بھئی داؤد۔ ستم ظریفی دیکھو۔ کل بیٹے کی شادی ہے اور باپ کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ——" ایک ٹھنڈی سانس بھر کے چودھری اُٹھ کھڑا ہوا کہ اب چلتے ہیں۔ داؤد نے پھر دیوار کا سہارا لے لیا۔ اُس کے چہرے سے شکوہ سا برس رہا تھا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں چودھری صاحب —— ذرا سی بات پر اتنے پریشان ہو رہے ہیں۔ مجھے آج ہی زندگی میں پہلی بار چار سو روپے آٹھ گیتوں کا معاوضہ ملا ہے۔ ان سے کام چل جائے گا نا آپ کا ——؟" ہم میز سے اُتر چکے تھے۔ داؤد نے آگے بڑھ کے اینٹ اُٹھائی، نیچے کافی سارے نوٹ رکھے تھے۔ اُٹھا کے اُس نے چودھری کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ ہمیں جیسے کسی نے اُٹھا کے پھر میز پر سر کے بل دے پٹخا ہو —— داؤد کہنے لگا۔

"معاف کیجئے، دو روپے کم ہیں۔ میں نے عیاشی کی ہے ان سے —— پر —— کام چل جائے گا نا آپ کا ——؟" ہم تینوں گنگ تھے۔ اُسے جواب بھی نہ دے سکے۔ چودھری نے صرف اتنا کہا —— "نہیں نہیں داؤد۔ تمھارے کام آئیں گے —— تم ——" بات کاٹ کے وہ ہنس دیا۔ "میں انھیں کیا کروں گا جی —— میرے کس کام آئیں گے۔ میں تو اکیلا، تنہا ہوں۔ میرے کس کام کے یہ —— کل برات میں آؤں نا میں بھی؟" ہم اُس سے کچھ بھی تو نہ کہہ سکے۔

سڑک پر سر جھکا کے چلتے ہوئے چودھری اور جعفری جانے کیا سوچ رہے تھے۔ پر میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت کون سی گالی دوں داؤد کو —— !

البیلی

احمد شریف

حامی کے بھائی گامی نے نیلپٹر روڈ کے چوراہے پر دودھ دہی کی دکان کھول لی اور حامی بلا کسی حیل و حجت کے وہاں کڑاہیاں مانجھنے لگا۔ گامی کا دودھ دہی کی دوکان کھولنا یا حامی کا وہاں کڑاہیاں مانجھنا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ کیونکہ دونوں بھائی جالندھر شہر چوک قادے شاہ میں یہی کسب کرتے تھے۔ اچنبھے کی بات صرف یہ تھی کہ اب کڑاہیاں مانجھتے مانجھتے حامی گم سُم سا ہو جاتا اور چاہتا کہ ماضی کو یکسر بھول جائے۔

ماضی کو بھولنے کے ساتھ دارو کا گہرا تعلق تھا۔ دارو دوکان کے پچھواڑے گھنی آبادی میں ایک تنگ و تاریک مکان میں رہتی تھی۔ ایک روز اسے دروازہ نیم وا کیے کھڑی دیکھ کر حامی اس کی کٹورا سی کالی آنکھوں کی بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا اور اس دن سے خیالوں ہی خیالوں میں اس نے چھوٹا سا ایک گھر بنا لیا تھا جس کے کچے آنگن میں ایک بازو سر کے نیچے رکھ کر وہ جھلنگی چارپائی پر لیٹا رہتا اور جب دارو کی گوری گوری کلائیوں میں پڑی کانچ کی چوڑیاں بجتیں تو وہ چونک پڑتا اور گھبرا کر بھرے بازار میں پھرتی سے کڑاہی مانجھنے لگتا۔

دارو کے بارے میں وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ لاہیے چٹھی رساں کی جوان لڑکی ہے۔ لاہیا چٹھی رساں دوکان کے سامنے سے گزرتے وقت عینک کے اوپر سے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے جانچتا ہوا آگے بڑھ جایا کرتا تھا۔

ایک دن گامی کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ حامی دوکان سجائے خالص بنیوں کی طرح آلتی پالتی مارے لاہیے چٹھی رساں کے انتظار میں گدی پر بیٹھا تھا کہ اس کی نظر ماجھے داوی والے پر پڑی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ماضی الف ننگا اس کی طرف چلا آ رہا ہو۔ دراصل وہ اپنے ماضی سے نہیں ماجھے داوی والے سے ڈرتا تھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید اس کا کوئی ماضی نہ ہوتا اور اگر ہوتا تو اس کے ساتھ کوئی تلخ یاد وابستہ نہ ہوتی۔

حامی نے جلدی سے نظریں چرا لیں اور صافی لے کر اپنے دھیان ترازو صاف کرنے لگا۔ ماجھا داوی والا اکڑ کر دکان کے آگے بڑھے ہوئے گیلے تختے پر اکڑوں بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ جالندھر سے کراچی تک سینکڑوں میل کی مسافت طے کرنے کے باوجود اس کے سراپا پر ذرا سی دھول بھی نہیں جمی تھی۔ وہ اس وقت بھی کالی کناری والی سفید دھوتی اور کھلی آستینوں کا کرتہ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ سر پر بائیں آنکھ پر ڈھلکی ہوئی پہلوانوں کی طرح کس کر پگڑی بندھی ہوئی

تھی جو اس کے اکہرے بدن اور پانچ فٹ سے کم لمبے قد پر بڑی مضحکہ خیز لگتی تھی۔ حامی نے سرد سے لہجے میں رسماً پوچھا۔

"سنا بھئی ماجھے ٹھیک ٹھاک تو ہے؟"

ماجھے داری والے نے چٹکی بجا کر سگریٹ کا گل جھاڑا اور لاپرواہی سے بولا۔

"اپنی زندگانی تو تنور میں لگے ہوئے پھلکے کی طرح سڑ رہی ہے پیارے۔ کبھی تنور والے کو خیال آئے گا تو اتار لے گا۔"

اور پھر لاتعلق سا ہو کر سگریٹ پینے لگا۔

جالندھر میں حامی اور وہ ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ پھر بھی شروع شروع میں ان میں کوئی دوستی نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کے مشاغل جدا جدا تھے۔ ماجھا داری والا اپنا زیادہ تر وقت نوہریوں کی سرائے کی چھت پر گزارتا جہاں چوک قادے شاہ کے کھاتے پیتے گھرانوں کے نوعمر لڑکے شوقیہ فلیش کھیلا کرتے تھے۔ وہ دو بڑی اینٹیں پاؤں تلے رکھ کر ٹکڑی میں بیٹھ جاتا اور جونہی کوئی داؤ جیتتا وہ انگلی سے ایک اکنی اپنی طرف سرکا لیتا۔ یوں تو یہ معمول تھا۔ پھر بھی زیادہ ہارنے والا اکنی نکال لینے پر برہم ہو کر اگر کبھی اس سے پوچھتا،

"ابے تو اکنی کاہے کی کھینچ رہا ہے؟"

تو وہ سینہ ٹھونک کر جواب دیتا۔

"ابے پولیس کا مقابلہ بھی تو ہمیں نے کرنا ہے۔"

جالندھر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی تھی۔ اس لیے کبھی کبھار ہندو مسلم فساد بھی ہو جایا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ چوک قادے شاہ میں بجلی کے کھمبے کے نیچے آ کھڑا ہوتا اور آنے جانے والوں کے ساتھ گذشتہ فسادات میں اپنے من گھڑت کارناموں کا لامتناہی سلسلہ چھیڑ دیتا۔ باتوں کے دوران وہ بار بار نمایاں طور پر اپنی ڈب کو ٹٹولتا اور جب کوئی پوچھتا۔

"کیا چھپا رکھا ہے ماجھے!"

تو وہ پوچھنے والے کے قریب ہو کر رازدارانہ لہجے میں کہتا۔

"چاقو ہے یار۔ فساد اور جنگل کی آگ کا کیا پتہ کب پھیل جائے۔"

اردگرد کھڑے ہونے والے مرعوب ہو جاتے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس نے اس کے ہاتھ میں کبھی کھلا ہوا چاقو دیکھا ہو۔ ویسے اس نے چھوٹے موٹے بدمعاش کی حیثیت سے علاقے میں نام پیدا کر لیا تھا۔

اور حامی ان دنوں یارو کی ٹہل سیوا میں لگا ہوا تھا۔ یارو کی اٹھان بڑی لاجواب تھی۔ حامی چاہتا تھا اسے تیار کر کے اس کا جوڑ گڑھ شنکر والے گروادر سے ڈلوا دے جس کی کشتی کی شہرت دور دور تک ہو چلی تھی۔ اب پتہ نہیں حامی کے بھائی گامی کی دکان کا دودھ ناخالص تھا یا یارو ہی کر اللہ کی مار تھی کہ جوں جوں حامی اسے کھلاتا پلاتا وہ کسرت کے نام سے بدکتا اور اکثر چپکے سے کہیں غائب ہو جاتا۔

ایک دن حامی کے کان میں بھنک پڑی کہ یار دا فرید کی بصری پر دم مارتا ہے۔ بصری کے لیے ان دنوں اپنا جوبن سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اور ہاتھ منہ لگتے نوجوانوں کے ساتھ اکثر اس کا نام لیا جاتا تھا۔ یہ سن کر حامی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے یار دا کو چوک فائے شاہ میں گریبان سے پکڑ لیا اور اندھا دھند جوتیاں برساتے ہوئے کہنے لگا۔

"سالے ہمارا ہی مال حرام کر رہا ہے۔"

شور سن کر تماشائی اکٹھے ہو گئے۔ اتفاق کی بات کہ اس روز چوک فائے شاہ میں سیّدوں کے ہاں چھوٹی موٹی چوری کے سلسلے میں تھانہ آیا ہوا تھا۔ شور سن کر سکھ تھانیدار تلملا کر باہر نکلا اور دروازے ہی سے دھاڑا۔

"کون ہے مادر...... کیا شور مچا رکھا ہے؟"

تھانیدار کی صورت دیکھ کر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ ماں کی گالی سن کر حامی کا منہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ اسے جیسے کسی نے تنی کمان میں رکھ کر چھوڑ دیا۔ دھاڑ سے ایک ٹکر تھانیدار کے سینے پر پڑی۔ دوسرے لمحے وہ دیوار کے ساتھ والے نالے میں بے ہوش پڑا تھا۔ لوگ بدحواس ہو کر بھاگ گئے مگر اس مشکل کے وقت ماجھا داری والا اچھی ہری چھٹی لے کر سارے کے سارے علاقے میں گھوم گیا۔ چاروں طرف آگ لگ گئی —— ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ ہندو مسلم فساد ہو گیا —— اور یوں سکھ تھانیدار کے سینے میں بھڑکتی آگ ماجھے داری والے کی لگائی ہوئی آگ کے نیچے دب کر رہ گئی۔

اس واقعہ کے بعد ماجھا داری والا جالندھر شہر اور اس کے گرد و نواح میں حامی کا نام بنک نوٹ کی طرح چلانے لگا حامی کا نام سن کر مالدار لوگ جھرجھری لے کر سہم جاتے۔

لیکن ان سب باتوں کا تعلق جالندھر سے تھا جس طرف اب کوئی سڑک نہ جاتی تھی۔ اور حامی چاہتا تھا اس کے ماضی کی طرف جانے والی سب سڑکیں بھی اسی طرح بند ہو جائیں۔

وہ ابھی ماضی کی یادوں ہی میں کھویا ہوا تھا کہ ایک دراز قامت مکرانی جھومتا جھامتا دکان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاتھ آگے پھیلا کر شہادت کی انگلی اس طرح ہلائی کہ ساتھ تک تک کرتا تو گمان ہوتا کتے کے پلے کو بلا رہا ہے۔ حامی نے صندوقچی کھولی اور دس روپے کا نوٹ نکال کر بنا کچھ کہے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مکرانی روپے لے کر اگلی دکان کی طرف بڑھ گیا۔ ماجھے داری والے نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"یہ کیا؟"

"نذرانہ"

حامی جذبات سے عاری آواز میں بولا اور سر جھکا کر باٹوں سے کھیلنے لگا۔ ماجھا داری والا نتھنے پھلا کر نفرت سے پھنکارا۔

"تو یہاں بھی سالی مجاوریاں چلتی ہیں"

اس سے پہلے کہ حامی کوئی جواب دیتا اس نے بلند آواز سے مکرانی کو پکارا۔

" ابے او کالشین! ادھر آ۔"

اور پھرتی سے اُٹھ کر آدھے راستے میں مکرانی کے بالمقابل آ کر تحکمانہ لہجے میں بولا۔

" دس کا ہاپا نکال ادھر۔"

مکرانی نے ایک آنکھ نیم وا کر کے اس پر حقیرانہ نگاہ ڈالی اور حلاف اُمید اُلٹے ہاتھ کی ایک ایسی دی کہ ماجھا دادی والا ہوا میں اُچھل کر بیچ سڑک میں جا گرا اور اس کے سر پہ بندھی ہوئی پگڑی کھل کر اس سے بھی دو قدم آگے جا گری۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر حامی کے سارے وجود میں بجلی کا کوندا سا لپک گیا۔ وہ ہوائی کی طرح بے قابو ہو کر مکرانی کی طرف دوڑا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا بھرپور ٹکر اس کے چوڑے چکلے سینے پر پڑی۔ مکرانی کو سڑک پہ ڈھیر ہوتے دیکھ کر ماجھا دادی والا جلدی سے اُٹھا اور اس کی جیب سے دس کا نوٹ نکال کر اپنے کھیسے میں ڈال لیا۔

لیکن پھر انھیں دوکان پر چڑھنا نصیب نہ ہوا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے مکرانیوں کا ٹڈی دل نکل کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ حامی اور ماجھے دادی والے کی آنکھوں کے سامنے پتنگوں کے ہجوم ناچ ناچ کر روپوش ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ماحول بیوہ کی مانگ کی طرح اُجڑ گیا —— ایک واحد مکرانی ہی تھا جو بے تعلق سا بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ آج تک کوئی مائی کا لال ایسا پیدا نہ ہوا تھا جو اس کے چھتے میں ہاتھ ڈال کر بچ نکلا ہو۔ حامی اور ماجھے دادی والے کی تو بساط ہی کیا تھی! پھر اس نے بھی مسکرا کر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ گردو پیش پہ ڈالی اور مطمئن ہو کر اپنے راستے پہ ہو لیا۔

اگلے روز سول ہسپتال میں جس وقت حامی کو ہوش آیا گامی اس پر جھکا سسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی بڑھی ہوئی داڑھی میں موٹے موٹے آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ حامی کے مُنہ سے مُنہ ملائے درد بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

" آنکھیں کھول حامی۔ دیکھ میں بلا رہا ہوں تجھے گامی —— ابے کچھ بول تو سہی حرامزادے۔"

حامی نے آنکھیں کھول کر مسکرانے کی کوشش کی۔ بھائی کو ہوش میں آتے دیکھ کر گامی کے چہرے پر نور سا پھیل گیا۔ اور وہ بے قابو ہو کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ حامی میں اتنی سکت نہ تھی کہ اسے دلاسہ دے سکتا۔

ماجھا دادی والا ایک رات اور ایک دن موت اور زندگی کے درمیان لٹکا رہا اور پھر چپکے سے اس نے بھی آنکھیں کھول لیں۔ حامی نے اسے ہوش میں آتے دیکھ کر بڑے پیار سے آنکھ ماری۔ ماجھا دادی والا لمحہ بھر کے لیے شرما گیا اور پھر دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

اتنے میں حامی کی نظر لاہیے چھٹی رساں پر پڑی۔ وہ بھی ہسپتال میں داخل تھا۔ اور اس وقت ماجھے دادی والے سے اگلے پلنگ پر سرہانے کے ساتھ ٹیک لگائے، آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر دارو کی یاد نے حامی کے دل میں چٹکی سی لی اور حیا آلود سانولی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ لاہیے چھٹی رساں کی خدمت میں فنا ہو جاتا —— اس کے اور دارو کے درمیان دو ہی قدم کا تو فاصلہ رہ گیا تھا! مگر اس وقت وہ لاہیے چھٹی رساں اور اپنے پلنگوں کے درمیان ماجھے دادی والے کا پلنگ حائل دیکھ کر مغموم ہو گیا اور سوچنے لگا —— کتنی عجیب بات ہے۔ کبھی سینکڑوں میلوں کے فاصلے سمٹ کر اتنے قریب آجاتے ہیں کہ وہاں کی تکلیف وہ یادیں بھلائے نہیں بھولتیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو قدم کے

فاصلہ میں کئی جہان حائل ہو جاتے ہیں ——اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس طرح محسوس کرنے لگا جیسے بارش میں بھیگی ہوئی کافور پڑی چارپائی پر لیٹا ادھر سے اُدھر لڑھک رہا ہو۔

وہ ایک ہفتہ ہسپتال میں پڑے رہے۔ اس دوران میں لاہیا چھٹی رسان تندرست ہو کر چلا گیا۔

ہسپتال سے واپسی پر حامی معمول کے مطابق پھر اپنے بھائی کی دکان پر کپڑا ہیاں مانجھنے لگا۔ لیکن ماجھے دادی والے کے پاؤں میں پہیئے لگ گئے اور وہ شہر میں سرگرداں پھرنے لگا۔ وہ صبح کا گیا رات گئے واپس آتا اور منہ سر لپیٹ کر دکان کے پچھلے حصے میں سو جاتا ——حامی اس تبدیلی سے بے حد خوش تھا۔ ماجھے دادی والے کی موجودگی میں وہ ہر وقت اس عورت کی طرح سہما رہتا تھا جس کے شوہر کی دوستی اس شخص سے ہو جائے جس کے ساتھ اس عورت کا شادی سے پہلے تعلق رہا ہو۔ اس کے آنے سے پرسکون ماحول میں ہلچل مچ گئی تھی۔ حامی نہیں چاہتا تھا اس کے خیالوں کی پرسکون جھیل کی سطح پر خواہ مخواہ کوئی رہ رہ کر کنکر پھینکتا رہے۔ اس کے لیے دارو کے خیال میں کھوئے رہنے میں بڑی بالیدگی تھی۔

ایک شام ماجھا دادی والا وقت سے پہلے لوٹ آیا۔ وہ دکان کے آگے بڑھے ہوئے تختے پر آبیٹھا اور حامی کی طرف جھک کر رازدارانہ لہجے میں رُک رُک کر کہنے لگا۔

" گوالی لین، دو ڈنٹیوں والا ملکا ——$9\frac{1}{2}$ بجے رات "

حامی اس کی بات سن کر کانپ اٹھا۔ ایسے نازک موقعوں پر جالندھر میں بھی اس قسم کی اہم اور پُراسرار اطلاعات ماجھا دادی والا ہی لایا کرتا تھا۔ اس کا مطلب سمجھ کر حامی کے جی میں آئی وہ اس سے صاف صاف کہہ دے۔

" ماجھے اب تیری میری نبھ نہیں سکتی۔ تو کہیں اور چلا جا "

لیکن وہ یہ سوچ کر ڈر گیا کہ اس کے اندر چھپے ہوئے سئے حامی کو بزدل سمجھ کر کہیں وہ اس کے منہ پر تھوک نہ دے وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ ماضی سے رشتہ توڑنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اس نے نفرت سے ماجھے دادی والے کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔

اور اس رات ٹھیک $9\frac{1}{2}$ بجے رتن تلاؤ، گوالی لین میں ایک واردات ہو گئی۔ ایک مکرانی دو ڈنٹیوں والے ملکے کے پاس بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا پایا گیا۔

اس کے بعد حامی کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ ماجھا دادی والا تابڑ توڑ اہم اور پُراسرار اطلاعات لانے لگا۔ شہر میں اس قسم کی وارداتیں عام ہونے لگیں۔ کبھی کیماڑی میں گھنٹہ گھر کے پاس، کبھی جونا مارکیٹ اور کبھی آرٹلری میدان میں اکا دکا مکرانی بے ہوشی کی حالت میں پڑے ہوئے ملتے۔ بظاہر ماحول پُرسکون رہا۔ کیونکہ حامی کی دکان پر آنے جانے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے صبح اور شام حامی کو وہاں کپڑا ہیاں مانجھتے نہ دیکھا ہو۔ البتہ داد و مکرانی کے ہاں بیٹھے بٹھائے زلزلہ آ گیا تھا۔ در اصل یہ اسی کے دست و بازو تھے جو آئے دن کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔

زندگی کا نیا دور اتنا دلچسپ تھا کہ اگر لاہیا چھٹی رسان نہ ہوتا تو حامی شاید دارو کو بھی بھول جاتا۔ نیپیئر روڈ کے چوراہے پر مکرانیوں کے ہاتھوں مار کھا کر جالندھر کی فضاؤں میں سانس لینے والے حامی کے دل میں جو کانٹا سا چبھ گیا تھا اس کی کسک بھی

جاتی رہی تھی۔ اس پر بھی جب دن میں دو بار لاہیا چھٹی رساں دکان کے سامنے سے گزرتا تو حامی اس بچے کی طرح سٹپٹا جاتا جو سکول جاتے وقت اپنا بستہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہو۔ کئی روز تک وہ اس بات کا فیصلہ نہ کر سکا کہ لاہیا چٹھی رساں اس کے لیے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی کرن تھا یا چھائی اور آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی بھرپور روشنی میں بھیانک اور ہولا دینے والا سایہ —— البتہ اتنا ضرور تھا کہ اسے دیکھ کر وہ چاہتا معاملہ آر یا پار، دو ٹوک ہو جائے۔

چند دنوں کی تگ و دو اور دوڑ دھوپ کے بعد ماچھے دادی والے کی سرگرمیاں بھی ایک دم سرد پڑ گئیں۔ وہ اب پھر دکان کے آگے بڑھے ہوئے تختے پر اداس بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہتا۔ لگتا تھا اس کی ساری سکیمیں فیل ہو گئی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کر حامی اکثر سوچتا —— کراچی شہر کی سالی آب و ہوا ہی ایسی ہے۔ یہاں آ کر نہ جانے کیسے کیسے روگ لگ جاتے ہیں ——

ایک دن ایک نوعمر مکرانی لڑکا دکان کے سامنے آ کر رکا اور قدرے ہچکچاہٹ کے بعد پوچھنے لگا۔

"حامی کہاں ہے؟"

ماچھا دادی والا تیزی سے دکان سے اتر کر اس کے برابر آ کھڑا ہوا اور پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟"

"دادو مکرانی بلا رہا ہے اسے، شاہجہان ہوٹل میں"

لڑکے نے جواب دیا۔ ماچھے دادی والے کے چہرے پر ایک دم گلاب سے کھل اٹھے۔ وہ جانتا تھا کہ شاہجہان ہوٹل جو بکرا پیڑی کے علاقہ میں واقع تھا، دادو مکرانی کا اڈا تھا۔ اور بکرا پیڑی مکرانیوں کا گڑھ تھا۔ اس نے مڑ کر حامی کی طرف دیکھا اور گال کھجاتے ہوئے چند ساعت کچھ سوچنے کے بعد لڑکے سے کہنے لگا۔

"جا، اسے بھیج دے یہاں"

لڑکا چپ چاپ واپس چلا گیا۔ ماچھا دادی والا پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ لیکن اس کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے کھلنے والے گلاب مرجھا گئے۔ وہ اپنی جگہ بار بار پہلو بدلنے لگا۔ اور ایسا عالم اس پر اس وقت طاری ہوتا جب کوئی اہم فیصلہ کرنے میں اسے دشواری پیش آ رہی ہو۔ تھوڑی دیر بعد وہ بڑے جوش سے اپنی جگہ سے اٹھا اور حامی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔

"آؤ"

حامی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کہاں؟"

"شاہجہان ہوٹل۔ سالا کہیں جالندھریوں کو بزدل ہی نہ سمجھ لے"

حامی کو محسوس ہوا جیسے وہ دلدل میں دھنس گیا ہو —— حالات کا دھارا اسے سوکھی لکڑی کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ بلا چون و چرا اس کے ساتھ ہو لیا۔

نیپیئر روڈ سے بکرا پیڑی تک سواری کا راستہ خاصا دور تھا۔ اور نزدیک ترین راستہ دکان کے پچھواڑے کی گلیوں میں سے ہو کر جاتا تھا۔ دونوں گلیوں کی طرف ہو لیے اور دیر تک چپ چاپ آگے پیچھے چلتے رہے۔ یوں تو وہ راستہ اختیار کرتے ہی حامی کسی حد

تک بوکھلا سا گیا تھا لیکن دارو کی گلی کے قریب پہنچ کر تو اس کی حالت یکبارگی ایسی ہو گئی جیسے بزاز کی دکان میں رکھا ہوا ریشمی تھان اچانک گر کر کھل جائے۔ اس نے گلی کے موڑ پر رک کر بلا کسی قسم کی تمہید باندھے، ماجھے وادی والے سے کہا۔

"ماجھے تو اب بیاہ کر لے۔"

اور ساتھ ہی جیسے اندر سے اسے اپنی ہی آواز سنائی دی ——— دندی یاراں نوں لے لے ناں بھراواں ٹُرے ——— ماجھے وادی والے نے اس بے موقعہ اظہار رائے پر حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"ابے گھر میں عورت آنے سے دل لگ جائے گا۔"

"عورت! ماجھا وادی والا منہ اونچا کر کے ہنسا اور کہنے لگا "کراچی میں عورتوں کی کیا کمی۔ ایک ڈھونڈنے جاؤ دو مل جائیں۔ کھو تو عورتوں کا جلوس نکلوا دوں دکان کے سامنے سے۔"

حامی تلملا کر رہ گیا۔ اس نے پہلی بار اسے دل ہی دل میں گالی دی ——— اُلو کا پٹھا، سالے کے نزدیک ماں اور بہن تو جیسے عورتیں ہی نہیں ہیں۔ کمینہ کہیں کا ——— اس نے ہزار لعنت بھیجی۔ اور اس نازک لمحے اسے خیال آیا ——— کیوں نہ روز روز کا جھنجھٹ مٹا ہی دوں۔ ذرا سی تو بات ہے جو لاہیے چھٹی رساں سے کہنی ہے ——— وہ ماجھے وادی والے کو ذرا دیر وہاں رُکنے کے لیے کہہ کر لاہیے چھٹی رساں کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ بڑی آہستگی سے ذرا سا کھلا اور اندر سے گنگناتی ہوئی آواز آئی۔

"کون ہے؟"

وہ دارو تھی۔ اس کی آواز سن کر حامی کا رواں رواں جاگ اُٹھا۔ لیکن اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اگر دارو کی جگہ لاہیا چھٹی رساں ہوتا تو شاید تب بھی وہ اس طرح بوکھلا جاتا۔ دارو تو پھر دارو تھی۔ جس کی آواز تو آواز خیال میں بھی جادو تھا۔ وہ سحر زدہ سا کھڑا دروازے کی ہلتی ہوئی زنجیر کو دیکھتا رہا۔ اندر سے پھر آواز آئی۔

"کون ہے؟"

اور وہ ہلتی ہوئی زنجیر جیسے کھٹاک سے اس کی پیشانی سے ٹکرائی۔ اس نے اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"میں حامی ہوں۔"

اور پھر کسی انجانے جذبے کے تحت تحرک کہ اس طرح دروازے کے قریب ہو گیا جیسے اپنے دل کی دھڑکن دارو کو سنانا چاہتا ہو اور آہستہ سے پکارا۔

"دارو..."

دارو دروازہ بند کر کے اندر بھاگ گئی اور وہ ہونقوں کی طرح کھڑا ہلتی ہوئی زنجیر کو تکتا رہ گیا ——— اسے اگر اطمینان تھا تو صرف یہ کہ اس کے دل کی آواز اس گھر تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اسے شک سا تھا کہ جب دارو دروازہ بند کر کے بھاگی تو اس نے اس کا ہلکا سا مترنم قہقہہ بھی سنا تھا۔

وہ دونوں بکرا پیڑی کے علاقے میں داخل ہوئے تو حامی ابھی تک دآرو کے خیال میں گم تھا۔ البتہ ماجھے وادی والے نے محسوس کیا جیسے چاروں طرف عجیب سا سناٹا چھایا ہوا ہو۔ لوگوں کی آمد و رفت کے باوجود پر ہول سی خاموشی طاری تھی۔ اس نے نتھنے پھلا کر زور زور سے سوں سوں کی جیسے خطرے کی بو سونگھ رہا ہو اور پھر حامی کو لے کر دندناتا ہوا شاہجہان ہوٹل میں گھس گیا۔

داد ومکرانی وہاں موجود تھا اور ساتھ والے کمرے کے دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھا چاقو سے میز کی لکڑی چھیل رہا تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ دونوں اس کے بالمقابل بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی ماجھے وادی والے اور داد ومکرانی نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اوپر رومال ڈال لیا اور یوں اپنے رنگ میں کاروباری معاملہ طے کرنے لگے۔ حامی بیٹھا ان کا منہ تکتا رہا۔ ہوٹل کے ملازمین بظاہر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے —— اچانک ماجھے وادی والے نے ہاتھ کھینچ کر مصالحت کی بات چیت ختم کر دی اور پلک جھپکتے میں درمیانی دروازے کی کنڈی چڑھا کر حامی کو لیے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ داد ومکرانی اپنی جگہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اگر ماجھے وادی والے نے درمیانی دروازے کی کنڈی نہ چڑھائی ہوتی تو شاید انھیں شاہجہان ہوٹل سے باہر نکلنا نصیب نہ ہوتا۔

واپسی پر ماجھے وادی والے کی رفتار فتح مند جرنیل کی طرح باوقار تھی۔ اگرچہ داد ومکرانی کی پیش کردہ شرائط ماننے میں انھی کا پلہ بھاری تھا پھر بھی اس نے پرائے اڈے پر سو خطروں کے سائے میں مصالحت کی بات چیت ختم کر کے اپنی دانست میں حامی کی دھاک بٹھا دی تھی۔

حامی محسوس کر رہا تھا جیسے پل بھر میں اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ اس کا ماضی، اس کا حال اور اس کا مستقبل اس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے کہ اب وہ ان میں کوئی حدِ فاصل قائم نہ کر سکتا تھا۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی پھیل گئی تھی۔ شاہجہان ہوٹل میں ہونے والی گفتگو سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو یہ غم تھا کہ وقت کے بے رحم رویے نے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اور دآرو کے درمیان اتنی اونچی دیوار کھڑی کر دی تھی جس کو وہ ڈھا نہیں سکتا تھا —— اس نے سارا راستہ ماجھے وادی والے سے کوئی بات نہ کی۔

دونوں دکان پر پہنچے تو گامی دودھ سے بھری ہوئی بالٹیاں اور بلٹوہیاں سجائے حامی کا منتظر تھا۔ سائے لمبے ہو چکے تھے اور رات کے لیے دودھ کی کڑاہی چڑھانے کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔

ماجھا وادی والا بڑھے ہوئے تختے پر بیٹھ کر مزے سے سگریٹ پینے لگا۔

حامی اس وقت عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس کے دل میں مبہم سا خوف، انجانا ڈر سمایا ہوا تھا جیسے وہ بپھرے ہوئے دریا کی لپیٹ میں آجانے والے کنارے پر کھڑا ہو اور بچاؤ کے سارے راستے مسدود ہو چکے ہوں۔ اس نے انگیٹھی میں آگ جلائی اور اس اذیت اور کرب سے چھٹکارا پانے کے لیے تندہی سے کڑاہی مانجھنے بیٹھ گیا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ انگیٹھی کے پرلی طرف دھوئیں کی اوٹ میں اسے لاہیے چٹھی رساں کی صورت دکھائی دی۔ اسے دیکھ کر حامی کے تاریک اور ویران سینے میں جگنو سا ٹمٹمایا۔ لاہیے چٹھی رساں نے دکان کے سامنے رک کر گامی سے کہا۔

”بھائی جی، ذرا بات سننا۔“

گامی دکان سے اترا اور ذرا دور ہٹ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ حامی کے کانوں میں آپ ہی آپ شہنائی بجنے لگی۔ اس نے مسکرا کر اپنے بھائی اور لاہیے چٹھی رساں کی طرف دیکھا اور سر جھٹک کر پھر کڑاہی مانجھنے میں مشغول ہو گیا۔

اتنے میں ماجھا دادی والا اپنی جگہ سے اچھل کر چلایا۔

"وہ مارا"

حامی نے دیکھا دادو مکرانی سر جھکائے دکان کی طرف چلا آرہا تھا۔ لیکن اسی لمحے گامی، لاہیے چھٹی رسان سے باتیں کرتے کرتے جوتی اُتار کر حامی کی طرف بڑھتے ہوئے غضب ناک ہو کر دہاڑا۔

"حرامزادے، کمینے" —— اور حامی کے سر پر تڑاتڑ جوتیاں برساتے ہوئے بولا "سالے، محلے میں بدمعاشیاں کر کے جالندھریوں کا نام بدنام کرتا ہے"

حامی کے کانوں میں بجتی شہنائی ایک دم بین کرنے لگی۔ اس کا جھکا ہوا سر اور بھی جھک گیا۔ گامی نے تھک کر جوتی دکان کے تختے پر پھینک دی اور بڑبڑاتا ہوا گدی پر جا بیٹھا۔ لاہیا چھٹی رسان جا چکا تھا۔

حامی نے کمر جھاڑتے ہوئے بڑا سا منہ بنا کر ماجھے دادی والے کی طرف دیکھا اور نچلا ہونٹ لٹکا کر کہنے لگا۔

"بول، بھلا بات بنی کوئی —— ایسے ہی مارنا رہنا ہے"

اور دادو مکرانی پر توجہ دیئے بغیر سر جھکا کر کھُرپی سے کڑاہی مانجھنے لگا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

انہونی

محسن شمسی

وہ زمانہ اس کی نوجوانی کی تازگی کا زمانہ تھا۔ جب کوئی احساس ہوتا ہے تو بس یہی کہ لڑکپن سے چھٹکارا پاکر بڑے ہو رہے ہیں۔ ہر خوش رنگ چیز بلاتی نظر آتی ہے۔ ہر خوبصورت مرقع نگاہوں کو تھام لیتا ہے اور ہر متناسب مجسمہ نظروں پر سحر کرتا معلوم ہوتا ہے۔ وہ جوانی کی حسین اور مدہوش کر دینے والی سرزمین میں داخل ہو رہا تھا۔ اور اسے اپنے اردگرد بکھری ہوئی انوکھی چیزوں کو دوڑ دوڑ کر دیکھنے کا پورا پورا شوق تھا۔ اسے ہر طرح ایسی شوخی ایسی بدمستی اور ایسی مسرت سے لبریز نظر آتی کہ وہ قہقہوں اور مسکراہٹوں کے تلے دبا جاتا۔ دل کبھی گانے کو چاہتا کبھی بے پناہ باتیں کرنے کو اور کبھی تھکے ہارے خاموش سورج کو مکانوں کے پار مغرب کی گہرائی میں منہ چھپانے دیکھنے کو۔ ایک مسرت تھی جو ہر چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی —— مگر کبھی کبھی مسرت کے اس بے پایاں؛ نہاریں پُراسرار خاموشیوں کے سائے چھا جانے گھٹن سی محسوس ہوتی۔ جی میں آتا کہ دل میں نئے نئے آنے والے مبہم جذبات کو کسی ایسی پُراسرار ہستی پر نچھاور کر دیا جائے۔ شیشۂ دل کی یہ مئے ناب کسی کے قدموں پہ اُلٹ دی جائے۔ قطرہ قطرہ کر کے یہ سیال ٹپکنے لگے یہاں تک کہ یہ پوتر شراب ساری کی ساری بہہ جائے اور اس کے قدموں کو دھو کر اس کے ناخنوں کو اور گلابی کر دے اور دل کی یہ صراحی خالی ہو جائے۔ بالکل خالی۔

اس زمانے میں اسے معلوم ہوا کہ محبت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہوا یوں کہ بورڈنگ میں داخل ہونے کے بعد سلیم نے نئی نئی ملی آزادی کا پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ پہلا دھاوا شہر کے سینماؤں پر بولا گیا۔ سلیم کسی نہ کسی طرح سے ہر فلم کے پہلے دن اور پہلے شو کے ٹکٹ حاصل کر لیتا اور اپنے کسی دوست کے ساتھ فلم دیکھنے نکل جاتا۔ چاہے کھیلنے کا وقت ہو یا پڑھنے کا وقت فلم کا وقت نکل ہی آتا۔ شروع شروع میں تو سلیم ہر فلم میں ہیرو، ہیروئنوں کو پیڑوں تلے گاتے ہوئے دیکھ کر بڑا اجلا لگتا آہستہ آہستہ اس میں یہ سین دیکھنے کا ذوق پیدا ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ فلموں کے ذریعے ہی محبت کے متعلق اس کی اور اس کے دوستوں کی معلومات وسیع ہوتی گئیں۔

محبت کے شروع ہونے کے لیے عموماً کسی حادثے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہیروئن کا رومال گر جانے سے۔ ہیرو کا ہیروئن کو غنڈوں سے بچانے سے۔ ہیرو کا ہیروئن کی ماں کا قرض ادا کر کے انھیں بے گھر ہونے سے روکنے سے۔ سائیکل مڑ جانے سے۔ یا ہیروئن کا ہیرو کو چانٹا لگانے کے بعد معافی مانگ لینے سے۔ محبت کے شروع میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔ ہیروئن ٹھیک طرح سے

بات نہیں کرتی۔ بات کر بھی لیتی ہے تو بہت سی مشکلیں اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں لوگ مخالفتوں پر اُتر آتے ہیں۔ ساری دنیا ہاتھ دھو کر ہیرو اور ہیروئن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ طرح طرح کی چالاکیاں سازشیں اور بے ایمانیاں ہوتی ہیں مگر محبت کرنے والے کسی کو لفٹ نہیں دیتے اور لگاتار محبت کئے جاتے ہیں ——— یوں محبت اور سلیم کا تعارف ہوا۔ اسے محبت بہت پسند آئی۔

مگر ایک دن سلیم کو معلوم ہوا کہ فلموں والی محبت تو بڑی محدود محبت ہے۔ محبت تو لا محدود ہے اس میں بڑی وسعتیں ہیں بڑی گہرائیاں اور بڑی بلندیاں ہیں۔ اور اس کے محبت کے تصور میں اور ہمہ گیریت پیدا ہو گئی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے لیے وہ اُردو ادب کا احسان مند تھا۔ بات یہ ہوئی کہ خوش قسمتی سے سلیم کو اُردو کا کوئی ناول ہاتھ لگ گیا۔ اور جوں توں کر کے اس نے اسے پڑھ بھی ڈالا۔ ناول کچھ یوں تھا کہ ایک لڑکا اور لڑکی روزانہ چھت سے ایک دوسرے کو دیکھا کرتے تھے۔ لڑکا کتاب پڑھتا تھا اور لڑکی بال سکھاتی تھی۔ مگر پھر انھیں محبت ہو گئی۔ اور کافی سوچ بچار کے بعد لڑکے نے ایک دن ڈرتے ڈرتے (پتا ہی سے) ایک پرچہ پھینکا۔ لڑکی نے ادھر اُدھر دیکھ کر پرچہ اُٹھا لیا۔ لڑکے کے دل کی مراد بر آئی اور یوں محبت ناموں کا تبادلہ شروع ہو گیا مگر پھر محبت کا راز طشت از بام ہو گیا۔ اور لڑکے لڑکی کے ماں باپ ایک دوسرے سے سخت ناراض ہو گئے۔ کئی ISSUES بیچ میں اُٹھ آئے۔ اور لڑکے کی شادی ایک اور لڑکی سے، اور لڑکی کی شادی ایک اور لڑکے سے ہونے لگی۔ مگر انجام کے قریب پہنچ کر حالات نے ایک دم قلا بازی کھائی اور غالباً کسی چھوٹی سی بات نے دل پر ایسا اثر کیا کہ لڑکے لڑکی کے ماں باپ سارے قصے بھول کر آپس میں گلے مل لئے۔ جو لوگ اچھے تھے ان کی صحیح جگہوں پر شادیاں ہو گئیں جو بُرے تھے وہ کیفر کردار کو پہنچے اور یوں محبت بھرے دو دلوں کا جنم جنم کے لیے ملنا ہو گیا ——— سلیم اپنے ساتھیوں سمیت اب اُردو ناولوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور کچھ ہی دنوں میں ناولسٹ حضرات کے مشاہدات اور تجربات نے اس کی فکر کو بے انتہا وسعت دے دی۔

ناول پڑھ کر اسے معلوم ہوا کہ محبت کرنے کے چند اور آزمودہ طریقے بھی ہیں۔ مثلاً لڑکی کو ٹیوشن پڑھانے جانا۔ سہیلی کے ہاتھ پریم پتر بھجوانا۔ اپنی چھت سے آس پاس کی ساری لڑکیوں کی حرکات پر نظر رکھنا۔ پڑوس کی لڑکی کو رات کے وقت چوری چھپے کسی مناسب جگہ پر بلانا۔ غریب رشتہ دار بن کر مستقل لڑکی کے گھر ٹکے رہنا۔ حالِ دل کبھی لڑکی سے نہ کہنا بلکہ خاموش اس آگ میں جل جل کر اسے تکتے رہنا۔ یہاں تک کہ اس کی شادی کا دن آ جائے۔ اور اس دن موقعہ پا کر اسے بہن بنا لینا۔ لڑکی کی جائیداد دیکھ کر اس سے دھوکے کی محبت جتانا بعد میں ضمیر کی آواز سے ہوش میں آ جانا اور لڑکی سے معافی مانگ کر لڑکی اور جائیداد دونوں حاصل کر لینا۔

ناولوں سے ہی محبت کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی پڑی مثلاً خاندان مذہب یا رقیب کے جھگڑے ان کی مخالفت ان کی محبت کرنے والوں کو جدا کرنے کی دا کثر حالات میں ناکام) کوششیں اور محبت میں مبتلا لوگوں کا ہر بندھن ہر رکاوٹ ہر مصیبت ہر مشکل کو بالا کر کے کسی نہ کسی طرح آخر میں یکجا ہو جانا اور مخالفوں کی پوری ٹیم کو زوردار طریقے سے ہرا دینا۔

فلم بینی اور ناولوں کے مطالعے کے بعد سلیم اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہر نوجوان کو اپنی جوانی کے دنوں میں ایک یا اس سے زیادہ (حتیٰ المقدور) محبتیں کرنا چاہئیں (تاکہ وہ آخری عمر میں ناول لکھ سکے) اور اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ ایک زوردار محبت کرے ایسی زوردار کہ فلموں اور ناولوں کی محبتیں اس کے آگے ماند پڑ جائیں ——— وہ اپنے دوستوں سے

کہتا تھا " میں ایسی بھی محبت کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں گم ہو کر دنیا کو بھول جاؤں اور دنیا اس پر جل کر میرے خلاف کھڑی ہو جائے۔ سینکڑوں مصیبتیں ہوں بہت سی مشکلات ہوں ہزاروں مخالفتیں ہوں اور میں ان مخالفتوں کو پار کرتا ہوا ان طوفانوں کا مقابلہ کرتا ہوا اپنی اس یاسمین کی کلی کو حاصل کر لوں "

محبت کا ایک جہان تھا جو اس کے خیالوں میں بسا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے سوچتا کہ ناریل کے درختوں کے بیچ ایک خوبصورت سے مکان میں اس کی وہ محبوبہ رہتی ہے جسے کسی اچانک حادثے نے اس کے قریب کر دیا ہے۔ اس سے ملنے کے دن وہ اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہا رہی ہے۔ پھر اس نے اپنے چمکیلے جسم پر چمکتے پانی کے ننھے ننھے قطروں کو سفید تولیے سے رگڑ رگڑ کر پونچھا یہاں تک کہ اس کا دودھیا جسم گلابی ہو گیا اور اس کے سینے پر چمکتی نیلی رگیں اس رنگ میں چھپ گئیں اور پھر وہ سفید لباس پہن اپنے بالوں میں سفید پھول اڑس اور اپنی لمبی لمبی پلکیں اٹھائے گھنے درخت کے سائے میں کھڑی اس کی راہ تکنے لگی۔ اور پھر انتظار میں اس نے آہستہ آہستہ گنگنانا شروع کر دیا۔ اور پھر انتظار کے بوجھ سے اس کی پلکیں اس کی تھکی ہوئی آنکھوں پر جھک آئیں۔ اور جس کلائی کو اس نے سہارے کے لیے درخت کی چھال پر رکھا تھا اس پر درخت کی چھال سے دب کر سُرخ نشان بن گیا۔ اور آخر کار طوفانوں مخالفتوں اور امتحانوں کو پار کرتا ہوا لمبی گھانس کے درمیان پتلی سی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر چلتا ہوا وہ آجائے وہ مسکرا اٹھے۔ کاجل بھری آنکھیں محبت کی جوت سے دمک اٹھیں وہ آگے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لے اور اس کے بھیگے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھو اٹھے۔ اور بہت سے شگوفے ٹوٹ کر ان پر بکھر جائیں۔ گلاب کی کلی اپنا سینہ کھول دے اور تتلی اسے چوم لے اور فضاؤں میں بہت سی شہنائیاں ایک ساتھ بجنے لگیں ....."

مگر اس کے کالج کے آس پاس کھیں کے چٹیل میدانوں کے سوا اور کیا تھا۔ اور اس لئے اسے باوجود سائیکل لیے ادھر اُدھر کے چکر لگانے کے وہ لڑکی نہ مل سکی جس میں وہ سب خوبیاں ہوں جس کی اسے تلاش تھی جبین لڑکیوں میں بناوٹ تھی ذہین لڑکیوں میں اکڑ تھی جو لڑکیاں واقعی اچھی تھیں وہ وفا سے نا آشنا تھیں جن میں آرٹسٹک ذوق تھا وہ بے حد تنک مزاج اور زود رنج تھیں اور جو نبھانے والی تھیں وہ حد سے زیادہ شکی اور حکومت پسند تھیں مگر ہوائی قلعے بنانے وقت کون یہ سوچتا ہے کہ ان کی بنیاد کہاں اور کیسے رکھی جائے گی۔

اور پھر بغیر کسی ہنگامے کے بغیر کسی اچانک حادثے کے اسے رخشندہ مل گئی۔ رخشندہ جو خوبصورت طبیعت اور اچھا ذوق رکھتی تھی اور سادگی پسند بھی تھی اور جس میں شکل و صورت کے اعتبار سے وہ ساری خوبیاں تھیں جنھیں سلیم اپنی خیالی محبوبہ کے پرتو میں دیکھا کرتا تھا۔ وہ لاکھوں میں نہ سہی ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب نہ سہی مگر دل کو موہ لینے والی رعنائی ضرور رکھتی تھی۔ وہ شاعر کا خواب اور مصوّر کا تصوّر ہو نہ ہو مگر سلیم کے خیالوں میں ضرور رہنے لگی تھی اور یوں سلیم کی زندگی کا ایک نیا کالبد وجود میں آیا۔

رخشندہ دراصل سلیم کی رشتہ دار ہی تھی۔ بہت دنوں بعد جب سلیم ان کے یہاں پہاڑ پر گیا تو سلیم اور رخشندہ نے ایک دوسرے کو دیکھا، رخشندہ تو اپنے دل کا حال چھپا گئی مگر سلیم بہت متاثر نظر آ رہا تھا۔ اور یہ کوئی حیران کن بات بھی نہ تھی۔ کوئی اتنے دنوں تک کسی کو اپنے ذہن کے خانوں میں بسائے رکھے اس کی ہر جگہ تلاش کرے اور نہ ملنے پر جب تھک ہار کر مایوس ہونے لگے تو وہ

مل جائے تو آدمی کو کچھ دیر کے لیے دم بخود ہونے کا حق تو ملنا ہی چاہیے۔ اور جب پہلی ملاقات کا وہ استعجاب ختم ہو گیا تو رخشندہ اور سلیم ایک دوسرے سے گھلنے ملنے لگے۔ ناشتہ پر رات کی نیند اور موسم کی باتیں چھوٹے چھوٹے لطیفوں میں بدلنے لگیں شاپنگ کے ساتھ کا مختصر سا وقفہ طویل تر چہل قدمیوں میں بدلنے لگا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر رسمی مسکراہٹیں چہرے کے سُرخ ہو جانے میں تبدیل ہو گئیں۔ کبھی کبھی ہاتھ دیکھنے کے بہانے دو نیم گرم ہاتھوں کا لمس ایک دوسرے کو فرحت بخشنے لگا پھر کبھی کبھی دو شریر ہاتھ پھول توڑ کر کسی کے بالوں میں لگانے لگے کوئی کسی کو تنگ کرنے کے لیے کسی کی چیزیں چھپانے لگا۔ اور ہزار منت کرانے پر بھی واپس دینے سے انکار کرنے لگا۔ پھر تصویروں پر چھینا جھپٹی ہونے لگی اور پھر دل میں سوال اُبھرنے لگے کہ وہ صرف رشتہ دار ہیں دوست ہیں یا کچھ اور بھی ہیں؟ سلیم کوئی فیصلہ نہ کر پاتا تھا۔ وہ سوچتا کہ وہ اتنا خوش قسمت کہاں ہو سکتا ہے۔ اس میں وہ سب خوبیاں کہاں جو کسی کے دل کو لبھا لیتی ہیں۔ وہ کہاں ان سب کامیاب آدمیوں کی طرح بات چیت کر سکتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہی تھا کہ......

وہ لوگ ایک دن پکنک کو گئے پکنک کی جگہ چاروں طرف جنگلی درختوں سے گھرا ایک پہاڑی جھرنا تھی وہاں تک پہنچنے کے لیے پتلی سی پہاڑی پگڈنڈی پر گھوڑے سے جانا پڑتا تھا۔ سلیم کا گھوڑا بہت شریر تھا۔ وہ بار بار شوخی کر رہا تھا پیچھے سینکڑوں فٹ گہرا کھڈ تھا۔ رخشندہ خود اپنے گھوڑے سے اُتر پڑی سلیم کو اترنا پڑا گھوڑے والا گھوڑے لے کر آگے نکل گیا۔ وہ پیدل چلنے لگے۔ سلیم نے مذاق کیا۔

"جب لوگ اتنے ڈرپوک ہوتے ہیں تو نہ معلوم گھوڑے پر سوار کیوں ہو جاتے ہیں"

"اتنا خراب گھوڑا تھا اگر بھڑک جاتا تو اتنی سی پگڈنڈی پر آپ کس طرح اسے قابو کرتے۔"

"تو کیا ہوتا گرتا بھی تو گھوڑے کو لے کر گرتا"

رخشندہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی "ٹھیک ہے ــــ آپ کو کون روک سکتا ہے آپ نہ کہنے والی بات بھی کہہ سکتے ہیں"

"ارے بُرا مان گئیں ــــ اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے اور پھر میں تو مذاق کر رہا تھا"

"جی ہاں آپ کو ہر قسم کے مذاق کی اجازت ہے ــــ آپ کچھ بھی کہہ لیجئے۔ یہ سب ایک مذاق ہی تو ہے" اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اور تب بوکھلائے ہوئے سلیم نے رخشندہ کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ ایک لمحے کو دونوں کی آنکھیں ملیں۔ سنجیدہ، گہری بھوری چمکدار آنکھیں اور آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں۔ جنہیں سہیلیاں کہتیں تھیں وہ خمار میں ڈوبی معلوم ہوتی ہیں۔ آنکھوں نے کہا۔

"دل بڑی جلدی ٹوٹ جاتے ہیں یہ تو چھوئی موئی سے بھی نازک ہوتے ہیں"

آنکھوں نے پوچھا "کیا یہ میں ہی ہوں؟"

آنکھیں شرمائیں "جانتے بوجھتے تم کیوں میری زبان سے کہلوانا چاہتے ہو"

آنکھیں اترائیں "مجھے تو اب بھی یقین نہیں کہ یہ میں ہی ہوں"

"تو پھر خدا ہی تم سے سمجھے" اور آنکھیں جھک گئیں۔

اور پھر وہ سر سلیم کی بانہوں میں چھپ گیا اور بے تاب ہونٹوں نے لرزتے ہونٹوں کو خوشی سے چوم لیا۔

نوعمری کا پہلا بوسہ جس کا خمار کبھی نہیں اُترتا پیمانِ وفا کا شاہد وہ بوسہ جو بے داغ جذبات پر خوبصورت نقش بنا جاتا ہے دل کی دھڑکنوں کا برملا اعلان بردار بوسہ جو ڈھکے چھپے دبکے سہمے جذبات سے پردہ اُٹھا دیتا ہے —— اور پھر آنکھوں کے آنسوؤں اور لبوں کے بوسے نے اَن کہی باتیں کہہ ڈالیں بے زبانی کو زبان مل گئی۔

سلیم اور رخشندہ اب رقت سے بے نیاز ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ ساتھ گھومنے چلے جاتے مکان کے سامنے والے سیب کے باغ میں گم ہو جاتے۔ بقول رخشندہ وقت ایک بہتا دریا تھا جس میں وہ جھوم جھوم کر غوطے لگا رہے تھے اس دریا سے چند قطرے ختم ہو جانے یا ضائع ہو جانے کی کسے پروا تھی۔ چاندنی رات کی چہل قدمی ہو یا صبح سویرے کہر میں چھپی چوٹیاں دیکھنے کے لیے جانا، پکنک کے لیے سارا دن غائب رہنا ہو یا سہ پہر کو پہاڑی پھول توڑنے کے لیے غیر حاضر ہونا نہ کوئی ان کی راہ میں آنے والا تھا نہ کسی طرح کی پابندی لگانے والا یوں لگتا تھا جیسے سلیم اور رخشندہ کے بڑے ان کے دل کی بات سمجھ گئے ہوں اور ان کی خوشی ہی کو ہر چیز پر مقدم سمجھ رہے ہوں آثار کچھ ایسے نظر آتے تھے گویا انھوں نے دل ہی دل میں ان دونوں کو منسلک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

دلوں کے ارمان تو بہت ہوتے ہیں مگر کالج کی چھٹیاں تو محدود ہی رہتی ہیں۔ چھٹیاں ختم ہو گئیں اور سلیم بہت سی تمناؤں کو دل میں لیے یوں ہی لوٹ آیا۔ گو سلیم کے ماموں نے بھانجے کو بڑی شان سے رخصت کیا مگر رخشندہ نے اسے بڑے سیدھے سادے طریقے سے رخصت کیا۔ بعد میں وہ غمزدہ ہوئی یا نہیں یہ تو سلیم کو معلوم نہ ہوا مگر چلتے وقت تو اس میں کوئی خاص تبدیلی نہ تھی۔ نہ تو اس نے رو رو کر آنکھیں سجائیں نہ کار کے پیچھے دوڑتی ہوئی پہاڑی تک آئی۔ نہ ہی رومال نشانی کے طور پر دیا۔

اور اسی لیے سلیم پہاڑ سے لوٹنے کے بعد مایوس سا تھا۔ وہ سوچتا تھا رخشندہ سے اس کا میل جول 'محبت' تو نہ تھی محبت تو کچھ اور ہی چیز ہوتی ہے۔ اس میں تو بڑے عجیب ڈھنگ سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ بڑے رومانٹک انداز میں کہا جاتا ہے "مجھے اپنے چرنوں کی داسی بنا لو۔ میں تمھاری ہوں مجھے تم سے محبت ہے" اور پھر شرما کے بھاگ جایا جاتا ہے۔ یا گانا گنگنایا جاتا ہے۔ پھر جب یہ اسٹیج گزر چکتی ہے تو پھر نواب صاحب یا کوئی بڑے سرمایہ دار صاحب رقیب بن کر آ جاتے ہیں یا وہ نہیں تو لڑکی کا کوئی قریبی رشتہ دار ہی یہ فرض انجام دیتا ہے۔ وہ بھی نہیں تو لڑکیوں کے کالج کی پرنسپل ہی جلنے لگتی ہے۔ پھر لڑکی کے ماں باپ کو اعتراض ہوتا ہے کہ لڑکا کچھ ٹھیک سے کماتا وغیرہ نہیں۔ اُٹھانے والے مذہب کا سوال بھی اُٹھاتے ہیں۔ غرض مخالفتوں اور مصیبتوں کا ایک سیلاب ہوتا ہے جو محبت کرنے والوں کو ڈبو دینے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کی جدائی میں غمزدہ رہتے ہیں (کچھ عرصے کے لیے) اور ایک دوسرے سے گلے مل مل کر قسمیں کھائی جاتی ہیں کہ عمر بھر ایک دوسرے کے رہیں گے۔ ہندوستانی عورت اپنی نفسیات اور ہندوستانی مرد اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتا ہے۔ اور انتظار کرنے کی تلقین کر کے لڑکا مشکلات کا قلع قمع کرنے چلا جاتا ہے۔ وہاں موقع کی مناسبت سے کبھی گانے بجانے کا پیشہ اختیار کر کے کبھی کسی دوسری عورت کی مدد سے اور کبھی بھیس وغیرہ بدل کر وہ فتح یاب ہوتا ہے اور واپس آ کر لڑکی کو اپنا بنا لیتا ہے —— مگر یہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی نہ تو اچانک ملاقات ہی ہوئی تھی نہ ملنے جلنے ہی میں کوئی پابندی لگی تھی نہ رخشندہ ہی نے کسی قسم کے ڈائیلاگ بولے تھے اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ ان کی محبت سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی مخالفت تو بہت دور کی بات ہے۔ سب اچھے خاصے اپنے اپنے کام میں لگے تھے —— لہذا سلیم اپنی ساری

تمناؤں کا خون ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ تمنائیں جو وہ ایک عرصے سے فلمیں دیکھ کر اور ناول پڑھ کر اپنے سینے میں چھپائے پھر رہا تھا۔ وہ تمنائیں جو دیکھے ہوئے تمام فلموں اور پڑھے ہوئے سارے ناولوں کے پلاٹوں سے کشید کی گئیں تھیں۔ اس کا مثالی ہیرو بننے کا خواب چکنا چور ہوتے جا رہا تھا۔ اپنے خیالوں کے مطابق لڑکی پا کر بھی وہ محبت سے محروم رہا جا رہا تھا۔

مگر امید تھی کہ اسے تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح چابک لگا لگا کر آگے بھاگتے رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اور پھر امید کی آگ دل میں روشن کئے اس نے اپنے خیالوں کے مطابق محبت پانے کے واسطے حال دل کا صاف صاف اعلان کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے والدین سے کہہ دیا کہ اگر وہ شادی کرے گا تو رخشندہ سے ورنہ شادی کرے گا ہی نہیں۔ اس نے کہا کہ اس کی یہ بات سب کو ماننی ہی پڑے گی اگر کسی نے اسے اس کی مرضی کے خلاف اس شادی سے روکنا چاہا تو اچھا نہ ہوگا۔ اور یہ کہ یہ فیصلہ اس کا آخری فیصلہ ہے کسی کو اس میں ذرا سی تبدیلی کا بھی گمان نہیں ہونا چاہیئے۔ اعلان کافی سوچ بچار کے بعد اچھے خاصے ڈرامائی انداز میں کیا گیا تھا۔ اور امید تھی کہ مخالفت کے سکون بخش الفاظ کانوں کو فرحت بخشیں گے۔ مگر کیا معلوم کیوں کچھ لوگ قسمت کے تیر کی زد پر رہتے ہیں۔ کوئی اس ناامیدی کا تو خیال کیسے جو ڈانٹ کے منتظر محبت کے مارے ایک معصوم دل کو ہوئی ہوگی جب اس نے دیکھا ہوگا کہ اس کے ماں باپ نے مخالفت کر کے اسے برا بھلا کہنے کی بجائے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا ہے۔ ماں نے بھائی کی بیٹی کو اپنے گھر میں دیکھنے کی خوشی میں بیٹے کے ماتھے کو چوم لیا ہے باپ کا سر لائق بیٹے کے بڑے ہو جانے کی خوشی میں فخر سے اونچا ہو گیا ہے۔ اور اس کے بیاہ کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں ——— خاندان بھر کے لوگ شادی کرانے کے لیے تو کیسی جلدی تیار ہو جاتے ہیں مگر یہ کسی نے نہ سوچا کہ محبت کی آگ اس کی تلاش اس کی تڑپ جو دل کو بے چین کئے دے رہی ہے اس کا کیا ہوگا اس کمی کو کون پورا کرے گا اور کیسے کرے گا۔

اور وہ انتظار کرنے لگا۔ خاموش بیٹھ کر صرف انتظار۔ اسے صرف آنے والی کل کا انتظار تھا جو اپنے ساتھ ان گنت خوشبوؤں کے پیغام بھی لا سکتی تھی اور زندہ دوزخ کی تپش بھی۔ وہ سکون مسرت کی فرحت بھی لا سکتی تھی اور ٹوٹتے ہوئے خوابوں کے چبھ جانے والے ریزے بھی۔ مگر پھر بھی اس کا دل نامعلوم کل کے خوف سے بے چین رہنے لگا۔ وہ دل کی باتیں عزیزوں سے چھپائے راتوں کو جاگتا رہتا۔ لوگ سمجھتے کہ وصال کے انتظار نے اس کی نیند اڑا دی ہے۔ وہ کھویا کھویا پریشان گھر سے غائب رہتا۔ لوگ سمجھتے وہ شرمانے لگا ہے ——— غرض یہ کہ دن بڑی مشکل سے گزر رہے تھے اور ایسے مشکل وقت اگر کوئی آڑے آیا تو بس وہی پرانے ساتھی فلم اور ناول اور اتفاق دیکھیں دنوں اس نے ایک فلم میں دیکھا کہ ایک اچھی طرح ہوتی ہوئی شادی عین موقعہ پر مداخلت کر کے روک دی گئی۔ بات جہیز اور روپوں کے لین دین پر بڑھی۔ پگڑیاں قدموں میں رکھی گئیں۔ اور پگڑیاں ٹھوکروں سے اڑا دی گئیں۔ بارات اٹھ کر جانے لگی۔ مگر اس کٹھن وقت میں ہیرو اپنے باپ اور سارے فرسودہ سماج کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے ان کو حقارت سے ٹھکرا کر محبت کرنے والی دلہن کا نازک سا ہاتھ تھام کر نئی مثال قائم کر دی اور محبت کی اس مخالفت پر بڑی کامیابی سے فتح حاصل کی۔

کہتے ہیں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی کافی ہوتا ہے۔ ضرور ہوتا ہوگا کیونکہ سلیم کے دل میں امید کی آگ پھر روشن ہو گئی تھی اور اسی امید کے سہارے آج کا دن بھی آ گیا۔

صبح ہی سے شادی کی گہما گہمی میں سب لوگ مصروف تھے۔ سامان، کپڑے اور زیور۔ بس تین ہی موضوع رہ گئے تھے لوگوں

کے لیے۔ وہ چپ چاپ نظر آ رہا تھا۔ سب اس کی خاموشی کو الگ الگ معنی پہنا رہے تھے۔ مگر یہ کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ اصل وجہ کیا ہے ——— وہ امید و بیم کی اس حالت میں تھا جو آپریشن تھیٹر کے باہر انتظار کرنے والے شیئرز مارکیٹ کے سوداگر یا کسی اہم پوزیشن کے لیے انتخاب لڑنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ نامعلوم کا خوف اس کے دل و دماغ پر طاری تھا اور اس لیے اس کی بے چینی حق بجانب معلوم ہوتی تھی۔

پھر اسے رسموں کے مطابق تیار کیا گیا۔ بارات دلہن کے یہاں گئی اور آخر وہ لمحہ بھی آ ہی گیا جب وہ کسی طوفان کا منتظر تھا ایسا طوفان جو اس کو اس کے خیال کے مطابق یہی محبت دے سکے گا اور جس کی وجہ سے وہ فلموں اور ناولوں کے ہیرو کا اونچا درجہ پا سکے گا۔

مگر کسی بھی طرح کا طوفان نہ آیا حالات حسبِ معمول رہے ہاں سہ پہر کو قبول و ایجاب کے بعد قاضی صاحب کی آواز ضرور سنائی دی کہ وہ درخشندہ ممتاز کا شوہر نامدار بن گیا ہے۔

اور اب رات کے آٹھ بجے اس کے والد اس کے قریب ترین اور رازدار سمجھے جانے والے دوست ابھی مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ وہ یکایک کیوں فرار ہو گیا جب کہ انھوں نے اس کی مرضی کے مطابق ہی شادی کی تھی۔

کوئی مجھے بتلائے، میں انھیں کیا جواب دوں؟

فردا کے پھول

محمد عمر میمن

صبح کا سورج روشنی اور سائے کی عجیب عجیب شکلیں بناتا ہوا، جھونپڑی کی مٹی اور گارے سے بنی دیواروں پر چمکنے لگا۔ سورج کی کرنیں، جھونپڑی کی متعفن، بوسیدہ نیم روشن فضا میں دھیرے دھیرے بکھرنے لگیں، یہاں تک کہ دو محوِ خواب چہروں نے ان کی چبھتی حدت کو محسوس کیا اور بغیر کسی خواہش کے یونہی خالی الذہن ہو کر اپنے صدیوں کے ماندے، تھکے تھکے سے جسموں کو کھجور کے پتوں کی کھردری چٹائی پر حرکت دی۔

کھڑکی کے نزدیک لیٹا ہوا آدمی، مضبوط، گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کے بازوؤں کی تڑپتی مچھلیاں تنی ہوئی تھیں اور گردن سے لے کر شانوں سے ہوتی ہوئی کلائیوں اور پھر مشقت سے گھائل، کھردرے ہاتھوں کے بالائی حصے تک موٹی رسی سے مشابہ رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے نیند سے چونکتے ہوئے گہری سانس لی، اور اپنے تھکے ہوئے سیاہ فام جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ گھٹی گھٹی سی فضا میں اس کے گہرے تنفس کی بازگشت چند لمحوں تک چکراتی ہوئی نیند میں ڈوب گئی۔ اس کے پہلو میں نو دس سال کا ایک لڑکا لیٹا ہوا تھا، جس کے چھوٹے گھنے کالے اور خشک بال بے ترتیبی سے باہم الجھے ہوئے تھے اور موٹے بھدے ہونٹ ایک موہوم سی مسکراہٹ پر آ کے جدا ہو گئے تھے۔ اس مدہم ابہامی ابتسام کے عقب میں کونسے ملائم جذبے اور خواب اس کے محرک بن کر کارفرما تھے

—— یہ کون جانے!

"کلو! کلو! ابے او کلوے!" خواب آلود آواز خاصی کرخت ہو گئی۔ لڑکے کے ہونٹ تھرتھرائے اور کھل گئے یوں جیسے کسی میکانکی عمل کے ذریعے ان کا سلسلہ کرخت آواز سے ملا دیا گیا ہو۔ اس نے یوں ہی، ایک خالی سی نظر پھونس کی چھدری چھت پہ ڈالی اور پھر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ بالکل مشینی انداز میں تیزی سے چٹائی لپیٹ کر کونے میں کھڑی کی اور ٹاٹ کے بھاری بھرکم لبادے کو جو پردے کا کام دیتا تھا۔ سرکا کر دوسرے حصے میں نکل گیا جہاں ایک کونے کھدرے میں تین اینٹوں کو جوڑ کر چولہا بنایا گیا تھا جس پر اب ایک مٹی کے برتن میں کوئی چیز کھول رہی تھی۔ اس نے ایک آدھ جلی لکڑی اٹھا کر راکھ کریدی اور اس میں سے دو دہکتے ہوئے انگارے نکال کر ان پر پانی کے چھینٹے دینے شروع کیے تاآنکہ وہ مدہم سے دھوئیں کے نم غبار کے سائے میں بالکل سرد ہو کر رہ گئے۔ وہ انہیں اپنی ننھی سی ہتھیلی پہ رکھ کر اس دوسرے حصے میں نکل آیا جہاں سے دونوں باپ بیٹے کنوئیں پر پہنچے۔ باپ نے ڈول بھر کر پانی سینچا اور کچی جگت سے لگ کر دونوں مل مل کر دانت مانجھنے لگے۔ پھر پانی سے منہ پر چھینٹے دیے اور ایک چیتھڑے سے چہروں کی نمی کو خشک

کرکے گھر لوٹ آئے۔ اس تمام عرصہ میں دونوں نے کوئی بات نہ کی یوں جیسے ہر ایک کو پہلے ہی سے معلوم ہو کہ زندگی کے اس چوکھٹے میں اس کے ذمہ کون سے کام ہیں! جیسے دونوں کے مابین پہلے ہی سے کوئی خاموش معاہدہ ہو۔

چولہے کے نزدیک ایک بڑھیا بیٹھی بڑے دھیان سے اوپر چڑھے برتن کو گھور رہی تھی۔ اس کا چہرہ جھریوں سے اٹا پڑا تھا۔ ملگجا دھندلا دھندلا سا دھواں کمرے کی کثیف فضا میں تیرتا ہوا، چھت کے سوراخوں سے نکلتا ہوا باہر ہوا میں منتشر ہو رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے اپنے سوکھے ہاتھوں سے دو پیالے اٹھائے، اور انھیں چولہے پر کھولتی ہوئی چائے سے بھر دیا۔ باپ بیٹا دونوں آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے اور اکڑوں بیٹھ کر پیالیاں اپنے مدت کے تشنہ کام ہونٹوں سے لگا لیں۔

"کلو! آج بھی رات گئے گھر لوٹوں گا۔ مالک چاہتا ہے کہ فصل جلد کٹ جائے تاکہ مارکیٹ میں پہلے پہنچنے پر دام اچھے ملیں۔ دیکھو! تم وقت پہ اسکول پہنچ جانا ـــــ سمجھے؟"

بوڑھی عورت زندگی کا بارِ گراں لیے اٹھی، کانپتی لرزتی ـــــ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ایک ٹوٹے پھوٹے نعمت خانے تک پہنچی۔ اس نعمت خانے میں کوئی نعمت کاہے کو کبھی رکھی گئی ہوگی۔ یہاں تو بس باسی روٹی کے سوکھے ٹکڑے یا کسی ٹوٹے پیالے میں بچا رات کا سالن ـــــ وہ بھی شاذ ہی نظر آجاتا۔ نعمت خانہ تین ٹانگوں پہ کھڑا تھا۔ چوتھی ٹانگ کی کمی تلے اوپر اینٹیں رکھ کر پوری کی گئی تھی۔

کفنی ساڑھی کا پلو بڑھیا کے شانوں سے پھسل کر نیچے آرہا۔ اس نے پلو سیدھا کیا اور نعمت خانے کا پٹ کھول کر ایک چھوٹی سی پوٹلی نکالی جس میں روٹی کے کچھ سوکھے ٹکڑے اور پیاز کی ایک گانٹھ تھی۔ اس نے بنا کچھ کہے پوٹلی آدمی کے ہاتھ میں تھما دی۔

"دیکھو ماں، ذرا خیال رکھنا کہ کلو وقت پہ اسکول پہنچ جائے۔" گویا وہ کلو کو اتنی اہمیت صرف اس لیے دے رہا تھا کہ اس چھوٹے سے گھروندے کا تمام تر مستقبل اس سے ہی وابستہ تھا۔ چلتے چلتے ایک الوداعی نظر اس نے کلو پر ڈالی سناٹے میں جاتے بھاری قدموں کی آواز تسلسل سے گونج رہی تھی۔ پھر بتدریج مدھم سے مدھم تر ہوتی ہوئی وہ فاصلوں میں ڈوب گئی....

کلو نے جلدی جلدی پیالہ ختم کیا۔ جوں ہی بڑھیا نے اس کے خالی ہونے کی آواز سنی اس نے پھر اسے چائے سے بھر دیا اور اب برتن میں باقی ماندہ چائے اس قدر ناکافی تھی کہ اس سے بڑھیا کی پیالی بمشکل آدھی بھر سکتی تھی۔ دونوں صبر و شکر سے چائے اپنے سینوں میں انڈیلتے رہے اور جھونپڑی کی اداس فضا خاموشی کے اتھاہ ساگر میں ڈوبتی گئی یہاں تک کہ ماحول کی اس غمناک تیز سنسناہٹ کو توڑتے ہوئے بڑھیا کی نحیف آواز گونجی ـــــ

"تمھیں اسکول کے لیے بہت دور تک چلنا ہوگا ـــــ بیٹا، اب جاؤ ـــــ"

"دادی، میں بہت تیز چلتا ہوں ـــــ یوں" یہ کہہ کر کلو نے کمرے کی محدود فضا میں دو تین لانبے لانبے ڈگ بھرے۔ دادی مسکرا دی۔ "مجھے اسکول پہنچنے میں بس پندرہ منٹ ہی لگیں گے! ہاں" وہ بڑے فخر سے بولا۔ بڑھیا اس کی آنکھوں میں گہری خود اعتمادی کی جھلک دیکھ کر نہال ہوگئی۔

"مجھے یقین ہے ایک روز تم بہت تیز دوڑنے والے بن جاؤ گے! تم مضبوط بھی ہو اور تندرست بھی!"

"میں اپنی کلاس میں سب سے تیز دوڑتا ہوں دادی، ہاں" کلّو یقین دلاتے ہوئے بولا۔

"پھر بھی اچھا ہے کہ تم بس ابھی سے چل دو" یہ کہتی ہوئی وہ نعمت خانے کی طرف بڑھی۔ جہاں اب صرف روٹی کے چند ٹکڑے اور ذراسا اچار پڑا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے کسی گہری فکر میں ڈوب گئی جیسے سوچ رہی ہو کہ یہ مقدار کلّو جیسے گٹھیلے جسم کے لڑکے کے لیے ناکافی تھی۔ پھر اس کا ہاتھ اس کی ساڑھی سے پھسلتا ہوا پلّو کی ایک گرہ پر آکر رُک گیا۔ اس نے گرہ کھولی اور وہ واحد چوّنی جو اس کے پاس تھی کلّو کو دے دی۔

"یہاں آؤ بیٹا۔۔۔ سنو، اس چوّنی سے دوپہر کو اپنے لیے کوئی کھانے کی چیز خرید لینا ۔۔۔"

وہ تقریباً بھاگتا ہوا بڑھیا کی آغوش میں آسمایا اور جھول سا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو کر چمٹے رہے۔ تھوڑی دیر بعد علیحدہ ہوتے "پیاری دادی ۔۔۔ پیاری دادی ۔۔۔" کہتے ہوئے وہ اپنی کتابیں سنبھالتا ہوا اسکول بھاگا۔ بھاگتے ہوئے وہ جلد ہی نیم تاریک گلی کے نکڑ کو اپنے بہت پیچھے چھوڑتا ہوا کشادہ سڑک کی چمکیلی فضا میں نکل آیا۔ ایک کتاب اور دو کاپیاں داہنے ہاتھ میں اور چوّنی مضبوطی سے بائیں ہاتھ میں دبائے وہ بڑی تیزی سے اپنی راہ میں حائل ہر چھوٹے بڑے پتھر کو ٹھوکر مارتا ہوا یوں بڑھا جا رہا تھا کہ اگر پلٹ کر دیکھا تو پتھر کا ہو کر رہ جائے گا۔

وہ پھرکی کی طرح تیزی سے گھوما، اور گھومتے ہوئے بڑے الھڑپنے سے ایک ٹک سامنے پتھر کو لگا دی۔ پتھر دور تک سڑک پر گیند کی طرح لڑھکتا پڑھکتا چلا گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ پتھر چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ لیکن وہ ——— جسے کہانیاں سننے کا بے حد شوق تھا جادو کی اس گیند کے پیچھے بے خیالی میں چلا جا رہا تھا جس کا تذکرہ کہیں حاتم طائی کے قصے میں آیا تھا۔ آٹھویں سوال کے جواب کی تلاش میں :

تیزی سے ایک سبز رنگ کی دومنزلہ بس دندناتی، شور مچاتی زن سے اس کے پاس سے گزر گئی۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور مشتاق نظروں سے بس کو گھورنے لگا یہاں تک کہ وہ سامنے والے موڑ کو عبور کر کے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لاشعوری طور پر چوّنی پر اس کی گرفت مضبوط تر ہو گئی ایک چھلتی سی نظر میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ بس کی بالائی منزل کی اگلی نشستیں بالکل خالی تھیں۔ اگر وہ چاہتا تو صرف دو آنے میں اسکول کے گیٹ تک پہنچ سکتا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا پچھلے سال ہی کی تو بات ہے۔ عید کے موقع پر وہ اپنے چچا کے ساتھ بس کی بالائی منزل کی اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ کتنی عجیب عجیب چیزیں اس نے اوپر بیٹھے بیٹھے دیکھی تھیں وہ چیزیں جن کے متعلق اس کی معلومات بالکل محدود یا تقریباً نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اسے ہر چیز بدلی بدلی نظر آئی تھی عجیب حیرت انگیز، ناقابلِ یقین، خاص طور پر اونچی اونچی عمارتوں کے کشادہ، ستھرے، اُجلے اُجلے فلیٹ جن میں صاف ستھرا چمکیلا فرنیچر اس کے باپ کے قد سے بھی نکلتی ہوئی اونچی الماریاں جن پر بیضوی آئینے جڑے تھے اور ستھرے لوگ، جو اس قدر آسائش اور کیف سے زندگی بسر کرتے تھے کہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے ہشاش بشاش چہروں پر انسانی زندگی کے لکھوکھا آلام اور دُکھوں میں سے کسی ایک کا بھی سایہ اسے نظر نہ آیا اور ننھی منّی سی وہ گڑیا بالڑکی ——— اتنی منّی اتنی پیاری ——— جو ایک آئینوں والی میز کے نزدیک ہی چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھی طرح طرح کی بوتلوں اور ڈبیوں سے کچھ نکال نکال کر اپنے چہرے پر لگا رہی تھی . . . . تب اس چھوٹے سے لمحے کے ہزارویں حصے میں عجیب اضطراری طور پر کسی تیز رو بادل کی طرح اس کے

دل میں ایک خیال آیا ——— وہ چپکے سے جاکر اس گڑیا شہزادی کے پیچھے کھڑا ہو جائے پھر تیزی سے شہزادی کی آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہے ——— "بوجھو تو کون ہے؟ لو ——— شہزادی تمہارا شہزادہ آگیا ہے!" پھر وہ اسے اپنے سفر کی صعوبتوں کا حال سنائے۔ اور کہانیوں کی شہزادی کی طرح یہ شہزادی بھی کھل کھلا کر ہنس دے ——— لیکن بس تیزی سے آگے بڑھ چکی تھی۔ یہ دنیا اس کی اپنی دنیا سے کتنی مختلف تھی۔ بدلی بدلی ——— اسے یوں محسوس ہوا، وہ جادو کے قالین پر بیٹھے بیٹھے ہی کسی دوسری دنیا میں نکل گیا ہے۔

اکثر اس نے بجلی کے کھمبوں کے نیچے کھڑے ہو کر حیرت سے سوچا تھا۔ آخر ان چمکتے ہوئے شیشے کے مرتبانوں میں کیا ایسی چیز ہے جو رات کو اتنی تیز روشنی پھینکتی ہے؟ ہاں ——— مرتبان ہی! اس کی ننھی عقل اور کچے شعور میں اس سے بہتر کوئی اور تشبیہہ ہی نہ تھی کہ وہ بلب کے ان شیشوں کو مرتبانوں کے ماسوا کسی اور چیز سے تعبیر کرتا۔ تب اس روز چچا کے ساتھ بس میں سفر کرتے سمے اس پر یہ راز آشکارا ہوا کہ ایسے! یہ تو وہی بلب ہیں جن سے رات کو اس قدر تیز روشنی چھوٹتی ہے بس فرق یہ ہے کہ ان پر مرتبان اوندھا دیئے گئے ہیں۔ تو اس نے چاہا بس کی کھڑکی سے ذری سا جھک کر انھیں چھوئے۔ انھیں محسوس کرے ——— لیکن اس کے چچا نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی مگر اس روز اس نے اپنے ننھے سے دل میں پوری سچائی سے عہد کیا ایک نہ ایک روز وہ انھیں ضرور چھوئے گا۔

کونونٹ اسکول کی دراز، سرو قد دیواروں کے پیچھے کیا؟ بارہا اسکول جاتے وقت اس نے یہ راز سمجھنے کی کوشش کی تھی کہ آخر ان دیواروں کے عقب میں کس سنہری اجنبی دیس کی کہانیاں پروان چڑھتی ہیں۔؟ آیا یہ کوئی پرستان ہے؟ یا کوئی انوکھا دیس؟ پر یہ بات تو اسی روز اس پر ظاہر ہوئی جب وہ چچا کے ساتھ بس میں بیٹھا جا رہا تھا کہ یہ بھی ایک اسکول ہے لیکن اس کے اسکول سے قدرے مختلف! یہاں اس کے اسکول کے بچوں کے برخلاف نہایت صاف ستھرے بچے تھے۔ چاندی اور دودھ کی نہروں سے جیسے نکل کر نتھرے نتھرے چلے آتے ہوں۔ اور کھیل کود کا ایسا سامان جو اس کے اسکول میں نہ تھا۔ تب اس نے اسکول کے بیچوں بیچ کنواری میڈونا کے نصب مقدس بُت کو بڑی حیرت سے دیکھا جس کے چاروں طرف لمبی لمبی سپید پوشاکیں پہنے ہوئے پجاریوں کا ایک وسیع غول سمٹ آیا تھا۔ اس غول میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں! جب اس کی نگاہ مریم کے منسوب بُت کے عقب میں گئی تو وہاں اسے دو بے حد چمکیلے سنہری پَر دکھائی دیئے۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ "تو کیا یہ کوئی پری ہے؟" اس نے یونہی اپنے آپ سے پوچھا۔ بڑھیا دادی کی سنائی ہوئی پریوں کی تمام کہانیاں یکے بعد دیگرے اس کے تصور میں گھوم گئیں۔ اور وہ شہزادے بھی جو شب و روز قریہ قریہ، پربت پربت ان کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ "ہو نہ ہو یہ نیلم پری ہی ہے۔ کتنی معصوم اور پیاری لگ رہی ہے۔ نیلم پری بھی تو ایسی ہی تھی۔" لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا۔ دادی کی سنائی ہوئی کہانیوں میں تو ایک پری کے ایک یا حد سے حد دو چاہنے والے شہزادے ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہاں اس ایک پری کے اتنے سارے چاہنے والے شہزادے کہاں سے آگئے؟ اور پھر ان میں تو کئی ایک شہزادیاں بھی ہیں؟ بھلا شہزادیاں پری کو کیوں چاہنے لگیں۔ یہ شہزادیاں تو پری سے شادی نہیں کر سکتیں ——— شہزادے ——— بیچارے جانے کتنے دور دیسوں سے سفر کی سختیاں برداشت کر کے یہاں آئے ہوں گے۔ راستے میں انھیں دیو اور خوفناک جانور بھی ملے ہوں گے اور وہ اژدہا بھی

ملا ہوگا جو اُلٹی سانس لے کر آدمیوں کو ہڑپ کر جاتا ہے اور وہ جادوئی محل بھی ملا ہوگا جس میں بیچارے شہزادے پھنس کر قید ہو جاتے ہیں...... دیکھیں اب یہ پری کس کو ملتی ہے؟ شہزادوں کے لیے جذبۂ ترحم اس کی آنکھوں میں اُمڈ آیا۔ یہ سب اس قدر جلدی ہُوا کہ پلک جھپکتے ہی بس کو نوٹ کی سرحد کو چھوڑ چکی تھی اور وہ جی بھر کر کو نوٹ کا منظر بھی نہ دیکھ سکا تھا لیکن اس نے ارادہ کیا کہ کو نوٹ کی ان عظیم سرِ فلک دیواروں کے عقب میں پلتی ان حیرت انگیز کہانیوں کی حقیقت کو ضرور معلوم کرکے رہے گا خواہ اس کے لیے اسے جادوئی چراغ یا جادوئی آئینہ ہی کیوں نہ حاصل کرنا پڑے!

وہ سوچتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے خیالات کی رَو ایک اور دو منزلہ بس کی گھڑگھڑاہٹ سے بہک کر منتشر ہوگئی جو اس کے عقب سے تیزی سے نکلی، اسٹاپ پر رکی اور پھر چل دی لیکن وہ پھر اپنے خیالات کے اس سرے کو نہ پا سکا جو بس کی اس بے ہنگم گڑگڑاہٹ میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

وہ تیز تیز بڑے بڑے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا اور جلد ہی دو منزلہ بس کے متعلق سب کچھ بھول گیا یہاں تک کہ اس کے کانوں میں مٹھائی والے کی گھنٹی کی تیز جھنجھناہٹ گونجی۔ مٹھائی والا اپنی چھوٹی سی گھنٹی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے بجاتا جا رہا تھا۔ اس کے گلے سے ایک شیشے کا بڑا سا رنگا ڈبہ لٹکا ہوا تھا جس میں طرح طرح کی رنگ برنگی ٹافیاں خوشنما رنگین اور شفاف کاغذوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ مٹھائی والے کی شخصیت اس کے لیے قطعاً اجنبی نہ تھی، وہ روز کہیں نہ کہیں اسے اسکول کے راستے میں مل جاتا تھا۔ مٹھائی والا ایک آنہ لے کر ایک چھوٹا سا ڈبہ آگے کر دیتا جس میں لاتعداد پرچیاں ہوتیں جن پر مختلف تعداد درج ہوتی۔ خریدنے والا اپنے ہاتھ سے ایک پرچی نکالتا اور اس پر درج شدہ تعداد کے مطابق اسے ٹافیاں مل جاتیں۔ اسے یاد آیا ایک بار اس کے ہم سبق مسعود نے ایک پرچی نکالی تھی، اور اسے بیس ٹافیاں ملی تھیں۔ اور مسعود نے اسے بھی نارنجی رنگ کی ٹافیاں کھانے کو دی تھیں جن کا کھٹ مِٹھا ذائقہ اسے آج بھی یاد تھا...... اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ تصور ہی تصور میں مٹھائی کا مزہ لیتا ہُوا آگے بڑھنے لگا۔ گھنٹی کی نغمہ بار سریلی آواز لمحہ بہ لمحہ نزدیک تر آتی گئی اور اس کی نظریں اسی رفتار سے نیچی ہوتی گئیں۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ نظریں اونچی کر سکتا۔ یہ بڑا مشکل کام تھا کہ وہ ایک آنہ خرچ کر دیتا۔ اور قبل اس کے کہ اس کے ذہن و دل میں ٹافیوں کا لالچ اور انھیں حاصل کرنے کا دبا دبا سا جذبہ سر ابھارتا ——— وہ کنی کاٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا مٹھائی والے کو اپنے بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ جوتی پر اس کی گرفت بہت سخت تھی۔

وہ باغ میں گھس گیا جو اسکول کے راستے میں پڑتا تھا اور رنگ برنگے سنگریزوں کے چکنے اور ملائم فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ کیاریوں میں کھلے کے زرد، گلابی اور گہرے سرخ پھول سورج کی چمکیلی روشنی میں عجیب کیف انگیز منظر پیش کر رہے تھے۔ گہرے سرخ گلاب کے گملوں کے پھولوں پر رنگ برنگی تتلیاں منڈلا رہی تھیں اور سورج کی روشنی میں ان کے ہزارہا رنگ بے طرح چمک رہے تھے۔ وہ پارک کو عبور کر تا نکل آیا۔ سامنے اسکول کا بڑا سا آہنی دروازہ روایتی دیو کی طرح مضبوطی سے کھڑا تھا ——— اس کے کانوں میں مزدور اور نشاگرد پیشہ لوگوں کے بچوں کی بے ہنگم گالی گلوچ سے پُر آوازیں گونجنے لگیں جو وہاں تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر لالو حلوائی گھی سے لبریز کڑاہی میں سے گرم گرم نازی

تازی جلیبیاں نکال نکال کر شیرے بھرے تھال میں ڈال رہا تھا۔ وہ دھیان دیئے بغیر ہی آگے بڑھ گیا۔ مبادا —— مبادا —— اس نے چونی مضبوطی سے تھام لی۔ لیکن اس کا ارادہ کچا ثابت ہوا۔ جلیبیوں کی میٹھی میٹھی اشتہا انگیز خوشبو نے اس کے قدم جکڑ دیئے۔ وہ لوٹا —— اور بڑی حسرت سے لالہ کو جلیبیاں بناتے تکنے لگا —— ذہن و دل میں پھر جنگ چھڑ گئی، اور قبل اس کے کہ اس کے ہاتھوں میں چونی کی گرفت ڈھیلی پڑتی وہ آنکھیں بڑی قوت سے میچ کر یوں تیزی سے آگے بڑھنے لگا جیسے وہ کسی بات کو کسی جذبہ اور آرزو کو بڑی کوشش سے بھلانے کی کوشش کر رہا ہو جو ہر ہر قدم پر اس کا پلو پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ رہے ہوں!

عین دروازے کے سامنے اسے روز کی طرح آج بھی پتنگ والا نظر آیا جس کے پاس طرح طرح کی پتنگیں تھیں۔ گہرے رنگوں والی، اژدھے کی مانند، عقاب کی طرح، جھنڈے والی اور سفید کور والے سبز پرچم والی پتنگیں جن کے درمیان سبز سبز پس منظر سے ابھرتا ہوا ہلال اور ستارہ تھا۔ پیسے کی ایک سے لے کر تین آنے کی ایک تک! لیکن اسے سفید کور والی سبز پتنگ بے حد پسند تھی جس کے اوپر ہلال اور ستارہ بنا ہوا تھا۔ اور جب کبھی وہ بچوں بالوں کو یہ پتنگ اڑاتے دیکھتا تو اس کے ایک ایک رنگ سے حسرت و ابتہاج کی لہریں پھوٹ پڑتیں وہ دعا کرتا "خدایا —— یہ یونہی فضا میں سر بلند رہے!"

ہلالی پرچم والی سبز پتنگ سے اس کی یہ دیوانہ وار انسیت بلا سبب تھی، روز ہی اسکول لگنے سے ذرا پہلے ہلالی پرچم کے نیچے کھڑے ہو کر جب سب طلبا قومی ترانہ گاتے تو اس کا دل مسرت سے بلیوں اچھلنے لگتا۔ دوسروں کا تو پتہ نہیں لیکن کم از کم اس کا دل قومی ترانے کے ان بولوں "پاک سر زمین شاد باد" تک آتے آتے کسی انجانی مسرت سے لبریز ہو جاتا اسے اپنے سینے میں دودھ اور شہد کی ٹھنڈی ٹھنڈی دھاریں چھوٹتی محسوس ہوتیں اور اس کی آواز بے انتہا جوشیلی ہو جاتی.... سب سے نمایاں، اور واضح —— جانے کیوں؛ حالانکہ وہ ان بولوں کا مقصد اور مطلب سمجھنے سے یکسر قاصر تھا پھر بھی اس کو تو قومی ترانے اور ہلالی سبز پرچم سے وہ والہانہ محبت اور شیفتگی تھی —— جو ماں کو اپنے بچے سے ہوتی ہے —— بے لوث —— بے غرض اور جس کے لیے کوئی منطقی دلیل نہیں قائم کی جا سکتی ——

"آج کیوں نہ پتنگ لے ہی لی جائے" اس نے دل میں سوچا "صرف تین آنے" مگر اس جذباتیت کا بڑھ کر اس کے ذہن نے گلا گھونٹ دیا جو جانے کب سے کسی اوجھڑ بن میں لگا تھا...... وہ اس احساس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا...... کیونکہ پتنگ خریدنے کے بعد اس کے پاس ایک ہی آنہ رہ جائے گا.... اور.. اور...... وہ بنا آگے سوچے بسرعت کلاس میں گھس گیا اور چونی احتیاط سے جیب میں رکھ لی۔

بعض اوقات حیاتِ انسانی ایسے لمحات سے بھی ہمکنار ہوتی ہے جب انسان فوری طور پر کھلی صداقت کو قبول کرنے سے اپنے کو معذور پاتا ہے اور اس کا ذہن شک و ارتیاب کی اس درمیانی کیفیت میں مسلسل یہی سرگوشی کرتا رہتا ہے "کیا یہ سچ ہے؟ کیا زمانے میں یوں بھی ہوتا ہے؟" اور کیا بسا اوقات دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں پرورش پاتے سپنے سہانے یوں مجروح بھی ہو جاتے ہیں؟" اس کا ذہن اس بھیانک حقیقت کو فوری طور پر قبول نہیں کرتا اور اپنی دلیلوں اور شبہات

سے اس کی صداقت کو جھٹلانے کی مسلسل سعی کئے جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ یہی کیفیت کلو کی بھی تھی جب اس نے باری باری اپنی ساری جیبوں کی تلاشی لے ڈالی - اس نے اپنے ڈیسک اور اس کے نزدیک کی ہر ہر شئے کو بار بار اُلٹا پلٹا لیکن چونی کا کوئی اَتہ پتہ نہ ملا شاید وہ کہیں کھوئی یا چرائی جا چکی تھی - اس نے غصہ اور شبہے سے اپنے نزدیک بیٹھے لڑکوں کو عجیب دزدیدہ نظروں سے گھورا لیکن وہ اسے اتنے مطمئن اور پُرسکون دکھائی دیئے کہ اس کی آواز نطق کی سرحد میں اُلجھ کر رہ گئی ——— وہ ان سے کچھ بھی تو نہ پوچھ سکا - بے سود ! اسے یقین نہ آیا چونی جسے بحفاظت یہاں تک لانے میں اسے اپنی کتنی ہی معصوم خواہشوں کا خون کرنا پڑا تھا - کھوئی یا چرائی جا چکی ہے ! اور بھلا یہ کیسے ممکن تھا - وہ اسے اتنی حفاظت سے اسکول تک لایا تھا اپنی ہر ہر اُمید کو ٹھوکر مار کے ——— اپنے دل میں مدت سے پرورش پاتی آرزوؤں کو قربان کر کے !

وہ اسکول کے گیٹ تک ، اور پھر وہاں سے کلاس تک کئی بار آیا گیا - زمین کے چپے چپے کو بغور دیکھتے ہوئے - آخر اس نے اپنی یہ اُمید بھی چھوڑ دی - آخر وہ کیسے اس موہوم سی اُمید کے سہارے اپنی تلاش جاری رکھ سکتا تھا کہ کھوئی یا چرائی ہوئی چونی اسے پھر مل جائے گی - اور اب ماسوا اس کے کوئی سبیل نہ تھی کہ اس بھیانک حقیقت کو اس کی تمام تر المناکیوں کے ساتھ قبول کر ہی لیا جائے !

مضمحل مضمحل ، بوجھل بوجھل اور تھکا تھکا وہ کسی ہارے ہوئے جواری یا شکست خوردہ شکاری کی طرح ایک خالی کمرے میں نکل آیا ، غم و اندوہ کی شدت کا ردعمل آنسوؤں کی شکل میں اس کی موٹی موٹی معصوم آنکھوں میں جھلکنے لگا -

آنسوؤں کی دھند میں ڈوبی آنکھوں کو اس نے اُٹھایا تو سامنے اسے اپنا استاد نظر آیا جو اپنی کھوئی ہوئی کتاب تلاش کرتا اس کمرے میں نکل آیا تھا - ننھے بچے کو یوں بلک بلک کر روتے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا -

"کیوں بیٹا ! کیا بات ہے ؟" وہ نہایت نرمی سے بولا اور جواب نہ پا کر سوالات کی بھرمار کر دی "کیا تم ڈر گئے ہو بچے ؟ کیا تمھیں کسی سے خوف محسوس ہوتا ہے ؟ کیا تمھیں موٹے سکندر خان نے مارا ہے ؟" وہ سوالات کے ساتھ ساتھ اس کے سر پر شفقت اور محبت سے ہاتھ پھیر رہا تھا "کیا گھر پر کوئی بات ہو گئی ہے ؟ تم رو کیوں رہے ہو ؟ اکیلے گھر جاتے گھبراتے ہو ؟ کہو بیٹا ، رو نہیں ، کیا بات ہے ؟ میں تمھاری مدد کروں گا - اچھے بچے یوں بھلا کہیں روتے ہیں ؟"

اس نے بہت دھیمے سے اپنا سر ہلایا اور چند ناقابل فہم ، مبہم سے اَنمل بے جوڑ الفاظ نہایت مدھم آواز میں ادا کئے جن سے استاد کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا - پیار سے ، ڈرا دھمکا کر ——— غرض ہر ممکن طریقے سے اُستاد نے اس گہری اداسی کا راز معلوم کرنا چاہا لیکن بے سُود - اس کے بند لبوں میں ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی - آخر کلو کھڑا ہو گیا - اس کی تھکی تھکی معصوم آنکھیں غم کے بوجھ سے بند سی ہوتی جا رہی تھیں - سفید سے گالوں پر ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے شفاف قطرے خشک ہو گئے تھے - اور ان کی بجائے اب صرف ایک ہلکی سی دھندلی لکیر نظر آ رہی تھی جس طرح رات کے دھندلکے میں سفید بادل کا ایک باریک سا نشان آسمان پر پھیل جاتا ہے - اس نے گال پر پھیلی ہوئی خشک آنسوؤں کی اس لمبی لکیر کو قمیص کی میلی پھٹی آستین سے پونچھا ، اور آہستہ سے کہا -

" کچھ نہیں ماٹ صاحب ——— کچھ بھی تو نہیں " جواب دے کر اس نے کمرے سے نکلنے کی جستجو میں قدم بڑھایا ہی تھا کہ

اُستاد کی آواز گونجی:

"ٹھہرو ——— بیٹے تم تنہا نہیں جا سکتے، چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں - لال کنویں کے سامنے لوہاروں والی گلی میں رہتے ہو نا؟"

اس نے پیار سے کلّو کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا ——— اس نے سر ہلا کر مبہم سے لہجے میں ہاں کر دی - پھر اُستاد کو کچھ یاد آیا اور اس نے اِدھر اُدھر کچھ تلاش کرنا شروع کر دیا ——— ٹیبل کے نیچے سے اپنی کھوئی ہوئی کتاب مل گئی - کلّو نے عجیب کسک اور بے بسی کا پہلو لیے کتاب کو دیکھا ——— تو کیا کھوئی ہوئی چیز بھی مل جاتی ہے؟ ——— پھر نادانستہ اس کے ہاتھ ایک بار پھر جیب تک اُٹھ گئے - ہاتھ خالی تھے ——— غم کی شدت سے آنسو ایک بار پھر آنکھوں کی جھیلوں میں کنول کی طرح تیرنے لگے جنھیں اس نے بڑی صفائی سے اپنی میلی آستین میں جذب کر لیا - آنسو تو اس کی کم ہمتی اور شکست کی نشانی تھے اور وہ اُستاد کے سامنے اپنے کو کیسے کم ہمت یا شکست خوردہ دیکھ سکتا تھا . . . . . دھیرے دھیرے قدموں سے چلتے ہوئے وہ دونوں پھاٹک تک پہنچے ——— دیر ہوئی لڑکے گھروں کو جا چکے تھے، اکا دکا اِدھر اُدھر آپس میں اُلجھ رہے تھے اور گالیوں کے درمیان ایک دوسرے کو زمین میں رگڑ دینے کے درپے تھے - اچانک انھوں نے کلّو کے ساتھ اُستاد کو جو دیکھا تو جھگڑا اُٹھا دھول دھول میں آئی کتابیں کاپیاں اُٹھا اِدھر اُدھر گول ہو گئے - فضا میں ہلکی ہلکی سی گرد جو اسکول کے بچے اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے گھل مل کر دھیمے دھیمے بیٹھ رہی تھی - تھوڑی دُور ہی وہ پہنچے ہوں گے کہ انھیں مٹھائی والا نظر آیا جو گھنٹی بجا بجا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہا تھا - کلّو کی نظریں غیر ارادی طور پر جھک گئیں - لیکن جہاں دیدہ اُستاد اس کی کمزوری بھانپ گیا اور بڑے پیار سے بولا -

"ٹھہرو بچے! ایک پرچی تو نکالو ——— دیکھیں تو سہی کتنے قسمت کے دھنی ہو"

خالی خالی نظروں سے وہ زمین کو گھورنے لگا اور دائیں پیر کے انگوٹھے سے مسلسل زمین کھودنے لگا . . . . اسے چپ دیکھ کر اُستاد نے خود اس کے لیے ایک پرچی نکالی -

"آ ——— ہا ——— دیکھو بچے تم کتنے دھنی رام ہو ——" وہ مسکرایا "صرف ایک آنے میں ۷ ٹافیاں ——"

"اوہو ——— اگر تم جیسے دو چار اور آجائیں تو اپنا پاٹیا ہی گل ہو جائے ——— خوانچہ ہی لُٹ لُٹا کر رہ جائے" مٹھائی والا ہنستے ہوئے بولا - وہ ہمیشہ ہر جیتنے والے سے یہی کہتا تھا لیکن اس کی ننھی منی گشتی دکان جوں کی توں سالم تھی کبھی لٹنے کی نوبت نہ آئی تھی - اس صریح جھوٹ پر کلّو کو عجیب سا لگا - لیکن اس نے ان تمام باتوں میں کوئی دلچسپی نہ لی اور نہ ہی اس مذاق سے محظوظ ہوا - اس نے ٹافیاں قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن اُستاد نے زبردستی جیب میں ٹھونس دیں اس نے کوئی مزاحمت نہ کی - دونوں خاموشی سے چلتے رہے یہاں تک کہ بس اسٹاپ آگیا اُستاد اس کا شانہ ہلاتے ہوئے بولا:

"بہتر ہے ہم لوگ بس پر چلیں - کیوں - ٹھیک ہے نا؟"

وہ گم صم بے تعلق کھڑا رہا - جیسے وہ بغیر ارادے اور رائے کا بت تھا - نہ اس نے بس میں سوار ہونے کی خواہش کا اظہار کیا نہ بیٹھنے سے انکار! مجبوب، دو منزلہ بس گھڑگھڑاتی ہوئی اسٹاپ پر آکر رکی - وہ دونوں بالائی منزل کی اگلی نشستوں پر بیٹھ گئے - بس چل دی اور اب کھمبوں پر لگے ہوئے "مرتبان" اس کے بائیں ہاتھ کی پہنچ سے بہت نزدیک تھے مگر اس نے عجیب بیزاری سے نگاہیں پھیر لیں - اگر وہ چاہتا تو بآسانی اُستاد سے نظریں بچا کر اپنی دیرینہ خواہش پوری کر سکتا تھا - لیکن نہیں - بس سڑک پر پھیلے ہوتے اژدہام، انبوہ میں سے راستہ

بنائی ہوئی آگے اور آگے بڑھتی ہی رہی۔ صاف ستھرے فلیٹ اس کے سامنے تھے۔ لیکن اس نے ایک نگاہِ غلط انداز بھی ان پر نہ ڈالی۔ بس وہ اُداس سا گہرے سکوت کے اتھاہ ساگر میں ڈوبا ہوا دور خلاؤں میں خالی خالی نظروں سے گھورنے لگا۔

اُستاد اس کی اس بے نام اُداسی کی وجہ نہ جان سکا اور اس کا دل بہلانے کے لیے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا رہا لیکن اس نے کسی دلچسپی یا خوشی کا اظہار تک نہ کیا سوائے اس کے کہ کبھی ہلکے سے سر جھٹک دیتا یا نہایت ہی مبہم انداز میں مسکرا دیتا۔ بس چلم پری کے دیس ——— کونوٹ کی جھلمل سرو قد دیواروں کے نزدیک سے بھی گزری مگر ایک طائرانہ سی نظر بھی اس نے نہ ڈالی۔

منزلِ مقصود پر پہنچ کر بس رکی تو وہ دونوں اتر آئے۔ وہ سر جھکائے اُستاد کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اب اُستاد بھی شاگرد کی اُداسی کے سبب اُداس ہو گیا تھا اور اس لیے کہ وہ اس اُمیدوں اور آرزوؤں سے بھرپور جوان دل میں گہری اُداسی کی جگہ دلچسپی اور خوشیوں کی جوت جگانے میں سراسر ناکام رہا ہے اور لڑکے کے چہرے سے عیاں تھا وہ اُداس ضرور ہے لیکن اس اُداسی کا محرک خوف ہرگز نہیں اور نہ چونی کے کھو جانے یا چرائے جانے کا ہی غم ہے نہ تمام دن اپنے بھوکے رہنے کی تکلیف! بلکہ اس اُداسی کے عقب میں تو وہ عوامل کارفرما ہیں جنھوں نے غلط وقت پر ایک حادثے کو جنم دیا ہے اور یوں اس کے معصوم منصوبے کو تکمیل سے پہلے ہی تہہ و بالا کر دیا ہے۔ وہ منصوبہ جس کے لیے اس نے اپنی ہر دیرینہ معصوم خواہش کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ وہ منصوبہ جو اس نے گھر سے لے کر اسکول تک راستے میں بہت سوچ سوچ کر بنایا تھا وہ تو کچھ اور ہی تھا۔ اِسے اپنے بھوکے رہنے کا کوئی غم نہ تھا بلکہ اس کے تصوّر میں تو بوڑھی دادی کا جسم جنم سے بوجھل پھر اگردش کر رہا تھا جو رات بھوکی سوئی تھی اور صبح اپنے حصّے کی چائے بھی اسی کی پیالی میں انڈیل دی تھی.... اور اب اس حادثے نے اس کے شیش محل چکنا چور کر دیے تھے .... یوں جیسے منزل کی جانب آخری قدم رکھتے سمے کوئی طاقتور ہاتھ مسافر کو اٹھا کر پھر اس جگہ لا پٹکے جہاں سے اس نے آغازِ سفر کیا تھا یا جیسے راستے کے تمام خطرات طے کر کے کوئی کشتی ٹھیک ساحل سے ذرا پہلے ٹوٹ پھوٹ جائے!

اب کیا ہوگا؟ اس کی آرزو کیسے پوری ہوگی ——؟ اور وہ منصوبہ؟

"لو اب میں چلتا ہوں ——— تم سڑک پار کرتے وقت ذرا چوکنّے رہنا"

لڑکے نے نیچی نظروں سے سر ہلا کر اُستاد کے احسان کا شکریہ ادا کیا۔

اُستاد جانے کے لیے مڑا۔ چند قدم چلا، لیکن کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کر پلٹا، اپنے بٹوے سے ایک چونّی نکالی اور اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے نہایت نرمی سے بولا۔

"یہ تم لے لو، مجھے کلاس کے باہر پڑی ملی تھی۔ نہ جانے کس لڑکے کی ہوگی، بہرحال ابھی تو تم رکھو کل میں معلوم کر کے دے دوں گا"

"جی۔ جی۔ یہ میری ہے"! اس نے فرطِ مسرت سے ہکلاتے ہوئے کہا "صبح کھو گئی تھی" اس کے لبوں پر طویل چمکیلی مسکراہٹ پھیل گئی جیسے اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہو۔ اس نے گھوم کر احسانمندی اور تشکر سے اُستاد کو دیکھنا چاہا مگر وہ بھیڑ میں کہیں گم ہو چکا تھا۔

اُستاد کی نصیحت کے باوجود اس نے سڑک تقریباً دوڑ کر عبور کی سامنے سے وہی پتنگ والا آ رہا تھا نزدیک پہنچتے ہی پتنگ والے نے اسے رکنے کا اشارہ کیا ——— مگر وہ اپنی ترنگ میں آگے بڑھ گیا ——— یکلخت وہ کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کر پلٹا اور پتنگ والے کے پاس آ کر بولا: "کیا؟"

"میں تمھیں یہ ہلالی پرچم والی پتنگ صرف دو آنے میں دے سکتا ہوں!"

اس نے عجیب نظروں سے اپنی محبوب پتنگ کو دیکھا اور چھوا بھی۔ اور اسے محسوس بھی کیا۔ لیکن پتنگ والا حیران تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں پتنگ کے لیے ایک دبی سی خواہش کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کی جوان آنکھیں کسی لازوال اندرونی مسرت سے سرشار تھیں۔

"نہیں ——— نہیں نہیں نہیں ——— آج تو میں اسے ایک پیسے میں بھی نہ لوں گا" یہ کہتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے بھاگا اور سرعت سے سامنے والے طباری کے سستے سے ہوٹل میں گھس گیا ——— واپسی پر اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ سا جھول رہا تھا۔ اور آنکھیں بے حد چمک رہی تھیں۔

گھر پہنچتے ہی وہ تقریباً دوڑتے ہوئے باورچی خانے میں پہنچا۔ دادی اس کے کومل قدموں کی مانوس آہٹ پاکر اس سے ملنے کے لیے اٹھی۔ پیکٹ دادی کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اس نے بڑی شدت سے دادی کو بھینچ لیا۔ جیسے صدیوں کے انتظار کے بعد سعادت کا یہ ایک لمحہ جس کے لیے اس نے تپتے صحرا میں کڑے کوس طے کئے ہیں اس کی پہنچ سے دور نہ پھسل جائے۔ دونوں ایک دوسرے میں گم چپکے رہے۔

پیکٹ کھولنے پر جب دادی کو گرم گرم کھانے کی سوندھی سوندھی اشتہا انگیز خوشبو آئی تو وہ چونک اٹھی! ———

"ارے ——— یہ کیا ———؟"

"ہاں ——— تمہارے لیے کھانا ——— تم بھوکی ہو نا۔ بولو۔ وہ چونی تھی نا میں نے اس سے . . . ."

وہ جملہ مکمل کئے بنا ہی پھر دادی سے چمٹ گیا۔ دادی نے محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ اس وقت اس کی بوڑھی آنکھوں میں بھوک، افلاس اور غربت کے لرزاں سایوں کے عقب میں مسرت اور خوشی کا انوکھا نور تھا۔

نویدِ سحر

نقاش : گاڈی موپساں

عکاس : سیّد عبدالباقی

دو سیاہ گھوڑوں والی خوبصورت بگھی محل کے سامنے آ گئی۔ جون کے مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ شام کے ساڑھے پانچ کا عمل ہوگا۔ تمازتِ آفتاب سے صحن روشن اور فضا گرم تھی ـــــ کاؤنٹس ڈی سقراط زینہ طے کر کے نیچے آئی ہی تھی کہ اس کا شوہر جو گھر واپس آ رہا تھا بگھی کے قریب پہنچا تو ایک لمحہ کے لیے کچھ ٹھٹک کر رہ گیا۔ بیوی پر ایک نظر ڈالی اور قدرے زرد پڑ گیا۔ کاؤنٹس بے حد خوبصورت بلا کی دلفریب اور بڑی پُروقار عورت تھی۔ بیضوی تراش کا چہرہ، ہاتھی دانت پر شمع جیسی رنگت، بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں اور سیاہ زلفیں۔ اس نے شوہر کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور بگھی میں داخل ہو گئی۔ اس گریز میں اس کی اعلیٰ تربیت کا کچھ ایسا انوکھا پن موجود تھا کہ مدّتِ دراز سے سقراط کے سینے میں وہ دھیمے دھیمے اور بھینی سلگنے والا حسد دفعتہً تند شعلوں میں بھڑک اٹھا جس کی پرخار زبان اس کے دل کے کور چاٹنے لگی۔ وہ بگھی کے قریب آیا اور بولا۔

"تم سیر کو جا رہی ہو"؟

"آپ نہیں جانتے؟"

"بوالش ڈی بولانگ؟"

"شاید"

"میں بھی چل سکتا ہوں"

"یہ بگھی آپ کی ملکیت ہے موسیو"

اس لب و لہجے کے باوجود وہ اپنی خفت کو پی کر جھٹ بگھی میں سوار ہو، اس کے بازو بیٹھ گیا اور اشارہ کیا "بوالش ڈی بولانگ"

پیادے ایک جست کے ساتھ کوچوان کی نشست کے برابر آ بیٹھے۔ گاڑی متحرک ہوئی اور دونوں گھوڑے ایک جنبشِ سر کے ساتھ سڑک پر نکل آئے۔

پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے میاں بیوی بہت دیر تک گم سُم اور چپ چاپ رہے۔ وہ یہ سوچتا رہا کہ ابتدا کیسے کی جائے۔ کیونکہ

اس کے چہرے کے تمام آثار حوصلہ شکن تھے۔ آخر کار اس نے انتہائے کرب سے یوں پہل کی، کہ اپنا ہاتھ کاؤنٹس کے دستانہ پوش ہاتھوں پہ کچھ اس طرح رکھا جیسے یہ ایک محض اتفاقی امر ہو لیکن اس نے شدید بیزاری کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ شخص اپنے مزاج کی مثالی خودسری اور غیر معمولی تحکمانہ روش کے باوجود کچھ دیر کے لیے خاموش اور گہرے خیالات میں ڈوب گیا۔

"گیبرل"! آخر کار وہ بولا "تم چاہتی کیا ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک جھنجلائی ہوئی ملکہ کی طرح قدرے نیم دراز انداز میں بیٹھی رہی۔ اس وقت یہ لوگ آرک ڈی ٹرام پے کی جانب شیمپس ایلاس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس لانبی روش کے اختتام پہ ایک فلک بوس قدیمی عمارت اپنے پُرشکوہ سنگین محراب آسمان کی طرف پھیلائے ایسے کھڑی تھی جیسے آسماں پر آتشیں خاک بکھیرتا ہوا خورشید جہاں تاب اب اُن میں ڈوبنے والا ہے۔ چمکیلی گاڑیوں کا ایک مسلسل اور سحر کی زنجیرہ صیقل شدہ قندیلوں اور گھوڑوں کے چمکیلے ساج میں آفتاب کا دمکتا ہوا عکس لیے دو رُخے بہاؤ میں رواں تھا، ایک شہر سے جنگل کی طرف دوسرا جنگل سے شہر کی سمت۔ کاؤنٹ ڈی مسقراط نے بات نہ روکی۔

"پیاری گیبرل؟

"اُف۔ اللہ۔ مجھے ایک ذرا سکون لینے دو۔ کیا اس گاڑی پر میرا اتنا بھی اختیار نہیں؟"

انجان بن کر وہ پھر کہنے لگا۔

"آج تمہارا حسن ترازو میں تُل رہا ہے۔ اس سے پہلے تم میں ایسی دلفریبی کبھی نہ تھی۔" یہاں اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا جس سے آواز میں غصہ کی تلخی نمایاں ہو گئی۔

"تم کچھ غلط سمجھ رہے ہو موسیو۔ اب صاف صاف سُن لو۔ میں تبلائے دیتی ہوں کہ میں اُس نہج پر تمہیں کبھی منہ نہ لگاؤں گی"

وہ ششدر رہ گیا۔ لیکن اس کی سخت گیر فطرت آہستہ آہستہ اُبھر آئی۔ اب وہ چیخا "اس کے کیا معنی"

اس آواز میں عشق کی نیازمندی کی جگہ حاکمانہ سفاکی تھی۔ خاتون نے دھیمی آواز میں جواب دیا تاکہ بات نوکروں کے کانوں تک نہ جائے۔

"آہ! اس کے کیا معنی؟ اور کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ اب میں پھر سے تمہیں سمجھ رہی ہوں۔ سمجھے؟ کیا تم مجھ سے صاف صاف سُننا چاہتے ہو؟"

"کیوں نہیں؟"

"وہ تمام باتیں جو مجھ پر اُس وقت سے بیت رہی ہیں جب سے میں تمہاری مہیب خودغرضی کا شکار ہوئی ہوں"

حیرت اور غصے نے اُسے سرخ کر دیا وہ بھینچے ہوئے دانتوں میں غرّایا "بے شک تمھیں سب کچھ کہنا ہوگا"

کشادہ شانوں والا وہ دراز قد انسان جس کے چہرہ پر سرخ رنگت کی بھرپور داڑھی تھی۔ وضع قطع میں خوبصورت، چال ڈھال سے شریف زادہ، رکھ رکھاؤ میں پکا دنیادار اور حُسنِ سلوک کے اعتبار سے اچھا شوہر اور ایک بہتر باپ کی شخصیت کا مالک تھا۔ جس وقت سے کہ دونوں روانہ ہوئے تھے اس نے پہلی مرتبہ مُڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور گھور کر کہا "لیکن آہ — تم سب کچھ جان کر بہت بدمزہ ہو گے۔ مگر تمھیں یہ بھی تو معلوم ہو کہ آج میں ہر چیز کے لیے تیار ہوں۔ اب مجھے کسی بات کا خوف نہیں — تم..... تم کس شمار

میں ہو"

دونوں نے ایک دوسرے کا آنکھوں ہی آنکھوں میں جائزہ لیا۔ وہ شدتِ جذبات سے کانپ رہا تھا جب اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو"

"سراسر غلط۔ لیکن بس اسی قدر کہ اب میں تخلیق کی اس نفرت انگیز قربان گاہ پر مزید اپنی بھینٹ چڑھانے کو تیار نہیں ہوں۔ میری گذشتہ گیارہ سالوں کا بلیدان کیا کچھ کم ہے؟ میں اب اس دنیا میں دوسری تمام عورتوں کی طرح زندہ رہوں گی جس کا مجھے بھی ہر طرح حق حاصل ہے"

وہ دفعتہً پھر زرد پڑ گیا اور ہکلایا "م . . . . م . . . . میں . . . . . . کو . . . . . کچھ نہیں سمجھا"

"اوہ ——— تم خوب سمجھتے ہو۔۔۔ ابھی تین مہینے بھی تو نہیں گذرے ہوں گے کہ میں زچگی سے اٹھی ہوں۔ تم نہیں دیکھتے کہ میں اب بھی اتنی ہی حسین ہوں اور تم اپنی تمام کوششوں کے باوجود میرے حسن کو پامال نہ کر سکے؟ ابھی ابھی جب میں زینے سے نیچے اُتر رہی تھی تو تم نے اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ اب پھر وقعہ ہے کہ ایک بار پھر میری کوکھ بھر دی جائے"

"یہ سب بکواس ہے"

"ہرگز نہیں۔ اب میں تیس برس کی ہو چکی ہوں۔ گذشتہ گیارہ سال میں میرے ہاں سات بچے پیدا ہو چکے ہیں۔ اور تم یہ سمجھتے ہو کہ ابھی یہ کاروبار دس برس اور چلے گا، جب تک تمہاری حسد کی آگ ٹھنڈی نہ پڑے تم مجھے نہ چھوڑو گے"

اُس نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور جھنجھوڑ کر کہا "میں اس طرح کی باتیں برداشت نہیں کر سکتا"

"میں تمھیں سب کچھ سنا کے دم لوں گی اور اگر تم نے مجھے اس طرح روکنے کی کوشش کی تو یاد رکھو کہ میں چلا چلا کر کہوں گی تاکہ تمہارے دونوں نوکر جو آگے بیٹھے ہوئے ہیں اچھی طرح سنیں میں نے تمھیں ساتھ ہونے کی اجازت صرف اس لیے دی تھی ورنہ یاد رہے کہ ان نوکروں کا بار احسان ہمیشہ کے لیے تمھیں اٹھانا پڑے گا کہ یہ میری باتوں کے گواہ رہیں گے اس لیے کاؤنٹ تم وہ سب کچھ توجہ سے سنو گے جو میں کہوں گی۔ میرے دل میں تمھاری طرف سے ہمیشہ نفرت پلتی رہی جسے میں نے تم سے نہ چھپایا کیونکہ موسیو! میں جھوٹ نہیں بولتی۔ تم نے میری مرضی کے خلاف مجھ سے شادی کر لی، تم نے میرے والدین کے ناسازگار حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو مجبور کر دیا کیونکہ تم بہت امیر تھے اور ان ہوں نے میرے آنسوؤں کے تارے مجھے تمہارے پلے باندھ دیا۔ اس طرح تم نے مجھے مول لے لیا اور جب میں تمہاری گرفت میں آ گئی تمھاری بن گئی تاکہ میں خود کو تم میں ضم کر دوں، تمھاری زبردستیوں اور دھمکیوں والے رویہ کو بھول کر صرف اتنا یاد رکھوں کہ مجھے تم سے حتیٰ المقدور بہر صورت محبت کرنی چاہیے کیونکہ میری ذات فقط ایک اطاعت شعار بیوی کی ذات ہے۔ تم مجھ سے حسد رکھنے لگے، وہ کمینہ اور رکیک حسد جو کبھی کسی بشر کے سینے میں پیدا نہ ہوا ہو گا تمہارے سینے میں پلنے لگا۔ یہ میرے لیے بھی اسی قدر ذلت کا باعث تھا جتنا کہ تمہارے لیے۔ ابھی میری شادی کو بمشکل آٹھ مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ تم نے مجھے طرح طرح کے شبہات کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اور ایک مرتبہ اس کا ذکر بھی کیا، ذلالت کی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ تم مجھے خوبصورت ہونے کی وجہ سے لوگوں میں مقبول ہونے دیوان خانے میں بصد اصرار بلائے جانے، پیرس کے اخبارات میں حسین ترین خاتون ہونے کی حیثیت میں چھپنے سے روک نہیں سکتے تھے، اس لیے تم نے

اور تم نے مجھے سدا بچہ پیدا کرنے والے جھمیلے میں ڈالے رکھا تاکہ یہ لوگ بالآخر مجھ سے بیزار ہو جائیں — اُف، تم اس حقیقت سے کیونکر انکار کر سکتے ہو — میں پہلے پہل کچھ نہ سمجھی پھر مجھے ہلکا سا شبہ رہنے لگا، پھر ایک مرتبہ مجھے اس بات کا یقین ہو گیا، جب تم نے بڑے فخریہ انداز میں اپنی بہن سے بھی یہ بات کہہ دی، اس نے مجھے سب کچھ بتلا دیا کیونکہ میں اس کی چہیتی تھی، یہی وجہ ہے کہ تمہاری بہن آج بھی تمہارے اس گنوارپن کے سبب تم پر لعنت بھیجتی ہے' — آہ — یاد ہیں وہ دن ہماری وہ کشمکش تمام در دانے بند اور مقفل زندگی کے گیارہ تعزیری برسوں میں تم نے مجھے بچوں والی گھوڑی بنا کر رکھا، جب میں امید سے ہوتی تو تم مجھ سے بیزار ہو جاتے۔ مہینوں تمہاری شکل پر نظر نہ پڑتی اور ایک دن مجھے دیہات میں منتقل کر دیا جاتا تاکہ چراگاہوں، کھیتوں، سبزہ زاروں سے گھرے ہوئے زچگی خانے میں میں بچے کی ولادت کے دن پورے کرتی رہوں، جب میں وہاں سے لوٹتی تو میں تمہاری توقع کے خلاف اسی طرح حسین تروتازہ اور سدا بہار ہوتی، میرے گرد لوگوں کا پھر وہی ہجوم ہوتا، میری وہی قدر افزائی ہوتی اور تم میں حسد کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھتی۔ تم میں پھر وہ اصل جذبہ، وہ مکروہ ہیجان پیدا ہو جاتا جس کے تم اب شکار ہو۔ یہ وہ جذبہ نہیں جس کی رو سے تم مجھے اپنانا چاہتے تھے میں اس کیلئے تمھیں منع نہیں کر سکتی تھی لیکن یہ تو وہ جنون ہے جو مجھے بیکار محض بنا دینا چاہتا تھا — اس کے علاوہ اب وہ کریہہ اور پُراسرار حالات رونما ہونے لگے جس میں برسوں دوچار رہی ہوں اور اب میں تمہارے خیالات اور اعمال کے مشاہدے کی بدولت ذکی الحس بن چکی ہوں

بچوں کے ساتھ تمہاری وابستگی کی وجہ تمہاری اپنی وہ طمانیت تھی جو تمھیں میری طرف سے حاصل رہی۔ جب وہ میرے شکم میں ہوتے، میرے حاملہ ہونے کی مسرت تمہارے رکیک اور موہوم خوف کو کچھ عرصے کے لیے ہٹا دیتی تو تم اپنے دل میں میرے لیے شفقت بھی محسوس کرنے لگ جاتے تھے۔ اُف خدایا کتنی مرتبہ وہ مسرت میں نے تمہاری آنکھوں سے چھلکتی ہوئی دیکھی ہے اور اسے سمجھا ہے کہ تم اپنے بچوں کو چاہتے تھے اس لیے نہیں کہ وہ تمہارا اپنا خون تھا بلکہ وہ میری ذات پر تمہاری گوناگوں فتوحات کی زندہ یادگاریں تھیں۔ تمھیں اپنے بچوں پر فخر ہے، تم اس کا مظاہرہ کرتے ہوئے کبھی انھیں اپنے ساتھ بوانس ڈی بولانگ کی سیر کروانے ہو، کبھی مانٹ مورنسی میں ان کو خرسواری کروائی جاتی ہے، تم انھیں کبھی کبھی دن کو تھیٹر میں لے جاتے رہے ہو تاکہ لوگ باگ تمھیں ان کے درمیان دیکھیں تو کہیں کتنا اچھا باپ ہے۔ یہ سبق آپ آج تک دہراتے رہے۔

کاؤنٹ نے اس کی نازک کلائی کا اپنی آہنی گرفت میں ایسی وحشیانہ بے دردی سے شکنجہ کیا کہ ایک ہلکی سی چیخ اس کے ہونٹوں کو چھو کر منجمد ہو گئی۔ پھر اس نے سرگوشی میں کہا۔

"میں اپنے بچوں کو چاہتا ہوں — جان لو، تم نے ابھی جو کچھ کہا ہے وہ ایک ماں کے لیے شرم کا باعث ہونا چاہیے۔ تم مجھ سے منسلک ہو سمجھیں؛ میں آقا ہوں، تمہارا آقا۔ میں تم سے جو چاہوں اور جب چاہوں طلب کر سکتا ہوں کیونکہ قانون بھی میری حمایت میں ہے"

وہ اس کی انگلیوں کو اپنے مضبوط پنجوں میں بھینچ کر چور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی درد سے نڈھال گلابی آنکھیں اس کرب سے چھٹکارا پانے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔

"تم نے دیکھ لیا؛ میں آقا ہوں اور مضبوط ہوں"

جب اس نے گرفت ڈھیلی کی تو اس نے پوچھا۔
"کیا تمھارے خیال کے مطابق میں ایک مذہبی خیال کی عورت ہوں؟"
وہ حیرت سے ہکلایا "ہا، ہاں"
"تم سمجھتے ہو کہ میں جھوٹ بول سکوں گی جب میں کسی بات کی سچائی کے لیے اس قربان گاہ کے سامنے قسم اٹھا لوں جہاں یسوع مصلوب ہوا تھا"
"نہیں"
"تم میرے ساتھ کسی گرجے میں چلو"
اس نے بلند آواز میں کہا "فلپ!"
کوچواں اس قدر جھک کر آواز پر گوش ہو گیا کہ اس کی نظر گھوڑوں پر جمی رہیں۔
"سینٹ فلپ ڈی راؤلے"
بگھی جو اس وقت بوائس ڈی بولانگ کے دروازے پر پہنچ چکی تھی، پیرس لوٹ گئی۔

میاں بیوی گرجا پہنچنے تک خاموش بیٹھے رہے، یہاں پہنچتے ہی مادام مسفراط کود کر باہر آئی اور گرجا گھر میں داخل ہو گئی، کاؤنٹ کچھ فاصلہ پیچھے چلتا ہوا بعد کو داخل ہوا۔ وہ بغیر رکے ہوئے سید ھا منبر کے پردے تک پہنچی اور کرسی پر دو زانوں ہو کر گر پڑی اور چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھک لیا، وہ بہت دیر تک دعا کرتی رہی، اس کے پیچھے کھڑا دیکھتا رہا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ خاموش آنسو بہاتی رہی، وہی آنسو جو شدتِ غم سے عورتیں بہاتی ہیں۔ اس کے جسم میں ایک تموج تھا جو ہلکی سی ہچکی پر ٹوٹ جاتا جسے اس کے ہاتھ کی انگلیاں چھپا کر مسل ڈالتیں۔

کاؤنٹ نے دیکھا کہ صورت حال طول پکڑ گئی ہے اس لیے اس نے اس کے کاندھوں کو چھوا۔ وہ ایسے چونکی جیسے اس کے شانوں کو انگارا چھو گیا ہو۔ وہ مچل کر اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا ———— "مجھے یہی کچھ تم سے کہنا تھا، آج تم جو کچھ بھی کر گزرو مجھے اس کا کوئی خوف نہیں تم چاہو تو مجھے قتل بھی کر دو، سنو! تمھارے بچوں میں ایک بچہ تمھارا نہیں ہے۔ صرف ایک، میں یہ بات تم سے خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہی ہوں، تمھارے وحشیانہ اور مکروہ مردانہ مظالم کے خلاف جسے میں نے لونڈی بن کر بھگتا مجھ سے یہی ایک انتقام ممکن ہو سکا، میرا عاشق کون تھا یہ تم کبھی نہ جان سکو گے اب تم ہر ایک کو مشتبہ نظروں سے دیکھو گے لیکن کسی کو نہ پاؤ گے میں نے اپنے آپ کو بغیر کسی لگاوٹ کے بغیر کسی جذبے کے اس کے حوالے کر دیا تھا صرف اس لیے کہ تم سے دغا کی جائے اور اس نے مجھے ماں بنا دیا۔ اس کا بچہ کون ہے یہ تمھیں کبھی معلوم نہ ہوگا ——— میرا خیال تھا کہ تم سے یہ بات کبھی مناسب وقت پر کہتی اس لیے کہ مردوں سے انتقام اُسے دھوکے میں رکھ کر نہیں لیا جا سکتا، آج تم نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کا اقرار کر لوں۔ لو اب میں سب کچھ کہہ چکی"

وہ تیزی کے ساتھ گرجے کے کھلے دروازے کی طرف بڑھی اس کا خیال تھا کہ اس کے پیچھے اس کے شوہر کے تیز تیز قدموں کی چاپ سنائی دے گی اور ایک فولادی مُکے کی شدید ضرب اس کے سر پر لگے گی جس سے وہ فرش پر گر پڑے گی، لیکن ایسا نہ ہوا، وہ گاڑی تک پہنچ گئی اور کود کر نشست پر جا بیٹھی اس کے سانس کی دھونکنی خوف اور شدتِ غم سے تیز چل رہی تھی اس نے کوچوان کو اشارہ کیا "گھر"

گھوڑے تیز رفتار قدم سے روانہ ہو گئے۔

کاؤنٹس ڈی مسقراط رات کے کھانے کے وقت کا اپنے کمرے میں اس مجرم کی طرح انتظار کر رہی تھی جسے موت کی سزا سنائی جا چکی ہو اور اب اُسے سوار پہنچنے کی گھڑی کا انتظار ہو اب وہ کیا کرے گا؟ کیا وہ گھر پہنچ چکا ہے؟ خود سر جذباتی، تندمزاج اور غصیلا ـــــ نہ جانے اس نے کیا کچھ کر گذرنے کا تہیہ کر لیا ہوگا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی، وہ ہر لحظہ گھڑی کی طرف دیکھتی۔ اس کی خادمہ آئی، اسے شام کا لباس پہنایا اور بنا سنوار کر چلی گئی، گھڑی نے آٹھ بجائے اسی وقت دروازے پر دو دستکیں ہوئیں اور خانساماں اندر آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔

"کاؤنٹ آ چکے ہیں؟"

"جی ہاں ـــــ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں"

کاؤنٹس کو ایک لحظہ یہ خیال آیا کہ وہ چھوٹا گھروشی طمنچہ ساتھ رکھ لے جسے اس نے ایک ہفتہ پیشتر خریدا تھا جب اس کے دل میں یہ سارا طوفان اٹھ رہا تھا، پھر اس خیال سے کہ وہاں سب بچے موجود ہوں گے اس نے کچھ نہ لیا صرف ایک خوشبودار شیشی اٹھا لی۔ وہ رسمی طور پر کرسی سے اٹھا ہلکی سی کورنش بجا لائی گئی اور بیٹھ گئے۔ تین لڑکے اور ان کا مؤدب ایبے اس کی داہنی جانب تین لڑکیاں اور ان کی فرنگن معلمہ بائیں جانب تھے، ننھا اپنی انیسہ کے ساتھ بالائی منزل پر تھا۔ ایبے نے معمول کے مطابق حمد پڑھی اور کھانا شروع ہو گیا، ایک طرف کاؤنٹس جذبات کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی نظریں جھکائے کھاتی رہی دوسری طرف کاؤنٹ کی غمگین نظریں کبھی تین لڑکوں اور کبھی تین لڑکیوں کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیتی رہیں۔

دفعتہً اس سے ایک جام شراب ڈھلک کر ٹوٹ گیا، شراب بہہ نکلی اور دسترخوان تر ہو گیا، اس خفیف سی آواز پر کاؤنٹس چونک پڑی اور اب پہلی بار دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ ان کی شرربار نگاہوں کے ٹکراؤ سے ان کا اعصابی تناؤ بڑھتا ہی رہا، ہر لمحہ ان کی نظریں آپس میں متصادم ہوتی رہیں جیسے چلتے ہوئے طمنچوں کی تیز رفتار گولیاں۔

ایبے نے محسوس کیا کہ اس کھچاؤ کی ضرور کوئی وجہ ہو گی جسے وہ سمجھ نہ سکا اور گفتگو کے لیے کسی موضوع کی تلاش کرنے لگا، اس نے کئی عنوان قائم کئے لیکن اس کی کوششیں ان کے خیالات کے دھارے کو توڑ نہ سکیں۔ اس دوران میں مکمل خاموشی طاری رہی۔ کاؤنٹس کے نسوانی سلیقے اور جبلت نے دو تین مرتبہ جواب دینے کی کوشش بھی کی لیکن عبث کہ وہاں دماغی خلجان کے سبب الفاظ کا ساتھ چھوٹ چکا تھا اور اس لمبے چوڑے کمرے کی مہیب خاموشی میں اسے خود اپنی آواز سے خوف سا محسوس ہوتا تھا جہاں کبھی کبھی چھری یا کانٹے کی ہلکی سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

یکبارگی اس کا شوہر میز پر آگے جھک کر کہنے لگا۔

"یہاں اپنے بچوں کے درمیان قسم کھا کر کہو کہ جو کچھ تم نے مجھ سے آج کہا ہے بالکل سچ ہے"

نفرت جو اس کے رگ و پے میں تیرتی پھرتی تھی دفعتہً مشتعل ہو گئی۔ اس نے اس سوال کا جواب اسی استقلال سے دیا جس مستقل مزاجی سے اس کی نظروں کا جواب دیتی رہی تھی۔ اس نے اپنے بازو اٹھائے داہنا لڑکوں کی طرف اور بایاں لڑکیوں کی جانب کر کے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے نہایت غیر مبہم، واضح اور جاندار آواز میں کہا "اپنے بچوں کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے تم سے

جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہے"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نہایت خشمگیں تیوروں میں رومال کو میز پر پٹکتے ہوئے مڑا، کرسی دیوار پر دے ماری اور چُپ چاپ باہر نکل گیا۔ کاؤنٹس نے ایک گہری اور ٹھنڈی سانس کھینچی۔ یہ اس کی پہلی فتح تھی۔ اب وہ نہایت پُرسکون آواز میں بچوں سے کہنے لگی۔

"تمہارے اباّ نے ابھی جو کچھ کیا ہے میرے پیارے بچو تم اس کا دھیان نہ کرنا وہ کچھ بوکھلائے ہوئے اور پریشان سے ہیں لیکن تردد کی کوئی بات نہیں، دو چار دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گے۔

پھر اس نے مس اَمتھ اور ایبے سے باتیں کیں اور بچوں کو ماں کے مخصوص انداز میں پیار کرتی رہی۔ کھانا ختم کر کے اپنے بچوں کے ساتھ دیوان خانے میں چلی آئی، جہاں بڑے بیٹے کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کرتی رہی، جب سونے کا وقت آیا تو انھیں جی بھر کر پیار کیا اور رخصت کر کے اپنی خواب گاہ میں چلی آئی۔

وہ انتظار کرنے لگی کیونکہ اُسے کاؤنٹ کے یہاں آنے کا یقین تھا۔ چونکہ وہاں بچے نہ تھے اس لیے اس نے اپنے جسم و جان کی مدافعت کرنے کا اسی طرح تہیہ کر لیا جس طرح ہر عورت اپنی زندگی کی مدافعت میں تیار ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی جیب میں وہی چھوٹا سا گردشی طمنچہ ڈال لیا۔

گھنٹے معمول کے مطابق بجتے رہے وقت گذرتا رہا، یہاں ہر آواز ساکت تھی صرف گھوڑا گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ کی مدھم آواز کبھی کبھی سڑک کی سمت سے پردہ پوش کھڑکیوں سے اندر آتی رہی۔ وہ انتظار کرتی رہی توانا اور اعصاب گرفتہ، بالکل بے خوف ہر چیز کے لیے تیار فاتح کی حیثیت سے، کیونکہ اب اس کے ہاتھ اُسے تمام عمر پیہم ایذا پہنچانے کا گُر آ چکا تھا۔

صبح کی پہلی کرن کھڑکی کے دروازوں سے پردے کے اوٹ چمکنے لگی۔ وہ رات گھر نہیں لوٹا، کاؤنٹس جاگ اٹھی اور یہ معلوم کر کے حیرت زدہ رہ گئی کہ وہ رات نہیں آیا۔

جب اس کی خادمہ چائے کر آئی تو ساتھ ہی اس کے خاوند کا ایک خط اُسے دے گئی جس میں لکھا تھا کہ وہ ایک طویل سفر پر روانہ ہو رہا ہے اور تحریر مابعد میں لکھا تھا کہ اس کے وکیل کاؤنٹس کے تمام اخراجات کے کفیل ہوں گے۔

یہ غنائیہ کا واقعہ ہے جب رابرٹ شیطان کے دو ایکٹس کے درمیانی وقفہ میں لوگ اسٹالوں پر اپنی ٹوپیاں اوڑھے کھڑے تھے، ان کی صدریوں کی تراش ایسی تھی کہ ان کی سفید قمیص کا بڑا حصہ دکھائی دیتا تھا جس پر طلا اور جواہرات کے قبابند چمک رہے تھے، وہ ان عورتوں کی جانب دیکھ رہے تھے جو اپنی مخصوص نشستوں میں زر و جواہرات سے لدی ہوئی نیم عریاں لباس پہنے فروکش تھیں عورتیں جو اس گرم فضا میں پھول کی طرح کھلی کھلی تھیں ان کا حسن، ان کے چہرے کی صباحت اور شانوں کی گوری گوری رنگت نغمہ کے پس منظر اور انسانی آوازوں کے درمیان دعوتِ نظارہ رکھتی تھیں۔

اس عظیم الشان تھیٹر میں دو دوست سازندوں کی طرف پشت کیے اِن پری جمالوں کے زر و جواہرات، ان کی داد عیش اور عشوہ طرازیوں کے پس پردہ نمائش جمال کے حقیقی اور سرآسا پہلوؤں کا نظارہ کر رہے تھے۔

اس میں سے ایک راجر ڈی سالنس نے اپنے ساتھی برنارڈ گرینڈلن سے کہا "دیکھو تو سہی بر کاؤنٹس ڈی مسقراط آج بھی

کتنی حسین ہے"

اُس سال خوردہ نے اپنی باری پر اوپیرا کی عینک چڑھائی اور ایک دراز قامت خاتون کی طرف دیکھا جو مقابل کی ذرد گاہ میں بیٹھی تھی، یہ عورت اب بھی اپنی عمر سے بہت چھوٹی دکھائی دیتی تھی، اس کا حُسن بگانہ ہرکس و ناکس کی مشتاق نگاہی کا محور بنا ہوا تھا زرد گلاب کی رنگت میں چہرے کی تراش پر عجبہ کا گمان ہوتا تھا، اس کے سیاہ بالوں پر ہیرے کا جھپکا ستاروں کے جھرمٹ کی مانند چمک رہا تھا۔

جب وہ کچھ دیر تک اسے دیکھ چکا تو برناڈ گر ینڈلن نے تفنن آمیز لہجہ میں خلوص اور یقین کے ساتھ جواب دیا۔

"آپ اس کو بجاطور پر حسین کہہ سکتے ہیں، آپ کے خیال کے مطابق اس کی عمر کتنی ہو گی؟"

"ذرا ٹھہریئے۔ میں آپ کو بالکل صحیح بتلاتا ہوں، کیونکہ میں اس کو اس وقت سے جانتا ہوں جبکہ وہ بچی تھی۔ اس کی عمر ہے ......وہ......تیس......تینتیس......پچھتیس......چھتیس سال کی

"غلط"

"مجھے پورا پورا یقین ہے"

"بھئی وہ تو پچیس کی معلوم ہوتی ہے"

"نہیں نہیں —— جانِ من اس کے تو سات بچے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ساتوں زندہ اور رسلامت ہیں — یہ بہت اچھی ماں بھی ہے، میں اس کے گھر کبھی کبھی جایا کرتا تھا۔ اس کا مکان بڑی پُرسکون اور خوشگوار جگہ پر ہے، وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی کنبہ داری کی ساری اہلیت رکھتی ہے۔"

"کتنی عجیب بات، کیا اس کے بارے میں کبھی ایسی ویسی خبر نہیں اُڑی"

"کبھی نہیں"

"تم اس کے خاوند کے بارے میں بھی جانتے ہوگے، عجیب طرز کا آدمی ہے، کیوں ٹھیک ہے نا"

"ہاں — ہے بھی اور نہیں بھی، بہت ممکن ہے کہ ان کے درمیان وہ چھوٹا سا ڈرامہ بھی ہوا ہو جو چھوٹے چھوٹے خانہ زلو ڈراموں میں سے ایک ہو جس کی بابت لوگ صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں پوری طرح جان نہیں سکتے، ہم بھی صرف قیاس کر کے اس کی اصلیت کے قریب ہو کر سوچ سکتے ہیں۔"

"مثلاً"

"میں خود بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، مستزاد ایک مثالی خاوند رہ چکنے کے بعد اب بڑی فاسٹ لائف گذار رہا ہے جب تک وہ اچھا خاصا متاہل آدمی تھا تب تک بڑا تنک مزاج اور جلالی تھا لیکن جب سے وہ اس غیر معتدل زندگی میں داخل ہوا اس کے طور بالکل بدل چکے ہیں، لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کہیں کچھ دال میں کالا ضرور ہوگا۔ اب اُسے کوئی گُھن آہستہ آہستہ کھوکھلا کر رہا ہے اس کی عمر بھی کافی ہو چکی ہے۔ جب یہ تیس برس کی ہو چکی تو اس نے بچوں کا سلسلہ یکلخت بند کر دیا اور ضیافتِ حُسن کے اس زریں دور میں داخل ہو گئی جس کے اختتام کے آثار بظاہر کہیں دکھائی نہیں دیتے"

"بیچاری عورت!"

"کیوں؟"

"کیوں نہیں عزیز من — آہ ذرا سوچو تو سہی ایسی عورت کے بیسے گیارہ سال کی "زچہ گی" — کیسا جہنم ہوگا!" اس کا سارا شباب، تمام حسن کامیابی و کامرانی کی ہر امید اور ماہتاب کی طرح درخشاں زندگی کا ہر شاعرانہ تخیل افزائش نسل کے گھناؤنے قانون کی قربان گاہ پر یوں بھینٹ چڑھا دیا جائے کہ اس کی حیثیت بچہ پیدا کرنے والی مشین سے زیادہ نہ رہے"

"تم اسے کیونکر روک سکتے ہو، یہ تو عین منشائے فطرت ہے"

"درست ہے، جب تو میں کہتا ہوں کہ یہ فطرت ہماری دشمن ہے اس لیے ہمیں ہمیشہ اس کے خلاف برسرپیکار رہنا چاہیے۔ یہ ہمیں اپنے مقام سے جانوروں کی سطح پر کھینچ رہی ہے۔ تمھیں اس بات کو ماننا پڑے گا کہ فطرت نے کوئی ایک چیز بھی اس زمین پر ایسی پیدا نہیں کی جو صاف ستھری، خوبصورت ہو جو ہمارے آدرش کے حصول میں ہماری معاون ثابت ہو سکے۔ پھر یہ کام انسانی دماغ نے انجام دیا۔ یہ ہم لوگ ہی تو ہیں جنھوں نے حسن میں نکھار، اس میں آن جانا جادو اور پُراسرار بینت اپنے نغموں کی دلکشی سے پیدا کی، ان کے باب میں شعر و سخن کی محفلیں فروزاں کیں، فن کاروں نے اسے آدرش کا مقام بخشا اور داناؤں نے اس کی تشریح میں پرمغز دلائل دیے، کچھ صباحت اور حسن، کچھ نامعلوم طلسم اور بھید فطرت کے منظر میں دیکھے اور انھیں طشت ازبام کیا۔

قدرت نے وجود کی تخلیق ایک لوتھڑے کی صورت میں کی جن سے بیماری کے جرثومے چمٹے ہوئے رہتے ہیں اور جو کچھ عرصہ درندگی کے عالم سرخوشی میں گذار کر ضعیفی و ناتوانی کے گڑھے میں گر پڑتے ہیں، جہاں انسانی بےچارگی درماندگی اور نہ جانے کیا کیا قباحتیں منہ پھاڑے ان کی منتظر رہتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انھیں صرف اسی لیے پیدا کیا کہ وہ اس گھناؤنے طرز پر اپنے بچے پیدا کریں اور دو روزہ حشرات کی طرح فنا ہو جائیں۔

یہ حقیقت ہے کہ جانداروں میں توالد و تناسل جیسی گھناؤنی اور مکروہ شے کوئی اور نہیں جس کے خلاف تمام نازک طبائع نے ہمیشہ بغاوت کی ہے اور کرتے رہیں گے۔ جب اس کفایت پسند فطرت نے ہمارے اعضا ایسے بنائے ہوں کہ ہر عضو ایک سے زیادہ مقصد کو پورا کرتا ہے تو اس نے ہماری تخلیق کے اس اعلیٰ و ارفع فعل کے لیے جو ہمارے تمام افعال میں ممتاز ترین تھا ان اعضا کو کیوں منتخب نہیں کیا جو اتنے گھناؤنے اور گھٹیا درجے کے نہ تھے، دہن جو غذا لے کر جسم کو تروتازگی پہنچاتا ہے وہ عضو ناطقہ بھی ہے اور خیالات ڈھل کر ظہور میں آتے ہیں، لحم سے لحم کی نہ صرف نمو ہوتی ہے بلکہ افکار بھی نشر ہوتے ہیں، عضو شامہ پھیپھڑوں کو حیات پرور ہوا پہنچانے کے علاوہ خوشبوؤں سے دماغ کو معطر کرتی ہے، پھولوں کی، بن کی، درختوں کی اور سمندر کی خوشبو، کان جس کی وساطت سے ہمارے آپس کا پیام و سلام ہے موسیقی کی تخلیق کا سبب بھی ہے جس سے حسین خوابوں اور شادمانیوں کی دنیا آباد ہوتی ہے لیکن یہاں یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہاں صورت حال سے فطرت نے مرد و زن کے "کاروباری" تعلقات کے باب میں تحویل کعبہ کی ایک امتناعی صورت رکھ دی ہے — تاہم مرد نے عورت میں محبت کا عنصر پا لیا ہے جو اس صنم کی پرکاری کا معقول سبب ہے اور اس نے اس کی شعر و ادب سے اتنی تزئین کی ہے کہ عورت

اپنے محور اصل سے بسا اوقات احتراز کر جاتی ہے۔ ہم میں سے وہ جو اپنے آپ کو دھوکا دینے کی ہمت نہیں رکھتے انھوں نے لفظ بدی کا سہارا لیا اور تجربہ گری پر حسین پردے ڈالے، یہ سراسر فطرت کا استہزا اور حسن کی بارگاہ میں عقیدت پیش کرنا ہے گرچہ یہ عقیدت سو فیانہ ہی سہی"

"لیکن عام آدمی بچے پیدا کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے تمام چرند و پرند ایک دوسرے کے ساتھ قانون فطرت سے منسلک ہیں"

"اس عورت کو دیکھو اور بتاؤ کہ یہ کتنی وحشیانہ اور نفرت انگیز بات ہے کہ ایسا موتی اور ایسی آب و تاب کا ہیرا جس کی تکوین کا مقصد واحد صرف حسن ہے جو صرف پرستش کے لیے، صرف ضیافت نظر کے لیے اور صرف چاہت کے لیے پیدا کی گئی ہو، اسی نے اپنی زندگی کے گیارہ برس اسی میں بسر کر دیئے، کہ وہ کاؤنٹ ڈی مسقراط کے لیے چند ورثا چھوڑ جائے۔

برناڈ گرینڈلن نے ہنستے ہوئے جواب دیا

"اس میں صداقت تو ہے، لیکن آپ کو عام آدمی سمجھ بھی تو نہیں سکتا"

سالینس کی طبیعت اور رواں ہو گئی۔

"تم جانتے ہو، مرے پاس فطرت کا کیا تصور ہے" اس نے کہا۔

"تخلیق کا ایک بحر بیکراں جو لاکھوں لاکھ جہاں بکھیرتا ہے، جیسے ایک تنہا مچھلی سمندر میں اپنے بے شمار بچے جن کر پھیلا دیتی ہے، فطرت تخلیق کرتی ہے کیونکہ یہ اس کا اپنا فعل ہے لیکن اُسے اس کا علم نہیں کہ وہ کیا کر رہی ہے اور صرف اپنے ایک کام میں منہمک ہے۔ اسے اس کا علم نہیں کہ اس کے پھیلائے ہوئے حشرات آپس کے خلط ملط سے کس طرح کی مخلوق میں ڈھل رہے ہیں۔

فکر انسانی، عارضی، مقامی اور ایک سراسر نا اندیشیدہ حادثہ ہے جسے اس عالم وجود کے ساتھ معدوم ہو جانے کی سزا کا مستوجب قرار دیا گیا ہے اور جسے شاید دوبارہ یہیں یا اور کہیں اسی صورت میں یا مختلف طور پر نئے ترتیب کے تحت سدا نئے آغاز کے ساتھ جنم لینا ہے، ہم اس موہوم سے حادثے کے باعث جو اس کے ادراک کو لاحق ہوا ہے۔ اس دنیا میں خود کو مضطرب پاتے ہیں جو ہمارے لیے نہیں بنائی گئی، جو ہمارے استقبال کو نہیں آئی تاکہ ہمارے قیام و طعام کا بندوبست کرے اور غور و فکر کرنے والی مخلوق کو مطمئن کر سکے اور اس کا باعث وہ فطرت ہے کہ ہم تمام سلیم الطبع اور مہذب لوگوں کو ہر لمحہ اس کے خلاف جسے ہم مشیت کا کاروبار کہتے ہیں جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔

گرینڈلن جو اس کی گفتگو غور سے سن رہا تھا کہنے لگا۔

"گویا آپ کی دانست میں انسانی فکر بچے کی اندھی اور الوہی پیدائش کے ساتھ از خود وجود میں آئی"

صاف ظاہر ہے کہ یہ ہمارے دماغی اعصاب کے مرکزہ کا ایک اتفاقی فعل ہے جیسے کوئی ان جانا کیمیائی عمل جو نئے مرکبات کے امتزاج سے دفعتہً شروع ہو جاتا ہے یا جسے آپ بجلی کی رو سے تشبیہہ دے لیجئے جو رگڑ سے یا دو اشیا کے غیر متوقع طور پر یکجا ہو جانے سے دوڑنے لگ جاتی ہے یا مختصراً اسے ایک تخمیری عمل کا حاصل سمجھ لیں جو چھوٹے چھوٹے اور ہین

زندہ اجسام کے بار اور تصادم سے اُبھرتا ہے۔ لیکن اے ہم نشین بات کا پتہ تب ہی چل سکتا ہے جب کوئی اپنے اطراف کے ماحول کا مطالعہ کرے۔ اگر اس عظیم انسان فطرت کی منشاء کے مطابق انسانی فکر کو خود سپردگی اور میکانی خیالات کے برعکس اس نہج پر پروان چڑھنا تھا کہ وہ اس قدر تھکا دینے والی، استفسار پسند، ہیجان خیز اور خونچکاں ہو جائے تو کیا یہ دنیا، یہ خاکدان، یہ بن، یہ گھاٹیاں اور سطح کا کرۂ چمن ان بے چارے احمقوں کے رہنے کی جگہ ہوتی جہاں ہماری کفایت پسند مشیت نے ہمیں لباس برہنگی عطا کیا، ہمارے لیے غاروں میں اور پیڑ تلے استراحت فراہم کی اور خورد و نوش کے لیے ذبیحہ اور کچی ترکاریوں کا انتظام رکھا جس کو سورج کی روشنی اور بارش تازگی بخشتی ہے، ہر لمحہ غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا ہم جیسی مخلوق کے لیے نہیں بنائی گئی خیال کی بدولت جو کہ دماغ کے خلیوں میں اعصاب کی کرشمہ سازیوں سے اجاگر ہوتا اور ابھرتا ہے۔ ناتواں غیر آگاہ اور الجھا ہوا جیسا کچھ کہ یہ ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ ہم میں سے ان کے لیے جو ذہن رسا رکھتے ہیں یہ جہان دوامی بن باس ہے۔ ذرا اس سیارے کو بھی دیکھو جسے ان کی بود و باش کے لیے فطرت نے منتخب کیا ہے جو اس کے مکین ہیں۔ کیا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ دنیا جس طور بنائی گئی ہے اور جس طور پر سارا جنگل اُگائے گئے ہیں صرف جانوروں کی جگہ ہے، ہمارے تمہارے لیے یہاں کیا دھرا ہے۔ کچھ بھی نہیں اور اُن کے لیے سب کچھ ہے، اُن کے لیے یہاں کوئی اور کام نہیں سوا اس کے کہ وہ کھائیں اور اپنی جبلت کے مطابق ایک دوسرے کا شکار کریں کیونکہ فطرت نے ملنساہٹ اور پُرامن رہنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ اس کی نظریں صرف جانداروں کی موت پر رہیں جو ایک دوسرے کو نگلنے کے درپے رہے، کیا قمری، کبوتر اور کبکِ دری، باز کی فطری غذا نہیں؟ اسی طرح گائے بیل بھیڑ بکری اور ہرن دیگر مہیب گوشت خوار درندوں کے ازلی شکار ہیں۔ کیوں یہ ممکن نہ ہوا کہ فطرت زمین کی کوکھ سے ان کا پیٹ بھر دیتی۔

اور ہماری بابت یہ ہے کہ جس طرح ہم بہت متمدن، ذہین اور پاکیزہ ہیں ہمیں اتنی ہی جدوجہد کے ساتھ اس حیوانی جبلت پر قابو پالینا چاہیے جو ہمارے اندر فطرت کی منشاء کے مطابق ہے، چنانچہ ہم نے اپنے اندر چھپے ہوئے وحشی کی تہذیب کے لیے ہر چیز بنائی اور دریافت کی، مکان بنائے پُرتکلف کھانے تیار کیے، سلونے، مٹھائیاں، حلوے اور مشروبات بنائے کپڑے آرائشات، ریلیں اور بے شمار مشینیں ایجاد کیں، سائنسی اور فنی علوم، لکھائی پڑھائی، شعر و سخن اس کے علاوہ ہیں۔ زندگی کی تمام آسائشیں اور تمام اورش ہم سے پیدا ہوئے تاکہ ہمارا وجود اور ہماری زندگی جس کی غایت الوہی مشیت کے پیشِ نظر صرف تولید و تناسل ہے کم اُکتا دینے والی اور قدرے آسان ہو جائے۔

اس تھیٹر کو دیکھو۔ کیا یہ دنیا ہماری پیدا کی ہوئی دنیا نہیں ہے جس کا سان و گمان بھی کسی کو نہ ہوگا۔ اس کو صرف ہمارا ذہن رسا سمجھ سکتا ہے جو ہمارا حیاتی اور ذہنی مشغلہ ہے جس کی ایجاد صرف ان لوگوں نے صرف ان لوگوں کے لیے کی جو ہماری طرح مضطرب اور دل فگار رہیں۔

ذرا اس عورت کو بھی دیکھو مادام مسقراط فطرت نے اس کو بنایا تھا تاکہ وہ غاروں میں برہنہ یا جنگلی جانوروں کی کھالوں سے لپٹی زندگی بسر کرے لیکن تم ہی بتاؤ کہ کیا وہ اب بہتر حالات میں نہیں ہے۔ جب اس عورت کا ذکر آ گیا ہے تو بتاؤ کہ کیا کسی کو علم ہے کہ اس کے وحشی اور جانور شوہر نے کیوں اور کس طرح ایسے نفیس شریک زندگی کو یکبارگی چھوڑ دیا اور

خود طولفوں کا ہوگیا جبکہ اس احمق کا ؤ دی سے اس کو سات بچے بھی پیدا ہو چکے ہوں۔"

گرینڈلن نے جواب دیا

"او ہو — برادرم بات اب سمجھ میں آئی اور شاید اس کی یہی ایک معقول وجہ بھی ہو کہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہنا آسے بالآخر بہت مہنگا پڑ رہا ہوگا۔ تب اس نے گھریلو کفایت شعاری کے مدِ نظر اس اصول کو اپنا لیا، جس کے بارے میں آپ جیسے فلسفی لوگ زیادہ جانتے ہیں۔

عین اسی موقع پر تیسرے ایکٹ کے لیے پردہ اٹھا وہ گھوم کر اپنی اپنی نشست پر بیٹھ گئے اور اپنی ٹوپیاں اتار لیں۔

کاؤنٹ اور کاؤنٹس گاڑی میں پہلو بہ پہلو خاموش بیٹھے ہوئے غنائیہ کے بعد گھر واپس آرہے تھے۔ شوہر نے بیوی سے کہا۔

"گیبرل!"

"کیا؟"

"کیا خیال ہے اب بھی کوئی کمی باقی رہ گئی ہے؟"

"کا ہے کی"

"اس چھ سالہ خوفناک سزا کی مدت میں جس کا تم نے مجھے مستوجب قرار دیا ہے"

"آپ بتلا دیجئے۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"بتاؤ اُن میں سے وہ کون ہے"

"ہرگز نہیں"

"خیال کرو۔ میں اپنے بچوں کا نہیں رہا۔ وہ میرے آس پاس ہوتے ہیں لیکن میں ان کی مسرت کو اپنے دل میں نہیں پا سکتا جب تک وہ تکرہ وہ شبہ دل میں باقی ہے۔ بتاؤ ان میں سے وہ کون بچہ ہے، میں قسم اٹھاتا ہوں کہ تمھیں معاف کر دونگا اور اس کے ساتھ بھی سب کے برابر کا سلوک رکھوں گا"

"مجھے یہ حق حاصل نہیں"

"کیا تم یہ نہیں دیکھ رہی ہو کہ مجھ سے اس عذاب کو برداشت کرنے کی تاب رخصت ہو چکی ہے۔ اس خیال نے مجھے گھلا دیا ہے۔ یہ سوال دائمی طور پر میرے پیشِ نظر رہتا ہے۔ جب میں ان بچوں کو دیکھتا ہوں، یہ اذیت مجھے پاگل کئے جا رہی ہے"

"تب آپ نے بہت دُکھ جھیلا ہے" اس نے کہا۔

"بے پناہ — کیا مجھے اس سوال کے جواب کے بغیر تمھارے ساتھ رہنے کی خوفناک اذیت کو برداشت کر لینا چاہیے تھا اور ان دل فگار حالات میں اپنے دن پورے کر لینے چاہیے تھے کہ ان میں سے ایک ایسا ہو جسے میں نہیں پہچانتا اور جو مجھے باقی دوسرے بچوں کو چاہنے سے روکتا ہے۔"

اس نے دہرایا "تب واقعی آپ نے بہت دُکھ جھیلا ہے"

اس نے غمگین اور دل برداشتہ آواز میں کہا

"ہاں، کیونکہ میں تم سے ہر روز نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کوفت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے، اگر مجھے ان کی محبت نہ ہوتی تو کیا میں تمھارے ساتھ ان کے درمیان اس گھر میں رہتا؟

اُف ـــ تم نے مجھ سے وحشیانہ سلوک کیا ہے، تم یہ جانتی ہو کہ میری محبت کی ہر رمق مرے بچوں کے لیے ہے، میں ان کے لیے اگلے وقتوں کا باپ ہوں اور تمھارے لیے پرانے خاندانوں کی طرح کا شوہر تھا۔ میں اپنی جبلت سے ایک فطری آدمی رہا ہوں بالکل اپنے بزرگوں کی جگہ ــــــ ہاں، مجھے اعتراف ہے کہ تم نے مجھے بے پناہ حاسد بنا دیا تھا جس کی وجہ یہی تھی کہ تم دوسرے عہد کی عورت ہو جس میں ایک نئی روح ہے، تم ایک نئی قوم کی فرد ہو جس کی ضروریات بھی کچھ اور ہیں ـــ اُف ۔ میں وہ کبھی نہیں بھول سکتا جو باتیں تم نے مجھ سے کہی تھیں ـــ اس دن سے میں نے تمہاری چینا چھوڑ دی، میں نے تمھیں قتل بھی نہ کیا کیونکہ اس کے بعد دنیا کا کوئی طریقہ مرے پاس ایسا نہ تھا جس سے میں یہ معلوم کر لیتا کہ ان بچوں میں وہ کون ہے جو میرا نہیں ہے، میں منتظر رہا ـــ اس عرصہ میں ہم ستے تمھارے قیاس سے کہیں زیادہ اذیت برداشت کی ہے میں شاید دو بڑوں کے علاوہ باقی تمام بچوں کو پیار کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا، میرے پاس ان کی طرف دیکھنے کی، ان کو پاس بلانے کی، ان سے پیار کرنے کی جرأت نہیں رہی۔ میں خود سے یہ سوال کیے بغیر کسی کو اپنے زانوؤں پر نہیں بٹھا سکتا تھا کہ "کیا یہ ہو سکتا ہے؟" میں اپنے گذشتہ چھ سالہ رویے میں حق بجانب ہوں، اس عرصہ میں بھی میری مہربانیاں اور خدا ترسی تمھارے ساتھ رہی، مجھ سے اب سچ کہہ دو، میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کسی صورت تم پر نامہربان نہیں رہوں گا"

سواری میں مکمل تاریکی کے باوجود وہ اپنے خیال کے مطابق محسوس کرنے لگا کہ کاؤنٹس بے حد متاثر ہو رہی ہے اور اسے یقین ہونے لگا کہ وہ بالآخر کہہ دے گی۔ وہ پھر بولا

"میں بھیک مانگتا ہوں، میں التجا کرتا ہوں، مجھے بتلا دو"

"میں شاید تمھارے خیال سے بھی زیادہ گناہگار ہوں" اس نے جواب دیا

"لیکن یہ مسلسل حاملہ رہنے والی زندگی زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکتی تھی اور میرے پاس صرف یہی ایک ذریعہ تھا جس سے تم میرے پاس نہ آتے، میں خدا کے سامنے تم سے جھوٹ بول گئی۔ نہ صرف یہی بلکہ اپنے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم بھی اٹھالی، حقیقت میں موسیو...... میں نے تمھارے ساتھ کوئی دغا کی ہی نہ تھی"

اس نے اندھیرے میں اس کے بازوؤں کو جکڑ لیا اور اسی طرح شکنجہ کرتے ہوئے جیسے اس خوفناک موقع پر کیا جب وہ آج سے چھ سال پہلے بولانش ڈی بولاک کی طرف جا رہے تھے ـــ وہ ہکلایا

"ک...... ک...... کیا یہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ"

لیکن وہ غم کی بے پناہ شدت میں غرایا

"اب کبھی نہ ختم ہونے والے نئے شکوک میرے دل میں پھر سے جنم لیں گے، تم نے اس مرتبہ جھوٹ کہا تھا یا اب

بول رہی ہو ـــــ بتلاؤ ؛ بتلاؤ میں تمہارا کیونکر اعتبار کروں، اس واقعہ کے بعد کوئی کسی کی بات کا کیونکر یقین کرے۔ مجھے اب کبھی معلوم نہ ہوگا۔ میں یہ امید رکھتا تھا کہ تم کہو گی کہ وہ بچہ جیکوس یا جینیں ہے"

گاڑی محل کے صحن میں داخل ہوئی، جب یہ سیڑھیوں کے سامنے آ گئی تو کاؤنٹ معمول کے مطابق پہلے اترا اور اپنے ہاتھ کا سہارا پیش کیا، جب وہ محل کی پہلی منزل میں داخل ہوئے تو وہ بولا

"کیا مجھے کچھ دیر اور باتیں کہنے کی اجازت مل سکے گی؟"

"کیا ہرج ہے" اس نے جواب دیا

وہ دونوں ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، موم بتی روشن کرتے ہوئے بیاہ حیران سا دکھائی دیتا تھا، جیسے وہ باہر نکلا اس نے بات شروع کر دی۔

"آخر مجھے حقیقت کا پتہ کیونکر چل سکتا ہے گیبرل؟ میں نے تم سے ہزار التجائیں کیں، لیکن تم ٹس سے مس نہ ہوئیں بت کی طرح خاموش اور غیر متاثر ـــــ اور آج تم یہ کہتی ہو کہ میں جھوٹ بولتی رہی ہوں۔ مجھے چھ برس تک اس بات کا یقین دلاتی رہیں ـــــ نہیں ـــــ تم اب جھوٹ بول رہی ہو۔ نہ معلوم کیوں۔ شاید اس لیے کہ مجھ پر رحم آ گیا ہو"

اس نے نہایت خلوص اور قائل کرنے والے انداز میں کہا

"اگر میں یوں نہ کرتی تو ان چھ سالوں میں مجھے اور چار بچے پیدا ہو چکے ہوتے"

وہ بولا "ایسی بات کوئی ماں کہہ سکتی ہے؟"

"اوہ" اس نے جواب دیا "میں قطعی محسوس نہیں کرتی کہ میں ان بچوں کی ماں ہوں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، میرے لیے ان کا ماں ہونا، اور انھیں دل و جان سے چاہنا کافی ہے جنھیں میں پیدا کر چکی ہوں...... میں...... میں...... ہم عورتیں ایک مہذب دنیا سے تعلق رکھنے والی ہیں موسیو۔ ہم وہ نہیں ہیں۔ ہمیں قطعی انکار ہے کہ ہم صرف ایک جنس ہیں جو اس دھرتی پر بچوں کا بوجھ لادتی رہیں" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور جانے لگی کہ کاؤنٹ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"صرف ایک لفظ اور گیبرل ـــــ مجھ سے سچ سچ کہہ دو"

"میں نے ابھی آپ سے کہا ہے، میں نے آپ سے کبھی کوئی دھوکا نہیں کیا ہے موسیو"

کاؤنٹ نے اس کے چہرے پر گہری نظریں ڈالیں اور دیکھا کہ وہ کس قدر حسین تھی، اس کی سرمگیں آنکھیں سرد آسمان کی طرح شفاف معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے سیاہ بال سیاہ دھاگے میں شفاف رات کا سماں پیش کر رہے تھے جس میں ہیروں کا چھپکا تاروں کی طرح جگمگا رہا تھا۔ اس کو دفعتہً احساس ہوا۔ یہ احساس اس کے اندر کی ایک آواز تھی جسے اس نے پہلے کبھی نہ سنا کہ اس منتہٰ بالاشان مخلوق کا مقصود اصلی صرف نسل برآری نہیں بلکہ یہ ان تمام پیچ در پیچ تمناؤں کا عجیب اور پُراسرار حاصل ہے جو ہم میں صدیوں پرورش پاتی رہیں لیکن جنھیں ہم نے ان کے اولیں اور الوہی مقصد کی راہ پر گامزن ہونے سے موڑ لیا جو کسی صوفی کی تلاش میں سرگرداں رہیں اور کبھی کبھی اس کی موہوم سی جھلک حسن میں جلوہ نما ہوتی رہی۔ وہ عورتیں جو صرف ہماری خواب کی دنیا میں بستی ہیں، جن کے حضور میں تمدن کی تمام جمالیاتی موشگافیاں دست بستہ کھڑی ہیں جس کی جلو میں تعیش کا ادر ش ناز و ادا اور حسن کی تمام سحر کاریاں

اس طرح چلتی ہیں کہ ہماری تاریک زندگی روشن اور درخشاں بن جاتی ہے۔

اس کا شوہر اس کے آگے اس انکشاف پر مبہوت کھڑا تھا، اپنے سابقہ حسد کی وجوہات کو قدرے نامکمل طور پر جانتے ہوئے پشیمان اور رنجیدہ ۔ بالآخر وہ بولا۔

"مجھے تم پر اعتبار ہے، میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اس موقع پر تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو، میں اب تک یہی سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہی ہوگا"

اس نے اپنا ہاتھ کاونٹس کی طرف بڑھایا

"پھر ہم دوست ہیں"

کاونٹ نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور جواب دیا

"ہم دوست ہیں ۔ میں تمھارا شکر گذار ہوں"

اس کے بعد کاونٹ حیرت سے اس کی طرف تاکتا ہوا باہر چلا گیا کہ آج بھی اس کی دلفریبی کا وہی عالم ہے۔ اس میں انوکھے جذبات پیدا ہو رہے تھے جس کا سابق میں اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ جذبات اپنے اثر میں سادہ محبت کے جذبے سے زیادہ گہرے اور پائیدار تھے۔

○

آثر لکھنوی

بے منتِ ذوقِ تشنہ لبی تسکین نہیں آرام نہیں
اس عشق تماشا دشمن کا آغاز تو ہے انجام نہیں

جو اپنا گرفتار آپ ہوا اُس کے لیے قیدِ ہستی ہیں
ہر گام پہ کب صیاد نہیں یا رنگ و بو کا دام نہیں

کیا کہیے عیش کے متوالوں سے کہیے تو نہ جانے کیا سمجھیں
اب رنگ جہاں ہے اور ہی کچھ راحت کا یہ ہنگام نہیں

اُس شوخ نے تو ازراہِ کرم دلداری کی غمخواری کی
اس جانِ تمنّا کشتہ کو پھر بھی چین نہیں آرام نہیں

یہ شوق کی محویت دیکھی۔ دیکھا نہ اُسے دیکھا جب اُسے
وہ کون سی بزم تماشا ہے نظارہ جہاں ناکام نہیں

اک رند نے شب مستی میں کہا یہ رازِ درونِ میخانہ
پیغام شکستِ رنگ یہ ہے آہنگ شکستِ جام نہیں

یہ پیچ و تاب شعلۂ دل اک نامۂ پیچیدہ ہے اثر
سوچو تو کبھی ہے کون نفس جو سوئے عدم پیغام نہیں

روح لبوں تک آکر سوچے

احمد ندیم قاسمی

روح لبوں تک آ کر سوچے، کیسے چھوڑوں قریۂ جاں
یوسف قصرِ شہی میں بھی کب بھولا کنعاں کی گلیاں

موت قریب آئی تو دنیا کتنی مقدّس لگتی ہے
کاہشِ دل بھی خواہشِ دل ہے، آفتِ جاں بھی راحتِ جاں

میری وحشت کو تو بہت تھی گوشۂ چشمِ یار کی سیر
یوں تو عدم میں وسعت ہوگی عرش بہ عرش، کراں بہ کراں

غنچے اب تک رنگ بھرے ہیں، اب تک ہونٹ امنگ بھرے
ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہیں پتھرائی آنکھیں نگراں

صرف اک نگہِ گرم سے ٹوٹیں شعلوں میں پروان چڑھیں
ہائے یہ نازک نازک رشتے، ہائے یہ بزمِ شیشہ گراں

دشت و دمن میں، کوہ و کمر میں بکھرے ہوئے ہیں پھول ہی پھول
روئے نگارِ گیتی پر ہیں ثبت مرے بوسوں کے نشاں

آنکھ کی اک جھپکی میں بیتا کتنے برس کا قربِ جمال
عشق کے اک پل میں گزرے ہیں کتنے قرن، کتنی صدیاں

ساری دنیا میرا کعبہ، سب انسان مرے محبوب
دشمن بھی دو ایک تھے، لیکن، دشمن بھی تو تھے انساں

دردِ حیات کہیں اب جا کر بننے لگا تھا حسنِ حیات
کس کو خبر تھی، محو رہے گی قطعِ سفر میں عمرِ رواں

جنت کی یخ بستگیوں کو گرمائے گا اس کا خیال
صبحِ ابد تک جمی رہے یہ انجمنِ آتش نفساں

قطعات

اختر انصاری دہلوی

صبحِ طرب

یہ اہتزاز ہے غم کی ہزاروں راتوں کا — یہ سوز و ساز ہے غم کی ہزاروں راتوں کا
فروغِ صبحِ طرب کو میں بھینچ لوں دل میں — یہ ارتکاز ہے غم کی ہزاروں راتوں کا

خونِ تمنا

نفس نفس ہے گراں بارِ آرزو اب تک — نوا نوا ہے طرب زارِ کیف و خواب تک
بیاضِ درد کی رنگین سرخیوں کی قسم — ٹپک رہا ہے تمناؤں کا لہو اب تک

کیف و نشاط

یہ گلستانِ تصوّر کی وجد بار نسیم — یہ آرزوؤں کے گلشن کی نشّہ بیز شمیم
نفس نفس ہے شرابورِ کیفِ جنت سے — پڑے چھلکتے ہیں نس نس میں کوثر و تسنیم

جفائے بخت

تمام عمر رہے حسرتوں سے راز و نیاز — اُمیدِ شوق سے وعدے وعید ہوتے رہے
ترا کرم تو نہ پایا طلسمِ بخت! مگر — ترے ستم سے بہت مستفید ہوتے رہے

میرا درد

وہ بحرِ کربِ الم کا خلاصہ ہے یکسر — نچوڑ ہے وہ لہو کی اُبلتی ندیوں کا!
مرے وجود کو جس درد نے تراشا ہے — وہ درد ورثہ ہے لاکھوں سسکتی صدیوں کا

ظرفِ غم

وفورِ رحمت و رافت سمیٹ سکتا ہوں — فروغِ بہجت و عشرت سمیٹ سکتا ہوں
مجھے یہ ظرف دیا ہے نہایتِ غم نے — میں دو جہاں کی مسرت سمیٹ سکتا ہوں

عندلیب شادانی

وہ الم کشوں کا ملنا، وہ نشاط و غم کے سائے
کبھی رو پڑا تبسم کبھی اشک مسکرائے

یہ افق سے چاند ابھرا، یہ شفق کا نور پھیلا
کہ تری ضیائے رُخ سے در و بام جگمگائے

بہ ہزار نامرادی جسے عمر بھر سراہا
اسے بے وفا کہوں اب یہ جگر کہاں سے آئے

یہ بہار کیا کرے گی مرے درد کا مداوا
نہ وہ بجلیاں نظر کی، نہ وہ گیسوؤں کے سائے

مرا سوزِ والہانہ، مری شمعِ زندگانی
کہیں نامرادیوں میں یہ چراغ بجھ نہ جائے

○

قتیلؔ شفائی

فسردگی کا مداوا کریں تو کیسے کریں
وہ لوگ جو ترے قربِ جمال سے بھی ڈریں

اک ایسی راہ پہ ڈالا ہے تیرے غم نے کہ ہم
کسی بھی شکل کو دیکھیں تو رُک کے آہ بھریں

یہ کیا کہ بے سبب آئے قضا جوانی میں
یہ کیوں نہ ہو کہ تمھاری کسی ادا پہ مریں

شبِ الم کے بھی ہوتے ہیں کچھ نہ کچھ آداب
تڑپنے والے سحر تک تو انتظار کریں

اُس ایک بات کے بعد اب ہزار بات کرو
یہ دل کے زخم ہیں یارو بھریں بھریں نہ بھریں

ثبوتِ عشق کی یہ بھی تو ایک صورت ہے
کہ جس سے پیار کریں اس پہ تہمتیں بھی دھریں

کچھ ایسے دوست بھی میری نگاہ میں ہیں قتیلؔ
کہ مجھ کو باز رکھیں جس سے خود اُسی پہ مریں

○

عدم

ہے یوں ہجومِ غنچہ و گل صحنِ باغ میں
جیسے مسافروں کے بسیرے سراؤں میں

فہرستِ دل کو غور سے دیکھ ایک بار پھر
میرا بھی نام ہوگا ترے آشناؤں میں

میں اپنے قربِ ذات سے ہوں اتنا مطمئن
بیٹھا ہوں جیسے عرشِ معلےٰ کی چھاؤں میں

اے شیخ حفظِ توبہ کی تلقینِ نامراد
اور وہ بھی برشگال کی بھیگی ہواؤں میں

اک پل ٹھہر کے سطح پہ سرکش حباب نے
زنجیر ڈال دی ہے سمندر کے پاؤں میں

شاید کسی کو خواب میں آیا ہوں یاد میں
کھلنے لگا ہے رات کا سکتہ فضاؤں میں

جتنی بھی اُس کی آنکھ میں مستی تھی اے عدمؔ
وہ ڈھل گئی فقیر کی بہکی دعاؤں میں

○

عدم

بات اب کچھ سمجھ میں آئی ہے
جسم میں ایک شے پرائی ہے

آپ کو دیکھ تو لیا سہواً
یا خدا جان پہ بن آئی ہے

میں وفاکیش، وہ ستم شیوہ
عشق نے کیا گرہ لگائی ہے

باوجود اُن کے پاس ہونے کے
زندگی اک شبِ جدائی ہے

داورِ حشر! میری فردِ عمل
ق
گو ہمہ دفترِ بُرائی ہے

اس کو تھوڑا سا غور سے پڑھنا
یہ مری عمر کی کمائی ہے

کوہکن گو نہ آسکے واپس
اُس نے جرأت تو کر دکھائی ہے

مُنکرینِ خدا سے یہ کہہ دو
تم مرکب ہو۔ وہ اکائی ہے

میں تو ہستی زدہ عدم ہوں صبا
تو نے کس گل کی چوٹ کھائی ہے

جہنّم میں غنڈے

راجہ مہدی علیخاں

خدا نے مجھے جب جہنّم میں پھینکا ڈسا مجھ کو اک سانپ نے پہلے آ کر
پھر اک کالے بچھو نے چٹکی مِری لی پھر اک بھڑ نے کاٹا مجھے مسکرا کر

جہنّم کے بھٹکے ہوئے باسیوں نے مجھے دیکھ کر قہقہے خوب مارے
چڑیلوں کے دادا یہ بھتنوں کے نانا لگے کہنے "کیسی طبیعت ہے پیارے؟"

کیا میری فطرت نے مجھ کو اشارہ چڑھا دفعۃً میرے غصے کا پارا
جہنّم کے ایک ایک باسی کو میں نے وہیں پر پچھاڑا وہیں خوب مارا

اُٹھائی وہاں میں نے ایسی قیامت کہ سانپ اور بچھو جہنم سے بھاگے
میں لوہے کی لٹھ لے کے تھا پیچھے پیچھے وہ اُکھڑے قدم لے کے بھتنے آگے آگے

گئی ٹوٹ اُن نامرادوں کی کمریں ہر اک سمت طوفانِ آہ و بکا تھا
قیامت کے فتنے کو سب لوگ بھولے یہاں اور ہی ایک فتنہ بپا تھا

جہنّم کے لوگوں کی دیکھی یہ حالت تو "شانِ کریمی" کو رحم اُن پہ آیا
"بھگا دو بھگا دو جہنّم سے اس کو" یہ کہہ کر جہنّم سے مجھ کو بھگایا

"چلو بھائی منٹو۔ چلو کرشن چندر!" یہ کہہ کر وہاں سے ہُوا میں روانا
"ہمیں" دور سے کر رہا تھا اشارے سرِ شام جنّت کا موسم سہانا

بورڈ آف انٹرویو

راجہ مہدی علی خاں

کتا کیوں اپنی دم دباتا ہے؟ کتنے میں ایک آلو آتا ہے؟
آسماں پر ستارے کتنے ہیں؟ شہر میں غم کے مارے کتنے ہیں؟
دور یورپ سے ایشیا کیوں ہے؟ ایشیا میں یہ ویشیا کیوں ہے؟
آ کے محمود سترہ حملوں میں کون شے لے گیا تھا گملوں میں؟
پھنس کے نرغے میں رانی جھانسی کے لوگ کتنے بچے تھے پھانسی سے؟
آج کیا بھاؤ ہے بتاشے کا؟ کیٹس کا وزن کتنے ماشے تھا؟
لانگ فیلو کی کتنی ٹانگیں تھیں؟ صبح مرغے نے کتنی بانگیں دیں؟
ذوق کتنے روپے کماتا تھا؟ اپنی بیوی سے کیوں چھپاتا تھا؟
مرزا غالب کے کتنے بچے تھے؟ کتنے جھوٹے تھے، کتنے سچے تھے؟
نظم آزاد کس نے کی ایجاد؟ اب کہاں ہے وہ خانماں برباد؟
سارے ویدوں میں ورڈز ہیں کتنے؟ بندھیاچل میں برڈز ہیں کتنے؟
میرا پگ گھنگرو باندھ کیوں ناچی؟ ناچ کر تم بتاؤ یوں ناچی!
کالی داس اپنے پاس اگر آتا پاس ہوتا کہ فیل ہو جاتا؟
کیوں ہمیں دیکھ کر ہو تم گم سم؟ الوؤں سے کبھی ملے ہو تم؟

مسٹر انجان وٹ وٹ اوو یٹ
بس گرو مر گیا ہے کینڈی ڈیٹ

○

مجید امجد

بڑھی جو حد سے تو سارے طلسم توڑ گئی
وہ خوش دلی، جو دلوں کو دلوں سے جوڑ گئی

ابد کی راہ پہ، بے خواب دھڑکنوں کی دھمک
جو سو گئے، انھیں بجھتے جگوں میں چھوڑ گئی
یہ زندگی کی لگن ہے کہ رتجگوں کی ترنگ
جو جاگتے تھے، انہی کو یہ دھن جھنجھوڑ گئی

وہ ایک ٹیس، جسے تیرا نام یاد رہا
کبھی کبھی تو مرے دل کا ساتھ چھوڑ گئی

گلوں کی آگ بجھی تو کڑکتے لمحوں کی رو
مرے سبو کے لیے، بجلیاں نچوڑ گئی

رکا رکا ترے لب پر عجب سخن تھا کوئی
تری نگہ بھی جسے ناتمام چھوڑ گئی!

فرازِ دل سے اترتی ہوئی ندی امجد
جہاں جہاں تھے حسیں وادیوں کے موڑ، گئی

○

میکش اکبرآبادی

ادھر سے کون یہ گزرا ترا خیال لیے
چمن نے پھول، حسینوں نے دل نثار کیے

تری نظر کو نہ دیکھا جہاں نے یہ دیکھا
کہ خار کس کے چھپائے ہیں پھول کس کو دیے

بہار زینت گلشن ہے پھر بھی کیا معلوم
بہار کے لیے گلشن ہے یا خزاں کے لیے

زباں سے جنگ نگاہوں سے صلح ساری عمر
نہ جل سکے نہ بجھے میری آرزو کے دیے

نگاہ پھیر کے تم نے چھپا لیا اُن کو
گناہ بزم میں جو چشم آرزو نے کیے

مرے سلام پہ اُس نے چرائیں جب نظریں
تو اپنے آپ کو میں نے کئی سلام کیے

جنون و ہوش سے بچ کر رہا ہیں اے میکشؔ
کیے نہ چاک کبھی میں نے پیرہن نہ سیے

○

عبدالمجید حیرت

مضطرب جب ہوا کرے کوئی
نام ان کا لیا کرے کوئی

گفتگو بھی تو ان سے مشکل ہے
کس طرح ابتدا کرے کوئی

ان کے جلووں کو دیکھنے کے لیے
دیدۂ دل تو وا کرے کوئی

ہو توجہ، تو کوئی بات بھی ہو
بے رخی ہو تو کیا کرے کوئی

اس قدر بھی نہ ہم غریبوں سے
بے تعلق رہا کرے کوئی

سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں
کیا کسی سے وفا کرے کوئی

ذاتِ والا میں کوئی وصف تو ہو
جان و دل بھی فدا کرے کوئی

دوسروں کے عمل سے کیا مطلب
فرض اپنا ادا کرے کوئی

بندِ غم سے نجات مل جائے
اب تو ایسی دعا کرے کوئی

یوں نہ ہوگا علاجِ دردِ جگر
پہلے دل کی دوا کرے کوئی

وہ مددگار ہو، تو اے حیرتؔ
لاکھ دشمن، ہوا کرے کوئی

شاد عارفی

صحرا کو گلستاں کہتا ہوں - بجلی کو تجلی کہتا ہوں
سنو معنے پیدا ہوتے ہیں - اتنی بے معنی کہتا ہوں

کہتا ہوں بلندی کو پستی - پستی کو بلندی کہتا ہوں
جب اُلٹی گنگا بہتی ہے - میں اُلٹی سیدھی کہتا ہوں

تم کیوں چونکے ؟ تم کو تو نہیں - اپنوں کو کہا ہے نا منصف
تم کیوں بگڑے ؟ تم کو تو نہیں - اپنوں کو فریبی کہتا ہوں

بننے کو تو اُن کی محفل میں سب بہرے گونگے بن بیٹھے
لیکن ماتھے دھندلاتے ہیں - جب سچی سچی کہتا ہوں

مالی کے اُترے چہرے پر کچھ رونق سی آجاتی ہے
جب پھولوں کے مرجھانے کو موسم کی خرابی کہتا ہوں

زرک پہنچانے کی تاک میں ہیں ہم دونوں - لیکن کہنے کو
وہ مجھ کو پڑوسی کہتے ہیں میں ان کو پڑوسی کہتا ہوں

رہبر رہزن بن سکتا ہے - رہزن رہبر ہو جاتا ہے
جی ہاں میں وہ بھی کہتا ہوں - جی ہاں میں یہ بھی کہتا ہوں

محفل کی افراتفری میں وہ اور اضافہ کرتے ہیں
جتنا بھی افراتفری کو میں " غیر آئینی " کہتا ہوں

اے شاد میں اکثر غزلوں میں - اے شاد میں اکثر نظموں میں
مجھ پر بھی صادق آتی ہے - ایسی " جگ بیتی " کہتا ہوں

خلیل الرحمن اعظمی

ہے عجیب چیز مے جنوں کبھی دل کی پیاس نہیں بجھی
مگر اب ملا کے تو دیکھ لوں ذرا ایک قطرۂ آگہی

یہی خامشی، یہی بے حسی، یہی میرا رازِ فسردگی
کبھی سو گیا ہوں تو جاگ اٹھی ہے یہ دل کی چوٹ دبی دبی

ہے یہ کیسی صحبتِ میکشاں کہ ہر ایک جام لہو لہو
یہی دوستی ہے تو اے خدا مجھے راس آئے نہ دوستی

ہے ملول مجھ سے دعائے مرگ کہ ساتھ اس کا نہ دے سکا
مرے راستے میں جو آگئی یہی زندگی، یہی زندگی

ذرا آ کے سامنے بیٹھ جا، مری چشمِ تر کے قریب آ
مرے آئینے میں بھی دیکھ لے کبھی اپنی زلف کی برہمی

یہی ساتھ ساتھ مرے رہا، میں اسی کا پا نہ سکا پتا
کبھی ہر قدم پہ مجھے ملا، یہی آدمی یہی آدمی

مرے ساتھ ساتھ چلے تھے سب، مرا ساتھ کوئی نہ دے سکا
مرے ہم سفر، مرے ہم نظر، مری خود سری، مری سرکشی

مری سمت اور بھی ساقیا، وہ جو بوند بوند میں زہر تھا
جسے اور کوئی نہ پی سکا وہ شراب میرے ہی منھ لگی

میں ہوں آشنائے غم و طرب یونہی اور گردشِ روز و شب
ابھی اور مجھ کو سنائے جا، یہی راگنی یہی راگنی

میں شہید ظلمتِ شب سہی، مری خاک کو یہی جستجو
کوئی روشنی، کوئی روشنی، کوئی روشنی، کوئی روشنی

زندگی

(نظم بھی نثر بھی)

خلیل الرحمٰن اعظمی

میں جب ایک بچہ تھا
ہر صبح اٹھ کر
کتابوں کا بستہ بغل میں دبائے ہوئے
اپنے اسکول جاتا تھا
اس وقت سے
مجھ کو ہر ایک استاد نے،
میرے ماں باپ نے،
اور ہر ایک چھوٹے بڑے نے
یہی بات مجھ کو بتائی
کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے
ہم سب کو اک روز مرنا ہے
اور موت کے واسطے عمر کوئی معیّن نہیں ہے

اُسی وقت سے
میرے دل میں یہی بات پختہ ہے

اور یوں بھی میرا عقیدہ یہی ہے
کہ یہ زندگی عارضی چیز ہے
اس کا کوئی بھروسا نہیں ہے

مگر اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے،
اس پہ ایمان رکھتے ہوئے
جانے یہ کیا بات ہے
میں نے ہر صبح، ہر شام اس طرح کاٹی
کہ جیسے کوئی آخری صبح یا آخری شام
برسوں نہیں بلکہ صدیوں کے بعد آئے گی

اور یہ سوچ کر
میں اسی طرح اسکول جاتا رہا،
کھیل کود اور کتابوں سے
اور دوستوں، ساتھیوں کی
محبت، عداوت سے
اور امتحانوں کی دلچسپ اور جان لیوا مصیبت سے
اپنی نبھاتا ہوا
ایک روز ایسا آیا کہ میں بھی جواں ہو گیا
میرے سر پہ فضیلت کی دستار باندھی گئی
اور میں اس فضیلت کی دستار کو
لے برسوں یہ آواز دیتا پھرا
"کوئی ہے مجھ کو جو میری قیمت بتا دے"

اور پھر
در بدر ٹھوکریں کھا کے

اک روز مجھ کو یہ مژدہ ملا
"لو مبارک تمھیں،
تم کو اپنی ریاضت کا پھل مل گیا،
تم کو اک نوکری مل گئی"

میں نے سوچا
کہ اب اور کیا چاہیے
نوکری کر لیں اور جلد ہی اپنا گھر بھی بسا لیں
زندگی کا مزہ تو یہی ہے
کہ بیوی ہو، بچے ہوں، کچھ دوست احباب ہوں
اور ہر ماہ کچھ بینک میں جمع ہوتا رہے
تاکہ آہستہ آہستہ اتنا پس انداز کر لیں
کہ وہ آڑے وقتوں میں کام آئے
بچّوں کی تعلیم میں صرف ہو
اور اگر ہو سکے
اپنی مرضی کا اک خوبصورت سا گھر ہو
جہاں ایک کمرے میں اپنی کتابیں قرینے سے رکھی ہوں
دیوار پر عشق پیچاں کی بیلیں ہوں
آنگن میں راتوں کی رانی مہکتی ہو
ہر صبح طاقوں پہ گلدان کے پھول تازہ رہیں

اور جب نوکری ختم ہو جائے
پنشن ملے
تو وہاں،
اپنی جو زندگی بچ گئی ہے
اسے امن اور شانتی سے گزاریں

خدا کی عبادت کریں،
بال بچوں کو بڑھتے ہوئے، پھولتے پھلتے
اور اپنی شادی رچاتے ہوئے دیکھیں، اُن کو دعا دیں

اور پھر اُن کے بچّوں کو
کلکاریاں مارتے
اپنی پیاری شرارت سے دل کو لبھاتے ہوئے
اپنے اسکول کی سمت جاتے ہوئے دیکھیں
اور پوچھیں:
"مُنے! تمھیں آج استاد نے کیا پڑھایا ہے؟"
مُنّا کہے:
"آج استاد یہ کہہ رہے تھے
کہ یہ زندگی عارضی چیز ہے
اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے
کوئی دنیا میں ایسا نہیں
جو کہے
کل میں زندہ رہوں گا کہ مر جاؤں گا"

یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

(بہ یادِ جہلم)

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین

یہ کیا خبر تھی کہ بن جائے گا دیارِ عزیز
وہ شہر جس میں نہ تھی دلکشی کی بات کوئی
نہ زندگی میں حرارت، نہ قلب میں گرمی
ثقافتوں کے عوامل سے سربسر محروم
مگر نعائمِ فطرت نے کی کمی پوری
وہ دلفریب طلوع و غروب کے منظر
نظر میں وادیٔ کشمیر کا افق زنگارہ
زمیں کی گود میں بہتا ہوا حسیں دریا
اسی کے ساحلِ دلکش پہ قصرِ شیریں تھا
جہاں پہ ہوتے تھے سجدے طلب جبینوں سے
نہ جذبِ حسن، نہ دل کی تڑپ، نہ بخت کا پھیر
جگائی اُن کی توجہ نے میری خواہشِ قرب
بلا طلب وہ ملے اذنِ باریابی کے
شروعِ ربط میں کچھ حکم درگذر بھی ہوئے

وہ شہر جس سے میں بیگانہ وار گذرا تھا
حدیثِ غم، نہ کوئی یادگارِ شورشِ عشق
نہ حوصلۂ دلِ انساں میں ڈوب جانے کا
لطافتوں کے کرشموں سے بیشتر عاری
پہاڑ دوش پہ شادابیٔ بساط لیے
عجیب شے سحر و شام کو بناتے ہوئے
سفید برف کے گالوں میں منہ چھپائے ہوئے
کہ جن کی دھار پہ بھی نزہتوں کے ڈیرے تھے
جہاں سے کوہ کنی کے پیام آتے تھے
جہاں نگاہ کے بدلے حیات بٹتی تھی
یہ اتفاق، کہ ہوا میں اسیرِ لطفِ جمال
ہوئی انھیں کے تقاضوں پہ دید کی تقریب
جنھیں نہ تنگیٔ فرصت سنبھال سکتی تھی
میں رفتہ رفتہ ہوا رمز آشنائے مزاج

گماں ہوا کہ رفاقت عزیز ہے میری
کبھی کبھی کہی طرزِ عمل نے اُن کے یہ بات
ہے گرم سینہ میں اک لَو قریب رہنے کی
جبیں پہ نور فشاں ماہِ دلبریٔ حبیب
دہن چھپائے ہوئے لذّتِ بیاں کا کیف
صباحتوں میں محبت کی چاندنی کا فروغ
یہ رنگ دیکھ کے دل ضبطِ شوق کر نہ سکا
بلاشعور ہوئی شوقِ دید میں ترمیم
کہ بے ثبات ہیں ہنگامہ ہائے رامش و رنگ
حیات وقفۂ بے کیف، انبساط فریب
جیسے شعاعِ تمنّائے دوست مَس کر دے
میں کیا بتاؤں کہ دُنیائے آرزو کیا تھی
یہ جانتا ہوں کہ بے نام سی خلش پاکر
فراق ہو تو طبیعت اُچاٹ رہتی ہے
بھلا سکے گا نہ دل احترامِ خاطر کو
وہ اُن کی کوششِ پیہم کہ ہم جُدا نہ رہیں
وہ گفتگو سے ٹپکتی ہوئی دل آسائی
کہ اختلاف کے پہلو کلام سے نہ اُٹھیں
وہ انجمن کا سلیقہ، وہ خلوتوں کا وقار

مگر میں شدّتِ جذبات تک پہنچ نہ سکا
اُنھیں پسند ہیں کچھ رخ مری طبیعت کے
لبوں تک آتی ہوئی آبِ التجا کی نمی
نگہ کی اوٹ میں فانوسِ آرزو روشن
لگن خلوصِ سماعت کو ہمکلامی کی
لطافتوں سے چھلکتی ہوئی وفا کی اُمنگ
گُریز پر بھی طبیعت قریب تر ہی گئی
دل اس طرح کے بہانے تراش کرنے لگا
بغیرِ روح ہے فطرت کے کاکلوں کی شکن
مگر وہ زیست کلی پھول نکہتوں کا چمن
جسے قبول کرے ماہِ انجمن کی کرن
گمان کر نہ سکا جس کا احتساب ابھی
ہزار بار چلا ہوں برائے منزلِ دید
قریب رہنے میں لطفِ عجیب ملتا تھا
نہ امتدادِ زمانہ سے مٹ سکیں گے نقوش
کہ خوئے حیات میں بھی نشّۂ نشاط ہے کم
وہ گرم بحث میں بھی ہار مان جانے کی خو
یہ بات خاطرِ مہماں پہ بار گذرے گی
ہر ایک بات میں نُدرت، ہر ایک لفظ میں فن

زباں پہ آئی تمنا تو یہ ہوا محسوس
کہ جس طرح سے توارد میں شعر کا مفہوم

بہ اتفاق اگر چھو گیا کبھی آنچل
تو لامسہ نے کیا ہے وہ کیف بھی محسوس

کہ جیسے زیست کا بھاری جمود ٹوٹ گیا
چلی نسیمِ طرب روح کو اڑائے ہوئے

وہ اہتمام بھی دیکھے ہیں میں نے جن کے لیے
خلوصِ دل سے رہے ہیں وہ سر بسر مصروف

چلی ہیں ایسی لطافت سے انگلیاں اُن کی
کہ دل پہ آج بھی نقشِ عمل اُبھرتا ہے

کسی کی پھول سی نازک کلائیوں کی قسم
وہ گردشیں ہیں ابھی تک نگاہ میں پیوست

چھلکتی رہتی ہیں کلیاں تبسمِ لب کی
فضائے دل میں مہکتے ہیں گفتگو کے چمن

خیال اب بھی ہے قامت کے معجزوں کا حریف
تراشتا ہوں تخیل سے نادراتِ ادا

یہ اعتراف حقیقت ہے میرے ماہِ جمال
پڑا ہے جب سے مری زندگی پہ عکس ترا

ملی ہیں دل کو توانائیاں محبت سے
جو ہمقدم ہیں مری زیست کے مراحل میں

میں کاٹ دیتا ہوں طوفانِ غم تبسم سے
تری چھلکتی ہوئی مسکراہٹوں کی قسم

نہ حادثاتِ زمانہ سے میں نے منہ موڑا
تری دلیر نگاہوں کی ہمتوں کی قسم

بچھڑ کے وقت کی آندھی میں آگیا ہوں کہاں
جہاں کشاکشِ گرداب پاؤں جکڑے ہے

مگر فسردہ نہیں عزمِ کارساز ابھی
پگھل ہی جائیں گی بُعدِ مکاں کی زنجیریں

نظر فروز ستارے اُفق پہ روشن ہیں
جو کھینچتے ہیں گریبانِ شوق ساحل پر

ترے جمال کی تابانیاں نگاہ میں ہیں
تو بیت جائیں گے تاریک و تلخ لمحے بھی

ترا ہی عشق ہے خاتم مری محبت کا
ترے ہی نور سے روشن رہے گا مقطعِ زیست

فتادگی پہ ترس کھا نگاہِ مہرِ جلال
حقیر قطرۂ شبنم کی دستگیری کر

○

مصطفیٰ زیدی

بزم میں باعثِ تاخیر ہوا کرتے تھے
ہم کبھی تیرے عناں گیر ہوا کرتے تھے

ہائے اب بھول گیا رنگِ حنا بھی تیرا
خط کبھی خون سے تحریر ہوا کرتے تھے

کوئی تو بھید ہے اِس طور کی خاموشی میں
ورنہ ہم حاصلِ تقریر ہُوا کرتے تھے

ہجر کا لطف بھی باقی نہیں اے موسمِ عقل
اِن دنوں نالۂ شبگیر ہوا کرتے تھے

اِن دنوں دشت نوردی میں مزا آتا تھا
پاؤں میں حلقۂ زنجیر ہوا کرتے تھے

خواب میں تجھ سے ملاقات رہا کرتی تھی
خواب شرمندۂ تعبیر ہوا کرتے تھے

تیرے الطاف و عنایت کی نہ تھی حد ورنہ ہم تو تقصیر ہی تقصیر ہوا کرتے تھے

○

مصطفیٰ زیدی

جب ہَوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی
مدتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

میرے مکتوب کی تقدیر کہ اشکوں سے دُھلا
میری آواز کی قسمت کہ تجھے چُھو آئی

اپنے سینے پہ لیے پھرتی ہیں ہر شخص کا بوجھ
اب تو اِن راہ گزاروں میں مری خُو آئی

یوں اُمڈ آئی کوئی یاد مری آنکھوں میں
چاندنی جیسے نہانے کو لبِ جُو آئی

ہاں نمازوں کا اثر دیکھ لیا پچھلی رات
میں اِدھر گھر سے گیا تھا کہ اُدھر تو آئی

مژدہ اے دل کسی پہلو تو قرار آ ہی گیا
منزلِ دار کٹی ساعتِ گیسو آئی

تنہائی

صدیق کلیم

پیار کی راہوں پر چل کر میں نے
ہنس بول کے اکثر وقت کٹی کی کوشش کی ہے
اس دل کے درد کو تم پہچان سکو گی
اپنی یہ بھی خواہش تھی
اس دل میں جھانک سکے گا کوئی ؟
کس کو اتنی فرصت ہے !
کس کو اتنی خواہش ہے !
کس کو اتنی پروا ہے !

سڑکوں پر یا سینما میں
مے خانے میں یا ٹیوب کے ڈبے میں
لاکھوں انسانوں کے طوفاں میں گم ہو کر
میں نے کیا پایا
یا تم نے کیا پایا
رات کو دیر سے واپس جاتے
ٹیکسی کا دروازہ کھول کے تم نے مڑ کر دیکھ لیا ہوتا
تسکینِ دلِ ناداں ہو جاتی

دن بھر اُونچی اُونچی تصنیفوں میں
رات کو ہلکے پھلکے ناولوں میں
کبھی کبھی یاروں کی محفل میں
یا تنہا پیارے ساقی سے ....
اب آپ ہی کہیے اس کا ہم کیا کرتے؟
یہ دل کے اندر۔ ایک کسک۔ ایک چبھن
جو ہر دم قائم رہتی ہے
اس کے مٹنے کی بھی ایک کہی
ہر لمحہ۔ ایک بھنور کی صورت دل کو چیرتی جاتی ہے

پیار کے بدلے زہر ملا ہے
اور پھول کے بدلے کانٹے
جگ کی اوچھی ریت کو تج کر
میں نے کیا کیا بول سنے ہیں
ہاتھ میں ہاتھ دے
کٹ جائے گا یہ لمبا رستہ
لیکن میں بے چین رہوں گا
تیری کشتی ٹوٹ نہ جائے
اب آپ اس کو
کتنی بھی ہلکی کہیے
اس تمیز تفاوت کا درماں کیا ہوگا؟

لندن ۱۹۵۹ء

بسمل سعیدی

نہ ملے نشاطِ بہشت کیوں مجھے اپنی عرضِ نیاز میں
مری عرضِ شوق جھلک رہی ہے ترے تبسمِ ناز میں

وہی اُٹھ رہی ہیں یہ دم بہ دم وہی بن گئی ہیں ترے قدم
جو ہوئی ہیں صرف قیامتیں تری طرزِ قامتِ ناز میں

دو جہاں کا لطف ہے عشق سے کہ بغیرِ عشق نصیب ہو
نہ سکونِ روح گناہ میں نہ حضورِ قلب نماز میں

ترے پائے شوق کی ہمتوں میں ہیں تیرے عشق کی منزلیں
ہیں مقامِ قرب کے بھی بہت اسی راہِ دور و دراز میں

مرے دل کو عشق نے بخش دی ہیں غرورِ شوق کی عظمتیں
ترے ناز کو نہیں دخل اب مری بارگاہِ نیاز میں

نہیں شوخیوں کو نصیب وہ جو یہ ڈھا رہی ہے قیامتیں
یہ حیا کی ایک جھلک جو ہے تری چشمِ فتنہ طراز میں

جو شریعت آج ہے معترض مرا منہ تکے گی وہ روزِ حشر
ترا حسن پیش جو ہو سکا مری معصیت کے جواز میں

ابھی میرے عشق کی چتونوں کو ہیں یاد اپنی وہ نخوتیں
وہ شکستگی سی ترے حسن کی وہ نیاز سا ترے ناز میں

جو نمود تیرے شباب کی ترے حسن سے ہے تو یہ سمجھ
کہ خود اپنے فاش بھی ہونے کی ہے صلاحیت اسی راز میں

جو ہیں تیرے امنِ ناز میں دو جہاں بھی تو مجھے اس سے کیا
مرے دستِ شوق کی جراتیں نہیں تیرے امنِ ناز میں

جو نمودِ صبحِ ازل ہوئی تو مزاجِ حسن میں حل ہوئی
وہ ادا جو رنگ ہے پھول میں وہ صدا جو نغمہ ہے ساز میں

مجھے اپنے در سے اُٹھا تو دے مگر اپنے دل میں یہ سوچ لے
ترا آستانۂ ناز بھی ہے مری جبینِ نیاز میں

وہ کیے ہیں سجدے ابھی ادا جو تمھارے حسن کے حق کے تھے
ابھی میرے عشق کے سجدے تو ہیں مری جبینِ نیاز میں

یہ مری نگاہیں جو تیرے در کو پلٹ کے ہیں دیکھتی
یہ وہ سجدے ہیں کہ جو رہ گئے تھے مری جبینِ نیاز میں

یہ نگاہِ مطربِ خوش نوا کا اثر ہے بسملِ بے نوا
کہ میں سن رہا ہوں وہ نغمے بھی جو ابھی ہیں پردۂ ساز میں

بسمل سعیدی

تم اپنے قول تم اپنے قرار یاد کرو
اور اُن پہ پھر وہ مرا اعتبار یاد کرو

جو مجھ پہ اب نہ رہیں اُن نوازشوں کی قسم
نوازشوں کے وہ لیل و نہار یاد کرو

تمام دن مری حسرت میں روزنِ در سے
نگاہِ شوق سوئے رہگزار یاد کرو

وہ شرم و شوق کے ہیجان میں شبِ مہتاب
تمام رات مرا انتظار یاد کرو

ذرا خلافِ توقع مرے پہنچنے پر
وہ طرزِ گفتگو بیگانہ وار یاد کرو

وہ ہر نظر میں مجھے اک پیام جرأتِ شوق
وہ ہر نظر کی ادا شرمسار یاد کرو

ہزار بار قبول ایک بار عرضِ کرم
ہزار بار نہیں ایک بار یاد کرو

کبھی وہ آپ ہی مجبور ہو کے رہ جانا
کبھی وہ مجھ پہ بھی اک اختیار یاد کرو

کبھی سکوتِ مسلسل کسی خیال میں غرق
کبھی وہ پھر نفس بار بار یاد کرو

کبھی وہ گریۂ بے اختیار، بھول گئے
کبھی وہ خندۂ بے اختیار یاد کرو

ذرا سکوت پہ میرے وہ سو تبسم سے
مری طرف نگہِ بے قرار یاد کرو

گلے سے پھولوں کے گجرے اُتار پھینکے تھے
مری نظر میں تم اپنی بہار یاد کرو

سنہری کرنوں سے جن میں بھرا تھا چاند نے رنگ
محبتوں کے وہ نقش و نگار یاد کرو

مری طرف سے بھی تسکین زہر تھی جس میں
وہ اضطرابِ دلِ بے قرار یاد کرو

جو میرے شانوں پہ گرتے تھے مست آنکھوں سے
شرابِ شوق کے وہ آبشار یاد کرو

وہ اک ادا سے کبھی روٹھ کر کبھی مَن کر
بہ ہر بہانہ وہ ذوقِ کنار یاد کرو

مری خوشی سے نہ پی کر بھی پھر مری خاطر
ادا سے بر لبِ پیمانہ پیار یاد کرو

دمِ وداع وہ ارمانِ بازدید و شوق
سرور سے بھی زیادہ خمار یاد کرو

مری جدائی گوارا ہوئی تمھیں کیونکر
تمھیں یہ ذکر بھی تھا ناگوار یاد کرو

تم اب کہاں ہو کہاں ہے قرارِ دل کا مرے
بنے تھے تم مرے دل کا قرار یاد کرو

خدا کرے کبھی بے اختیار یاد آؤں
خدا کرے کبھی بے اختیار یاد کرو

بھلا چکے سو بھلا ہی چکے وہ اب بسمل
ہزار یاد دلاؤ ہزار یاد کرو

آخری آدمی

شاداں امرتسری

مجھے اب اگر کوئی ملنے کو آئے
تو میں اُس سے کہتا ہوں
کیا لینے آئے ہو؟
اب تو مرے پاس کچھ بھی نہیں ہے
کہ میں نے کروڑوں برس کی مشقّت
کروڑوں برس کے مسلسل عمل سے
دلِ نوسارتے خود کو انساں بنایا
کہ میں نے کروڑوں برس کے اندھیروں
کے پردوں میں پوشیدہ مشعل کو پھر سے
فروزاں کیا اپنے گھر کو سجایا
مگر وہ کروڑوں برس کی مشقت
کروڑوں برس کا مسلسل عمل بھی
نہ میرے نہ تیرے کسی کام آیا

○

شفقت کاظمی

مشکل تھا بہت اپنے غم کا چارا　　　یاروں نے بھی کر لیا کنارا

بات اپنی وفا کی جھوٹ نکلی　　　آخر میں تری جفا سے ہارا

کیوں روئیں وہ تیری دشمنی کو　　　جن کو تیری دوستی نے مارا

گزرا ہیں ہزار مرحلوں سے　　　لے کر تیری یاد کا سہارا

کہنے کو تو دل کی بات کہہ دوں　　　شاید نہ کرے کوئی گوارا

کچھ اور بھی آسرے تھے لیکن　　　جب وقت پڑا تجھے پکارا

بے جا ہے تری اُمید شفقت
جب اُن کو نہیں سرِ مدارا

برہمن

فارغ بخاری

بوٹے سے قد پہ پھول سا جسم
پھول سے جسم میں غم کے خار
کیسے سہے گی جانِ بہار
جانِ بہار
دل ہے فگار
شبنم شبنم ہیں رخسار
کس سے کہے گی حالِ زار

قدم قدم گلچیں، صیاد
نفس نفس تمنّا فریاد
کون دے تیرے ضبط کی داد
ضبط کی داد
اے شہ زاد

درد سہے اور دکھ جھیلے
دل میں لگے غم کے میلے
ہر سو کلفت کے ٹیلے
آج ہے روح نہ تن آزاد
کون سنے یہ ہاہاکار

مسافر

جلیل حشمی

اُونچے، بانکے سرو، شنگرف سے لال چنار
چاند کے چور صنوبر، جھومے ہوئے چھتنار
رنگ رنگیلے، پھلتے پھولتے، سدا بہار

جلتی زمینوں کے چھالے اور میرے پاؤں
کب آئے گا پیاسے راہی تیرا گاؤں
کہیں تو تھم جا اے اُڑتے بادل کی چھاؤں

تُو تو انھیں پہچانتی ہے آوارہ ہوا
اُن پیڑوں سے پُوچھ کے اتنا بتاتی جا
مجھے بھی اپنی چھاؤں میں کوئی بلائے گا؟

○

بشیر بدر

سُلو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

یوں کسی کی آنکھوں میں صبح تک ابھی تھے ہم
جس طرح رہے شبنم پھول کے پیالوں میں

رات تیری یادوں نے دل کو اس طرح چھیڑا
جیسے کوئی چٹکی لے۔ نرم نرم گالوں میں

ناسمجھ ہیں یہ بھنورے۔ بے وفا ہیں پروانے
آج دل کی باتیں وہ۔ کہہ گئے مثالوں میں

میری آنکھ کے تارے۔ اب نہ دیکھ پاؤ گے
رات کے مسافر تھے کھو گئے اُجالوں میں

○

جمیل ملک

منزل پہ جا کے بھی نہ ہمیں روشنی ملی
جلتے رہے چراغ، مگر تیرگی ملی

تم میرِ کارواں تھے، کہو تم کو کیا ملا
ہم کو تو خیر، خاک بہ سر گمرہی ملی!

دامن ہے چاک چاک، گریباں ہے تار تار
مانگا تمھیں، تو ہم کو یہ دیوانگی ملی

تیری جفا کے بعد کہیں کے نہ ہم رہے
رُخ جس طرف کیا ہے، تری بے رُخی ملی

اپنے ہوئے، نہ اپنا کسی کو بنا سکے
یہ زندگی ملی بھی تو کس کام کی ملی

دل میں جنوں کی آگ، نہ آنکھوں میں خوں کا رنگ
اُن کو بھی کیا ملا ہے جنھیں خواجگی ملی

دیکھا ہمیں تو آنکھ بچا کر نکل گئی
کل سوئے اتفاق ہمیں زندگی ملی

آج اپنے آپ سے جو نگاہیں ملیں جمیل
آنکھوں سے جھانکتی ہوئی شرمندگی ملی

○

وقارؔ خلیل

آرزوئے نگہِ یار سے آگے نہ بڑھی
زندگی عشرتِ آزار سے آگے نہ بڑھی

دل نے طوفان اُٹھائے سرِ مقتل کیا کیا
پر کوئی بات ترے پیار سے آگے نہ بڑھی

ہر قدم لمحۂ احساس گریزاں کی طرح
زندگی سایۂ دیوار سے آگے نہ بڑھی

آرزو شہرِ طرب میں رہی اُفتاں خیزاں
ہوسِ طالعِ بیدار سے آگے نہ بڑھی

سوچتا یہ ہوں کہ اے شہرِ بہاراں اب تک
بات کیوں نامۂ دلدار سے آگے نہ بڑھی

موج اک خندۂ گل ہو کہ نسیمِ سحری
ہائے اُس نرمئ گفتار سے آگے نہ بڑھی

دل کے آئینے میں ہے عکسِ بہارِ رفتہ
داستاں یارِ طرحدار سے آگے نہ بڑھی

زخم خوردہ ہی رہی برگِ حنا کی تقدیر
مرہمِ پُرسشِ گل، خار سے آگے نہ بڑھی

اک نئی بات اُجالوں کی چلی تھی، وہ بھی
تیرگئ رسن و دار سے آگے نہ بڑھی

دل حدیثِ لب و گیسو کی تلاوت میں رہا
بندگی عارض و رخسار سے آگے نہ بڑھی

کس کو عرفان ہوا ہے غمِ ہستی کا وقارؔ
آگہی سنگِ رہِ یار سے آگے نہ بڑھی

آغا صادق

لب تشنگیٔ کہنہ مٹا کیوں نہیں دیتے
مجھ کو مرے حصے کی پلا کیوں نہیں دیتے

من حیثِ وریدآپ نے کیا خوب کہا ہے
نزدیک ہو اتنے تو صدا کیوں نہیں دیتے

تم زندۂ جاوید ہو یہ مرگ مبارک
مژدہ سرِ خاکِ شہدا کیوں نہیں دیتے

ایذا ہی اسیروں کی اگر مدِ نظر ہے
سو جائیں تو زنجیر ہلا کیوں نہیں دیتے

اک سمت اُجالا ہے تو اک سمت اندھیرا
ہر گوشے میں اک شمع جلا کیوں نہیں دیتے

کب تک مری تصویر کے خاکے ہی بنیں گے
آخر مری تصویر بنا کیوں نہیں دیتے

بگڑی ہوئی تقدیر پہ کیوں اشک فشاں ہو
بگڑی ہوئی تقدیر بنا کیوں نہیں دیتے

بے پردہ نظر آئیں گے پھر جلوے کسی کے
دنیا کو مقابل سے ہٹا کیوں نہیں دیتے!

صادق ابھی اوجھل ہے زمانے کی نظر سے
اس مردِ قلندر کا پتا کیوں نہیں دیتے

آتش لودھیانوی

کبھی مقامِ خرد ہے کبھی مقامِ جنوں
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے آرزوئے سکوں

کسے خبر ہے کہ کیا اضطراب کیا ہے سکوں
یہ دردِ دل کسی صورت نہ کم ہوا نہ فزوں

بُرا نہ مانے تو میں تجھ سے ایک بات کہوں
تری نظر سے بھی ٹوٹا نہ زندگی کا فسوں

تری نظر سے ملا مجھ کو میرے دل کا سراغ
ترے خیال سے لیکن ملا نہ دل کو سکوں

یہ کس مقام پہ لے آئی جستجو تیری
نہ اضطراب کی حالت نہ آرزوئے سکوں

نظر کہیں ہے تصور کہیں خیال کہیں
خدا جو دے مجھے توفیق سب کے ساتھ چلوں

ملی بحدِ طلب عمر بھر شرابِ آتشؔ
مرے نصیب کی مستی نہ کم ہوئی نہ فزوں

آمدِ دوست

اویس احمد دوراں

موسمِ بہاراں کا حسن بن کر آئی ہو، جام بن کر آئی ہو
میرے مرتعش لب پر عشق اور محبت کا نام بن کر آئی ہو
مجھ کو صید کرنے کو گیسوئے معنبر کا دام بن کر آئی ہو
میری زندگی میں تم ایک خوبصورت سی شام بن کر آئی ہو
جام بن کر آئی ہو

تم نہ آئی تھیں جب تک چاک چاک دامن تھا داغ داغ ہستی تھی
عرفیس کے بربط کی سحر خیز موسیقی اس فضا میں سستی تھی
پر تمھارے شاعر کے بے سکون کمرے میں خامشی برستی تھی
حد تو یہ کہ پونم کی رات بھی مجھے اکثر سانپ بن کے ڈستی تھی
زندگی ترستی تھی

اور میں سمجھتا تھا زندگی انسانی درد سے عبارت ہے
اس میں صرف آنسو ہیں، دل خراش نالے ہیں، رنج ہے مصیبت ہے
لیکن آج یہ جانا زندگی انسانی اصل میں وہ نعمت ہے
جس میں رنگ و رامش ہے شغل رقص و مستی ہے خواب عیش و راحت ہے
بے پناہ لذت ہے

آج سے مجھے اپنے جذبۂ محبت کا احترام کرنا ہے
بزم جام و مینا کا، دور بادہ نوشی کا اہتمام کرنا ہے
اپنی بیقراری کو اپنی تشنہ کامی کو نذرِ جام کرنا ہے
تم کو ساتھ لینا ہے، ظلمتوں سے لڑنا ہے، نیک کام کرنا ہے
انتظام کرنا ہے

مجھ سے تم کرو وعدہ میرا ساتھ دو گی تم رہگزارِ ہستی میں
پیکرِ وفا بن کر نیک مشورے دو گی کاروبارِ ہستی میں
وقت آنے پڑ ٹانکے دو گی میرے دامانِ تار تارِ ہستی میں
قلبِ عزم پرور کے حوصلے بڑھاؤ گی انتشارِ ہستی میں
اضطرارِ ہستی میں

مجھ سے تم کرو وعدہ میری سعیِ پیہم کو کامراں بنا دو گی
مجھ کو آرزوؤں کا اک نیا جہاں دو گی اک نئی فضا دو گی
مسکرا کے دیکھو گی ناز سے پکارو گی پیار سے صدا دو گی
میرے شعر و نغمہ کو اپنی ہی کشش دو گی اپنی ہی ادا دو گی
سرخیِ حنا دو گی

یہ تمہاری آمد ہی اک دلیلِ محکم ہے میری کامرانی کی
یہ تمہاری محبوبی ہر طرح ضمانت ہے میری شادمانی کی
سنگدل زمانہ کو اب سکھا سکوں گا میں طرز مہربانی کی
اور کیا کہوں تم سے روح بن گئی ہو تم میری گلفشانی کی
اک حسیں کہانی کی

مجھ سے کیوں جھجکتی ہو یہ وصال کی شب ہے آؤ میرے پاس آؤ
میں تمہارا ساجن ہوں میں تمہارا پیتم ہوں مجھ سے یوں نہ شرماؤ
بھینی بھینی خوشبو سے مجھ کو اک محبت سے اپنی زلف لہراؤ
اپنی پیاری باتوں سے آج مجھ کو تسکیں دو میرے دل کو بہلاؤ
مجھ میں جذب ہو جاؤ

آؤ تم کو اور مجھ کو صبحِ شادمانی کا آفتاب بننا ہے
زندگی کے متوالے جس کو پی کے جھوم اٹھیں وہ شراب بننا ہے
حسنِ لالہ و گل کی دلکشی بڑھانی ہے رنگ و آب بننا ہے
سازِ رنگ و نکہت پر نغمہ سنج ہونا ہے اور گلاب بننا ہے
اک رباب بننا ہے

گل گامش کی داستان

سیّد سبطِ حسن

گل گمیش کی داستان رزم والم کا شمار دنیا کے قدیم ترین نوشتوں میں ہوتا ہے۔ اس داستان میں سُومیری قوم کی ایک نیم تاریخی اور نیم افسانوی شخصیت ــــ گل گمیش ــــ کی فوقِ فطرت مہموں اور حیاتِ جاوداں کی ناکام جستجو کو نظم کے پیرایے میں بیان کیا گیا ہے۔ گل گمیش اٹھائیسویں صدی قبل مسیح میں جنوبی عراق کی ایک شہری ریاست (اُرُوق) کا فرماں روا تھا۔ وہ بڑا اہم جُو اور صاحبِ اقتدار بادشاہ تھا چنانچہ اس نے اپنی طاقت، تدبر اور فراست سے گرد و پیش کے کئی علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ گل گمیش کے کارنامے ممکن ہے کہ اس کے عہد ہی میں شعر کا موضوع بن گئے ہوں لیکن اس نوع کی جو متفرق نظمیں ہم تک پہنچی ہیں وہ گل گمیش کی وفات کے سات آٹھ سو سال بعد قلمبند ہوئی تھیں۔ یہ نظمیں سُومیری زبان میں ہیں۔ گل گمیش کی داستان کا مکمل نسخہ وہ ہے جسے ساتویں صدی قبل مسیح میں شہنشاہ اشور بنی پال کے حکم سے نینوا کے شاہی کتب خانے کے لیے مرتب کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ کچی مٹی کی بارہ لوحوں پر پیکانی خط میں مرقوم ہے اور اکادی زبان میں ہے۔

عہدِ قدیم کے دیگر فنی شاہکاروں کی مانند اس نظم کے مصنف کا نام بھی کسی کو معلوم نہیں ہے۔ غالباً یہ نظم کسی ایک شاعر کے ذہن کی تخلیق نہیں ہے اور نہ ایک وقت میں لکھی گئی ہے بلکہ اس کی تصنیف و تہذیب میں پوری قوم کی آرزومندی اور جمالیاتی حس شامل ہے۔ پچھلے زمانے میں قومی ہیروؤں کے کارناموں کو درباروں اور مندروں میں یا تہواروں، نجی تقریبوں اور جنگ کے موقع پر گا کر سنانے کا دستور عام تھا۔ تحریر کا رواج بہت کم تھا اس لیے شاعر اور سامع دونوں اپنی اپنی ضرورت، خواہش اور مذاق کے مطابق ان نظموں میں وقتاً فوقتاً ترمیم یا اضافے کرتے رہتے تھے۔ صدیوں بعد جب ان نظموں کو قلم بند کرنے کی نوبت آتی تو نقشِ اوّل کے نشان ذہنوں سے مٹ چکے ہوتے اور کوئی یہ بھی نہ بتا سکتا کہ ان کارناموں کو سب سے پہلے کس نے اور کب نظم کیا تھا یا اس نظم کی ابتدائی شکل کیا تھی۔ گل گمیش کی داستان بھی انہی مرحلوں سے گزری ہے۔

گل گمیش کی داستان سُومیر کے سورمائی عہد کی تخلیق ہے۔ یہ عہد تین ہزار اور دو ہزار قبل مسیح کے درمیان کا ہے۔ اس عہد کے تین ہیرو ہیں ــــ اِن مے کر، لوگل باندہ اور گل گمیش ــــ عجیب اتفاق ہے کہ سُومیر کے یہ تینوں سورما اُروق ہی کے رہنے والے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سُومیری تہذیب کی تشکیل اور سُومیر کی قومی شخصیت کی تعمیر میں اُروق کی شہری ریاست کی خدمات کتنی وقیع تھیں اس دور میں نفار، اُر، کیش اور اریدو بھی اہم سُومیری ریاستیں تھیں مگر ان کے کسی بادشاہ یا سورما کو قومی ہیرو کا مرتبہ نصیب نہیں ہوا اور نہ ان کے کارناموں کو کسی نے نظم کیا۔ اُروق کے ہیروؤں سے دس نظمیں منسوب ہیں۔ دو نظموں کا ہیرو اِن مے کر ہے۔ دو کا لوگل باندہ اور باقی

کاپیاں پریس جا چکی تھیں کہ سیّد سبطِ حسن نے بتایا، لفظ "گل گمیش" کو گل گامش کر دیا جائے کہ اصل تلفظ یہی ہے۔ پس عنوان بدلنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ (ادارہ)

چھ کا ہیرو گل گمیش ہے۔
عراق کے آثارِ قدیمہ میں شاہانِ سومیر کی ایک فہرست دستیاب ہوئی ہے۔ یہ فہرست عروق کے ایک فرماں روا اُتو ہیگل نے مرتب کروائی تھی۔ اس فہرست میں سومیر کی تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دَور سیلابِ عظیم سے پیشتر کا ہے اور دوسرا سیلابِ عظیم کے بعد کا۔ یہ وہی سیلاب ہے جو بعد میں سامی عقیدے میں ڈھل کر سیلابِ نوح کہلایا۔ فہرست کے مطابق دَورِ اوّل کی پہلی بادشاہت شہر اُریدو کی تھی اور پانچویں اور آخری بادشاہت شہر شروپک کی۔ شروپک کا آخری بادشاہ یوبارتوتو تھا جس نے ۱۸۶۰۰ برس تک حکومت کی۔ تب سیلابِ عظیم آیا اور وادیٔ دجلہ و فرات کی سب بستیاں غرقاب ہو گئیں۔ ان پانچوں بادشاہتوں کی مجموعی مدت ۲۴۱۰۰۰ برس ہے۔ سیلاب کے بعد آسمان سے پہلی بادشاہت کیش میں نازل کی گئی اور ۲۳ بادشاہوں نے ۲۴۵۱۰ برس تین ماہ اور ساڑھے تین دن حکومت کی۔ یعنی اس تفصیل نگار مورخ کے بقول کیش کے بادشاہوں نے فی کس تقریباً ایک ہزار برس حکومت کی! تب "کیش پر اسلحوں کی ضرب پڑی اور بادشاہت ایاتا (عروق کا مقدس معبد) منتقل کر دی گئی۔" عروق کا پہلا بادشاہ "میس کیاگ گاشر" تھا جو اُتو (سورج) کا بیٹا تھا۔ وہ مندر کا مہا پروہت بھی تھا۔ اس نے ۳۲۴ برس حکومت کی۔ تب اس کا بیٹا اِن مے کر بادشاہ ہوا۔ "وہ جس نے عروق کی تعمیر کی۔" اس نے ۴۲۰ برس حکومت کی۔ تب دیوتا لوگل باندہ بادشاہ ہوا۔ جو گڈریا تھا۔ اس نے بارہ سو سال حکومت کی۔ چوتھا بادشاہ دموزی ایک مچھیرا تھا۔ اس نے سو سال حکومت کی۔ پانچواں بادشاہ گل گمیش تھا جو کلاب (عروق کے مضافات) کے ایک پروہت کا بیٹا تھا۔ اس نے ۱۲۶ برس حکومت کی۔ گل گمیش کے بعد سات بادشاہ اور ہوئے مگر ان کی فرماں روائی کی مدت طبعی تھی۔ چنانچہ کسی نے تیس سال حکومت کی۔ کسی نے ۳۶ سال اور کسی نے فقط چھ سال۔ عروق کے بارہ بادشاہوں نے مجموعی طور پر ۲۳۱۰ سال حکومت کی۔

اِن میکر کی رزمیہ داستانیں

اِن میکر اہلِ سومیر کا پہلا ہیرو ہے۔ سومیری آثار میں دو نظمیں دستیاب ہوئی ہیں جن میں اِن میکر کے گُن گائے گئے ہیں۔ پہلی نظم میں ارانا اور عروق کے درمیان تصادم کا تذکرہ ہے۔ کہتے ہیں کہ عروق سے بہت دور ایران میں ارانا نامی ایک شہری ریاست تھی۔ ارانا بڑا خوش حال شہر تھا اور دھاتوں اور قیمتی پتھروں کے لیے بہت مشہور تھا۔ اس کے برعکس عروق میں نہ دھاتیں تھیں اور نہ قیمتی پتھر۔ ارانا کا راستہ بھی بہت دشوار گزار تھا کیونکہ راہ میں سات اونچے اونچے پہاڑ حائل تھے لہٰذا اِن میکر نے جو سورج کا بیٹا تھا (سورج بنسی تھا) اپنی بہن اِنانا (عشتار) سے التجا کی جو عروق کی محافظ دیوی تھی۔

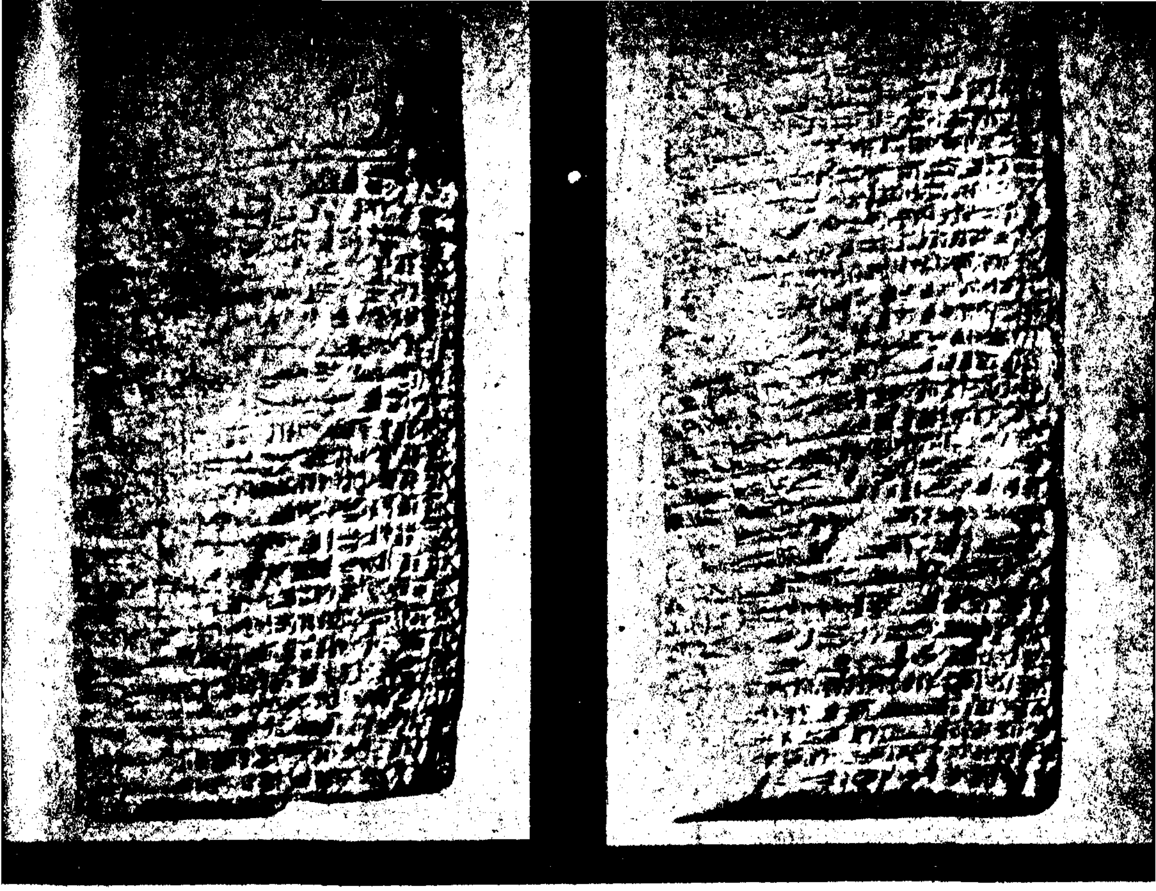
"بہن انانا!
ارانا کے لوگوں سے عروق کے لیے سونے چاندی کے زیور بنوا
وہ پہاڑ سے خالص لاجورد اور قیمتی پتھر لے کر آئیں
اور تیرا مسکن تعمیر کریں
ارانا کو عروق کا مطیع کر دے۔"

ملک گیری کی خواہش اور مال و زر کی ہوس کتنی قدیم ہے۔ اس ہوس پر پردہ ڈالنے کے لیے انسان نے کبھی مذہبی فریضہ کی نقاب اوڑھی ہے

[illegible]
haš-ama-dib-dib -bi-ne
á-ba zi-bi nu-un-tuku-e-še
e-kiši^{ki} -a gú nam-ba-an-gar-ri-en-si-en ^{giš}tukul nam-ba-sig-gi-dè-en
unu^{ki} -giš-kin-ti-dingir-ri-e-ne-ke
é-an-na é-an-ta-e -dè
dingir-gal-gal-ene nar-dím-bi ba-an-ag-eš-àm
bàd-gal-IM-dugud-ki-ús-sa-a-ba
ki-tuš-mah-an-ni-gar-ra-a-ba
sag mu-e-sì za-e -lugal-ur-sag-me-en
sag-lum-lum nun-an-ni-ki-ág
du-a-ni-ta a-gim ní ba-an-te
erín-bi al-tur a-ga-bi-ta al-bir-ri
lú-bi-ne igi nu-mu -da-šub(!)-gú-uš
u -bi-a ^{d}gilgameš-en-kul-aba^{ki} -ke
in[im]-guruš-uru-na-šè šà-ga-ni an-hùl har-ra-ni ba-an-zalag
arad-da-ni-en-ki-du -ra gù mu-na-dé-e
NE-šè ^{giš}šu-kará á-mé sa hé-im-mi-gi
^{giš}tukul-mé á-zu-šè hé-im-mi-gi
ní-gal-me-lám-ma-hé-im-dím-dím-e
e-ne du-a-ni-ta ní-gal-mu hé-ib-šú
dím-ma -ni hé-suh galga-a-ni hé-bir-ri
u -nu-ià-àm u -nu-u-àm
ag-ga-dumu-en-me-bara-gi -e-si unu^{ki} zag-ga ba-an-díb-bi-eš
unu^{ki} -ga dím-ma-bi ba-suh
^{d}gilgameš-en-kul-aba^{ki} -ke
ur-sag-bi -ne-ir gù mu-na-dé-e
ur-sag-mu-ne igi mu-un MÙŠ-MÙŠ-ù-ne
šà-tuku hé-en-zi-zi-i ag-ga-šè ga-àm-ši-DU
bir -hur-tur-ra lú-sag-lugal-a-ni
lugal-a-ni-ir zà-sal mu -na-ab-lu
mà-e ag-ga-šè ga-àm -ši-DU
dím-ma-ni hé-suh galga-a -ni hé-bir-ri
bir-hur-tur-ri ká-gal-la ba-ra-è

داستان گل گامش کا ایک ٹکڑا جس کی زبان سومیری ہے
لیکن رومن الخط میں لکھا گیا ہے۔





گل گامش کی داستان - کچی مٹی کی تختیوں پر



عروق کا سورما گل گامش دائیں جانب کی تصویر میں ان کدو سے لڑ رہا ہے اور بائیں جانب کی تصویر میں
ثور فلک سے ، یہ نقل ہے ایک پرانی کلدانی تصویر کی جو پتھر پر کندہ ہے - پتھر کا یہ ٹکڑا ۱ ۷/۱۰ انچ چوڑا
ہے اور ہیگ (ہالینڈ) میوزیم میں محفوظ ہے -

کبھی احکامِ خداوندی کی آڑ لی ہے، کبھی دیوی دیوتاؤں کی اہانت کا عذر تراشا ہے، کبھی عورتوں کی بے آبروئی کو انتقام کا بہانہ بنایا ہے اور کبھی وحشی قوموں کو تہذیب سکھانے کا مقدس عزم ظاہر کیا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو ان پردوں کے پیچھے معاشی مفاد کا چہرہ صاف نظر آجائے گا ـــــ!

محبت اور جنگ کی دیوی عشتار نے اپنے بھائی اِن میکر کی التجا سن لی اور اسے مشورہ دیا کہ اپنا کوئی ہوشیار ایلچی ارانا روانہ کرے تو اس کی آرزو پوری ہوگی۔ "ارانا کے لوگ تیرے سامنے اپنے گھٹنوں کو پہاڑی بھیڑوں کی مانند جھکا دیں گے۔" چنانچہ اِن میکر نے اپنے ایلچی کے ذریعہ ارانا کو یہ پیغام بھیجا کہ میری اطاعت قبول کر لو ورنہ میں شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔

"میں شہر کے لوگوں کو اس طرح بھاگنے پر مجبور کروں گا
جیسے پرندے درختوں سے بھاگتے ہیں
وہ اپنے گھونسلوں میں چھپ جائیں گے
مگر میں ارانا کو ویران کھنڈر بنا دوں گا
وہ مٹی کا ڈھیر ہو جائے گا
میں شہر کو اس طرح برباد کروں گا
جیسے شہر برباد کیے جاتے ہیں۔"

لہٰذا مناسب یہی ہے کہ:

"ارانا کے لوگ میری اطاعت کریں
اور میرے لیے اِنانا کا محل (عروق میں) تعمیر کریں
اور اسے یوں سنواریں جیسے درخت موسمِ بہار میں سنورتے ہیں
اور یوں روشن کریں جیسے اُتو (سورج) طلوعِ سحر کے وقت"

اِن میکر کا ایلچی سات دریاؤں اور سات پہاڑوں کو عبور کر کے ارانا کے شاہی دربار میں پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ:

"میرے بادشاہ نے
میرے بزرگ باپ نے جس کا سر پیدائش ہی سے تاج کے لیے موزوں ہے
جو عروق کا فرماں روا ہے
جو سومیر کا مایۂ عظیم ہے
جو شاہی طاقت رکھنے والا مینڈھا ہے
جو ایوانِ شاہی کی بلندیوں پر وفادار گائے کے پیٹ سے پیدا ہوا
اِن میکر، اُتو کے بیٹے نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔"

وہ ارانا کے بادشاہ کو اِن میکر کا پیغام دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "اس کے بارے میں تیری جو مرضی ہو مجھے بتا تاکہ میں اسے اپنے

آقا تک پہنچا دوں "۔

ارا تا کا تاجدار جواب دیتا ہے:

"اپنے بادشاہ، گلاب کے آقا سے جاکر کہہ دے کہ

مقدس اِنانا (عشتار) جو زمین و آسمان کی ملکہ ہے

جس کا قانون ہر جگہ چلتا ہے

وہی مجھے ارا تا لائی تھی۔ مقدس قانون کی سرزمین پر

پھر میں عروق کی اطاعت کیوں کروں؟

اِرا تا کبھی عروق کے تابع نہ ہوگا"

اور اگر قوت آزمائی منظور ہے تو اپنے کسی منتخب سورما کا مقابلہ میرے کسی سورما سے ہونے دو۔ جو فریق ہار جائے اس کا ملک اطاعت قبول کرلے مگر شرط یہ ہے کہ تمہارا سورما نہ کالا ہو نہ گورا، نہ گندمی رنگ کا ہو نہ پیلے رنگ کا۔

یہ نظم ایک ٹوٹی ہوئی لوح پر کندہ ملی ہے۔ اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان میکر نے ارا تا کی دعوتِ مبارزت قبول کی یا نہیں۔ آخر میں فقط یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارا تا نے آن میکر کا بنیادی مطالبہ مان لیا اور سونا چاندی لاجوراد دوسرے قیمتی پتھر بطور خراج ادا کرنے لگا۔

غالباً سومیری اور ایرانی ریاستوں کے درمیان طاقت آزمائی کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا۔ چنانچہ دوسری رزمیہ نظم میں پھر ان میکر کی ٹکر ارا تا سے ہوتی ہے۔ اب کے ارا تا کے بادشاہ کا نام اِن سوگش سِرانا تھا اور اس کے وزیر کا نام اِن ہی گا ریا پہلی نظم میں اِن میکر اپنا ایلچی اِرا تا بھیجتا ہے مگر اب کے اِرا تا کی باری ہے۔ چنانچہ ان سوگش سِرانا اپنے ندو مانامی ایک ایلچی کو عروق بھیجتا ہے اور ان میکر سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اِنانا کی مورت کو اِرانا کے حوالے کر دے یعنی ارا تا کی اطاعت منظور کرلے مگر ان میکر اِنانا کی مورت کو اِرا تا بھیجنے پر آمادہ نہیں ہے اور اس مسئلہ کو ارا تا کی مجلس شوریٰ کے رُوبرو پیش کرتا ہے۔ مجلس شوریٰ اِن مے کرکو اِن سوگش سِرانا کی اطاعت قبول کرنے کا مشورہ دیتی ہے مگر بادشاہ اس تجویز کو ٹھکرا دیتا ہے (گل گمیش نے بھی اسی طرح مجلس شوریٰ کے مشورے کو مسترد کر دیا تھا) تب اِرا تا کا مشاش (مہا پروہت) عروق کو اکیلے فتح کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ وہ عروق کی دیوی ندابا کے مویشی خانے میں بھیس بدل کر جاتا ہے اور وہاں کی گائے بھیڑوں کو بھڑکاتا ہے۔

مشاش گائے سے پوچھتا ہے:

"گائے تیری ملائی کون کھاتا ہے؟

تیرا دودھ کون پیتا ہے؟

میری ملائی ندابا کھاتی ہے

میرا دودھ ندابا پیتی ہے"

مشاش گائے سے کہتا ہے کہ تیرے اپنے بچے ملائی دودھ سے کیوں محروم رہیں۔ تو شاہی محل اور لنگر خانے کو دودھ بھیجے

سے انکار کیوں نہیں کر دیتی۔ یہ دلیل گاتے سکے دل کو لگ جاتی ہے اور اس کا دودھ خشک ہو جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ارانا کے کسی ہوشیار سیاست دان نے عروق کی زرعی یا بدوی آبادی میں بغاوت پھیلا دی تھی۔ بدوی مویشی پالتے تھے اور شہر کو خوراک کا سامان فراہم کرتے تھے۔ ان کی بغاوت کے نتائج ریاست کی آزادی اور بقا کے لیے نہایت خطرناک ہو سکتے تھے۔ بدویوں اور حضریوں (شہریوں اور دیہاتیوں) کی کشمکش بہت قدیم ہے۔ ممکن ہے کہ عروق کی دیہاتی آبادی شہریوں سے اس بات پر ناراض رہی ہو کہ وہ دیہاتیوں کی ساری پیداوار ہمیٹ کر لے جاتے ہیں اور ارانا نے ان کی اس بے چینی سے فائدہ اٹھا کر ان کو بغاوت پر آمادہ کر لیا ہو۔ بہر حال اس واقعہ سے یہ تو معلوم ہی ہو جاتا ہے کہ حملہ آور طاقتیں اس وقت بھی اپنے دشمن کی داخلی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتی تھیں۔

مویشیوں کے دودھ خشک ہونے کی خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ خوف و دہشت سے کانپنے لگے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید دیوتا ان سے ناراض ہو گئے ہیں اور انھوں نے شہریوں پر یہ قہر نازل کیا ہے مگر ان میکر بڑا ذہین فہم تھا۔ اس نے گڈریے تفتیش حال کے لیے بھیجے تاکہ دودھ خشک ہونے کے اسباب معلوم کریں۔ گڈریوں نے مشماش کو گرفتار کر لیا اور اسے مشک باندھ کر دریائے فرات میں پھینک دیا مگر مشماش نہیں ڈوبا کیونکہ وہ منتر جانتا تھا۔ گڈریوں نے اسے پانچ بار پکڑا اور دریا میں پھینکا۔ آخر مشماش نے عاجز ہو کر ہار مان لی کیونکہ "اُتو گڈریوں کے ساتھ تھا" اور وہ اپنے شہر کو لوٹ گیا اور ارانا کے بادشاہ نے ان میکر کی اطاعت قبول کر لی۔

لوگل باندہ کی رزمیہ داستانیں

"فہرست شاہان" کے مطابق لوگل باندہ ان میکر کا جانشین تھا۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ان میکر کی فوج کا سپہ سالار رہا ہو لیکن فہرست شاہان کے اس بیان سے کہ لوگل باندہ گڈریا تھا اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ وہ دیہاتی تھا یا دیہات کا کوئی صاحب اثر سردار قبیلہ یا زمیندار۔ اس سے جو رزمیہ نظمیں منسوب ہیں ان کا تعلق اس کی بادشاہی کے زمانے سے نہیں ہے بلکہ یہ کارنامے اس نے اپنے آقا ان میکر کے عہد میں سر انجام دیے تھے۔

پہلی نظم میں لوگل باندہ زابو کے دور افتادہ ملک میں پڑا ہوا ہے۔ وہ عروق واپس جانے کے لیے بے چین ہے مگر راستہ بہت کٹھن اور سفر اتنا خطرناک ہے کہ یہ منزل اِم دُوگُود پرندے کی امداد کے بغیر ہرگز طے نہیں ہو سکتی۔ اِم دُوگُود لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے اور کوئی شخص اس کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن لوگل باندہ اس پرند کی خوشنودی کیونکر حاصل کرے۔ اِم دُوگُود چراگاہ پر گئی ہوئی ہے۔ اس کے بچے گھونسلے میں بیٹھے ماں کا انتظار کر رہے ہیں۔ لوگل باندہ ان کے پاس جاتا ہے۔ انھیں چارہ، شہد اور روٹی کھلاتا ہے، ان کے چہروں کو رنگتا ہے اور ان کے سروں پر شُوگُورا کا تاج رکھتا ہے۔ اِم دُوگُود لوگل باندہ کے اس حُسنِ سلوک سے بہت خوش ہوتی ہے۔ وہ لوگل باندہ سے پوچھتی ہے کہ بتا تو کیا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں عروق واپس جانا چاہتا ہوں چنانچہ اِم دُوگُود اسے صحیح سلامت عروق پہنچا دیتی ہے۔ وہاں اس کا آقا ان میکر خطرے میں ہے کیونکہ سامی نسل کے مارتو قبیلے نے عروق کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ ان میکر کو اپنی بہن اِنانا کے پاس کمک کا پیغام بھجوانا ہے مگر کوئی شخص ارانا (جہاں اِنانا مقیم ہے) کے سفر پر آمادہ نہیں ہوتا۔ لوگل باندہ اس کام کا بیڑا اٹھاتا ہے اور ارانا پہنچ کر ان میکر کا پیغام اِنانا کو دیتا ہے۔ اِنانا جواب دیتی ہے کہ ان میکر فلاں دریا کا سفر کرے، فلاں مچھلی پکڑے، فلاں فلاں جہاز بنوائے اور دھات

اور پتھر کے کاریگروں کو شہر میں آباد کرے تو اس کی مشکل آسان ہو جائے گی۔

اس کہانی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میکر یا کسی اور عروقی بادشاہ نے کسی زمانے میں ارا تا کی اطاعت قبول کر لی تھی کیونکہ انانا جو اقتدارِ اعلیٰ کی علامت تھی اب اس کی سورتی ارا تا میں تھی۔ شاید اس زمانے میں شمال یا جنوب کے سامی قبیلے عروق پر حملے کیا کرتے تھے اور عروق حملہ آوروں کو شکست دینے کی طاقت نہ رکھتا تھا اس لیے اس نے ارا تا کی مدد مانگی تھی مگر ارا تا نے امداد دینے کے بجائے عروق کو اپنی داخلی طاقت بڑھانے کا مشورہ دیا تھا۔ شہر میں صنعت و حرفت کو فروغ دو۔ جہاز بنواؤ۔ دریائی راستوں کی حفاظت کرو تو تمہاری ریاست بیرونی حملوں سے محفوظ ہو جائے گی۔

دوسری نظم میں لوگل باندہ اپنے آقا ان میکر کے ہمراہ کسی مہم پر جا رہا ہے۔ کوہِ حروم پر پہنچ کر وہ بیمار پڑ جاتا ہے اور اس کے ساتھی اسے مردہ سمجھ کر وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ لوگل باندہ ڈھائی دن تک بے دم پڑا رہتا ہے۔ جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی پر اکیلا پاتا ہے۔ لوگل باندہ خداوند شمس سے التجا کرتا ہے کہ وہ اسے کوہِ حروم پر مرنے سے بچائے۔

"اس جگہ جہاں ماں پاس ہی نہ ہو

جہاں باپ پاس ہی نہ ہو

جہاں کوئی عزیز پاس ہی نہ ہو

جہاں ماں "اے میرے بیٹے" کہہ کر بین نہ کر سکے

جہاں بھائی "اے میرے بھائی" کہہ کر آہ و زاری نہ کر سکے

مجھے وہاں مرنے نہ دے"

شمس اس کی التجا قبول کر لیتا ہے اور لوگل باندہ اچھا ہو جاتا ہے۔

گل گمیش کی داستان

مگر ان میکر اور لوگل باندہ کی یہ رزمیہ داستانیں گل گمیش کی داستان کے مقابلے میں بہت مختصر اور کم رتبے کی ہیں۔ گل گمیش ایک عظیم شخصیت ہے۔ اس کی مہم جوئیوں اور رزمیہ کارناموں کے مقابلے میں اس کے پیش رو ہیروؤں کے کارنامے بچوں کا کھیل نظر آتے ہیں۔ گل گمیش کی داستان ایک طویل، باربط اور مسلسل داستان ہے۔ اس کا افق بہت وسیع ہے۔ اس میں فلسفیانہ گہرائی پائی جاتی ہے۔ اس داستان میں حیات و ممات کے ابدی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ انسان کی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور معاشرے کے قدیم اور جدید اقدار کا تصادم دکھایا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس داستان کا ہیرو ماحول کو بدلنے اور قدرت کو تسخیر کرنے کے شوق میں دیوی دیوتاؤں سے بھی ٹکر لینے سے نہیں جھجکتا۔

گل گمیش کی داستان ایک مختصر سی تمہید سے شروع ہوتی ہے جس میں اس کی عظمت کے گُن گائے گئے ہیں:

ستائش بے حساب گل گمیش، آقائے کلاب کی، جو جہاں میں تھا

یہ وہ فرماں روا تھا جو روئے زمین کے سبھی ملکوں کی خبر رکھتا تھا

وہ عاقل تھا، واقفِ اسرار اور دانائے راز تھا
وہ ہمارے لیے سیلاب سے پیشتر کی ایک داستان لایا
وہ ایک لمبے سفر پر گیا،
اور جب خستہ و درماندہ واپس ہوا تو پورا قصہ پتھر پر کندہ کروایا
گل گمیش کی تخلیق دیوتاؤں نے کی
انھوں نے اسے جسدِ کامل بخشا
شمس نے حُسن سے نوازا
اور طوفان کے دیوتا اَداد نے جرأت عطا کی
عظیم دیوتاؤں نے اس کے جمال کی تکمیل کی
اور وہ سب پر سبقت لے گیا
انھوں نے اسے دو تہائی دیوتا بنایا اور ایک تہائی انسان
اس نے عروق کی فصیلیں بنوائیں
شہر کو پشتوں سے محفوظ کیا
اور آکاش کے دیوتا اَنو اور محبت کی دیوی عشتار کے لیے
اِی آنا کا مقدس معبد تعمیر کروایا

گل گمیش بڑا جابر اور عیش پسند بادشاہ ہے۔ وہ شہریوں کے مقدس رسوم کی بے حُرمتی کرتا ہے۔ نوجوانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کرتا ہے اور جس لڑکی کو چاہتا ہے اپنے حرم میں داخل کر لیتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے کسی کی عزت و آبرو محفوظ ہے اور نہ جان و مال لوگ تنگ آ کر دیوتاؤں سے فریاد کرتے ہیں۔ دیوتا سخت پریشان ہیں کیونکہ گل گمیش کو انھی نے پیدا کیا تھا۔ "دو تہائی دیوتا اور ایک تہائی انسان"۔ آخر دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ میں فیصلہ ہوتا ہے کہ گل گمیش کا ثانی اور حریف پیدا کیا جائے تاکہ لوگوں کو چین نصیب ہو۔ چنانچہ اِن کِدو پیدا ہوتا ہے۔ وہ صحرا میں جنگلی جانوروں کے ساتھ رہتا ہے اور خود بھی بالکل جنگلی انسان ہے۔ اتفاقاً ایک دن وہاں ایک بھلیے کا گزر ہوتا ہے۔ اس نئی مخلوق کو دیکھ کر وہ ڈر جاتا ہے اور گھر جا کر سارا ماجرا اپنے باپ سے بیان کرتا ہے۔ باپ کہتا ہے کہ تو عروق کے شہر میں جا اور گل گمیش کو اس واقعہ کی خبر دے۔ وہ مندر کی ایک حسین و جمیل دیوداسی کو تیرے حوالے کرے گا۔ اسے لا کر چشمے کے پاس برہنہ بٹھا دینا۔ جنگلی آدمی اس پر فریفتہ ہو جائے گا اور جب اس کی خواہش پوری ہو جائے گی تو اس کا جنگلی پن جاتا رہے گا اور وہ بے ضرر انسان بن جائے گا۔ بھلیا باپ کے مشورے کے مطابق عروق جاتا ہے اور گل گمیش ایک دیوداسی کو اس کے ہمراہ کر دیتا ہے۔ اِن کِدو دیوداسی کے حُسن و شباب کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

دیوداسی نے اپنی چھاتیاں کھول دیں

اور اپنا پیڑو ننگا کر دیا
جنگلی آدمی کے شوق کو تیز کرتے وقت دیو داسی نے شرم محسوس نہ کی
بلکہ اپنے کپڑے ایک طرف اٹھا کر رکھ دیے
اور جنگلی آدمی کو عورت سے لذت یاب ہونے کا ہنر سکھاتی رہی
اور اِن کِدُو دیو داسی کی بھرپور جوانی پر قابض ہو گیا

اِن کِدُو جو اب تک جنگلی جانوروں کا دوست اور انسان کا دشمن تھا دیو داسی کی صحبت میں انسان کا دوست اور محافظ بن جاتا ہے اور دیو داسی سمیت بھیڑیے کے پڑاؤ میں رہنے لگتا ہے۔ ایک دن اُدھر سے ایک مسافر گزرتا ہے تو اِن کِدُو اس سے سفر کا سبب اور اس کی پریشانی کا باعث پوچھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عروق کے لوگ گِل گمیش کی سخت گیریوں اور عیش کوشیوں سے عاجز ہیں اسی لیے میں شہر سے بھاگ کر جا رہا ہوں۔

گِل گمیش ایوانِ شوریٰ میں زبردستی گھس آیا ہے
حالانکہ یہ عمارت شہر والوں کی ملکیت ہے
وہ ڈھول کی آواز پر وہاں جمع ہوئے تھے
تاکہ شبِ عروسی کی خاطر دلہن کا انتخاب کریں
مگر گِل گمیش ان کی تحقیر کر رہا ہے
اس نے شہر کو ناپاک کر دیا ہے
وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے
وہ چاہتا ہے کہ دلہن شبِ عروسی اس کے ساتھ گزارے
پہلے بادشاہ، بعد میں جائز شوہر
اور یہ سب دیوتاؤں کی مرضی سے ہو رہا ہے
گِل گمیش کو یہ حق اسی وقت مل گیا تھا
جس وقت اس کی نال کاٹی گئی تھی
لیکن اب دلہن کو چننے کے لیے ڈھول بجتا ہے
تو شہر کراہتا ہے

اِن کِدُو دیو داسی کے ہمراہ عروق روانہ ہوتا ہے تاکہ گِل گمیش کو اس کی بدعنوانیوں کی سزا دے۔ گِل گمیش کو جب خبر ہوتی ہے کہ ایک پہلوان اس سے لڑنے کے ارادے سے شہر میں آیا ہے تو وہ بھی مقابلے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اِن کِدُو کو پچھاڑ دیتا ہے۔ اِن کِدُو گِل گمیش کو اپنا آقا تسلیم کر لیتا ہے اور گِل گمیش اِن کِدُو کو اپنا رفیق اور دستِ راست بنا کر محل میں لے جاتا ہے۔ اِن کِدُو گِل گمیش

سے کہتا ہے :۔

دیوتاؤں کے باپ نے تجھے شاہی بخش دی ہے
تیری تقدیر میں یہی لکھا ہے
مگر حیاتِ ابدی تیری قسمت میں نہیں ہے
لیکن اس سبب سے افسردہ دل نہ ہو
نہ رنج کر، نہ پریشان ہو
اس نے تجھے بست وکشاد کی قوت عطا کی ہے
تو انسان کا نور اور اس کی ظلمت ہے
اس نے تجھے لوگوں پر بے مثال اقتدار بخشا ہے
اس نے تجھے ایسی جنگوں میں سرخ رُو کیا ہے
جن سے کوئی گریز یا بھی فرار نہیں کر سکتا تھا
اور ان یورشوں اور یلغاروں میں فتح یاب کیا ہے
جن سے پیچھے ہٹنا ممکن نہیں تھا
مگر اس قوت کو بے جا استعمال مت کر
اپنے محل کے ملازمین سے انصاف کر
اور شمس کے روبرو عدل سے پیش آ

مگر گل گمیش اپنی فتوحات سے مطمئن نہیں ہے کیونکہ ابھی تک اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی بدولت اس کا نام رہتی دنیا تک روشن رہے۔ پس وہ حمبابا کو ہلاک کرنے کا عزم کرتا ہے جو دیودار کے جنگل کا محافظ ہے۔ یہ جنگل ایلم (مغربی ایران) یا لبنان میں واقعہ ہے۔ اِن کِدُو اسے سمجھاتا ہے کہ حمبابا بڑی خطرناک بلا ہے۔ اس پر فتح پانا ممکن نہیں مگر گل گمیش نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے "زندگی تو ہوا کے جھونکے کی مانند رفتنی و گذشتنی ہے پھر موت سے کیا ڈرنا۔ جیت گئے تو دنیا میں ہماری بہادری کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ مارے گئے تو لوگ یاد کریں گے کہ حمبابا سے لڑتا ہوا مارا گیا"۔ گل گمیش شمس دیوتا سے امداد کی التجا کرتا ہے۔ شمس اس کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ چنانچہ دونوں سُورما مہم سر کرنے روانہ ہو جاتے ہیں۔ جنگل کا پھاٹک سحر زدہ تھا۔ اِن کِدُو جوش میں آکر پھاٹک کو ہاتھ سے گرا دیتا ہے تو اس کے بازو شل ہو جاتے ہیں۔ پھر دونوں حمبابا کی قیام گاہ تک پہنچتے ہیں۔ حمبابا گل گمیش سے کہتا ہے مجھے مار و مت بلکہ اپنا غلام بنا لو لیکن اِن کِدُو کہتا ہے کہ دشمن کی باتوں میں نہ آؤ۔ آخر حمبابا ہلاک ہوتا ہے اور گل گمیش شادمان و کامران عروق کو واپس آجاتا ہے۔

گل گمیش کی اس فتح یابی کی خبر عشتار کو ہوتی ہے جو محبت کی دیوی ہے۔ وہ گل گمیش کے حسن اور شجاعت پر عاشق ہو جاتی ہے اور گل گمیش سے کہتی ہے کہ تو میرے ساتھ شادی کر لے۔ گل گمیش اسے ہرجائی اور بیسوا کہہ کر اس کی توہین کرتا ہے اور اس کی درخواست

کو رد کر دیتا ہے۔

"اگر میں تجھ سے شادی کر دوں تو بدلے میں کیا تحفہ دوں؟
تیرے جسم کے لیے کون کون سے روغن اور کون کون سی پوشاکیں؟
تیری غذا کے لیے کیسی روٹی؟
اور اگر میں تجھے شادی میں قبول کر لوں
تو میرا انجام کیا ہوگا؟
تو وہ انگیٹھی ہے جو سردیوں میں ٹھنڈی رہتی ہے
وہ پائیں دروازہ ہے
جو ہوا کے جھونکوں اور آندھی کے طوفانوں کو
اندر آنے سے نہیں روکتا
ایک محل جو اپنی پاسبان فوج پر آفت ڈھاتا ہے
تارکول سے بھرا ہوا وہ مٹکا جسے اٹھاؤ تو
کپڑے اور جسم سب کالے ہو جاتے ہیں
ٹپکتی ہوئی ایک مشک جو مشک بردار کو بھگو دیتی ہے
پتھر جو دیوار پر سے لڑھک آتا ہے
جوتا جو پہننے والے کے پاؤں لہولہان کر دیتا ہے
تو نے اپنے کس عاشق سے وفا کی؟
تیرے کس گڈریے نے تجھے سدا آسودہ رکھا؟
سن، میں تجھے تیرے عاشقوں کا انجام سناتا ہوں۔"

اور وہ عشتار کو بتاتا ہے کہ اس نے اپنے باوفا عاشقوں سے کیسا سلوک کیا۔

عشتار عظیم دیوتا انو سے گل گمیش کی گستاخی کی شکایت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ثورِ فلک عطا کر تاکہ وہ گل گمیش سے میرا بدلہ لے۔ ثورِ فلک عروق میں آفت ناگہانی بن کر آتا ہے سیکڑوں جانیں ضائع ہوتی ہیں مگر گل گمیش اور ان کیدو ثورِ فلک کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اب دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ دیوتاؤں کے مقرر کیے ہوئے پاسبان ہمبابا کے قتل کی پاداش میں گل گمیش اور ان کیدو میں سے کس کو ہلاک کیا جائے۔ ینلس اس تجویز کی مخالفت کرتا ہے مگر اس کی پیش نہیں جاتی۔ بالآخر ان کیدو کی موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ان کیدو بیمار پڑتا ہے اور مر جاتا ہے۔

گل گمیش کو اپنے دوست کی موت کا اتنا صدمہ ہے کہ وہ راج پاٹ چھوڑ کر جنگلوں میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔ اسے دوست کی موت میں اپنا انجام نظر آتا ہے۔ اسے یہی غم کھائے جاتا ہے کہ ایک دن میرا بھی یہی حشر ہوگا۔ موت کے ڈر سے اس کی نیند حرام ہے۔

اسے معلوم ہوتا ہے کہ ساحلِ سمندر سے دور کسی جگہ ایک شخص ہے جس کو دیوتاؤں نے امر بنا دیا ہے اور اسے بقائے دوام کا راز معلوم ہے۔ گل گمیش اس کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ ایک جگہ ایک شراب ساز عورت ملتی ہے جو گل گمیش کو "کھاؤ، پیو اور مزے اڑاؤ" کا مشورہ دیتی ہے کیونکہ "حیاتِ جاوداں تمھاری قسمت میں نہیں ہے۔ حیات تو فقط دیوتاؤں کے لیے مخصوص ہے۔" مگر گل گمیش مردِ بزرگ اُتناپشتیم سے ملنے پر اصرار کرتا ہے۔ عورت اسے اُتناپشتیم کے ملاح کا پتہ بتاتی ہے۔ گل گمیش ملاح کی مدد سے اُتناپشتیم کے پاس پہنچ جاتا ہے اور اس سے شجرِ حیات کا آرزومند ہوتا ہے۔ اُتناپشتیم اسے سیلاب کا قصہ سناتا، فنا اور بقا کا فلسفہ سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے تو دیوتاؤں نے امر بنایا ہے۔ تیری پشت پناہی کون کرے گا۔ جب گل گمیش بہت اصرار کرتا ہے تو اُتناپشتیم اسے شجرِ شباب کا پتہ بتاتا ہے جو کنوئیں میں اُگتا ہے۔ گل گمیش کنوئیں میں اترتا ہے اور شجرِ شباب کو حاصل کر لیتا ہے۔ اب وہ خوش ہے کہ حیاتِ جاودانی نہیں ملی تو کیا ہوا، اس بوٹے کی مدد سے عروق کے سب بوڑھے اور وہ خود دوبارہ جوان ہو جائیں گے۔

راستے میں اسے ایک باؤلی نظر آتی ہے۔ گل گمیش شجرِ شباب کو کنارے پر رکھ کر باؤلی میں نہانے لگتا ہے۔ باؤلی میں ایک سانپ رہتا ہے۔ وہ بوٹے کی خوشبو پا کر باہر آتا ہے اور شجرِ شباب کو کھا جاتا ہے۔ گل گمیش باؤلی سے باہر آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ بوٹا غائب ہے۔ وہ روتا پیٹتا ناکام و نامراد عروق کی راہ لیتا ہے۔

ماحول اور معاشرہ

داستانِ گل گمیش کے تخلیقی محرکات، علامتی محاسن و نکات اور جذباتی ہیجانات کا جائزہ لینے سے پیشتر ہمیں وادیٔ دجلہ و فرات کے قدیم باشندوں کے ماحول و معاشرہ، عقائد و اوہام، تاریخ و روایات، غرض ان کے وجود کے داخلی اور خارجی پہلوؤں پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔

سرزمینِ عراق کا وہ خطہ جو دریائے دجلہ و فرات کے سنگم اور بغداد کے درمیان واقع ہے۔ پرانے زمانے میں سومیر یا شومیر کہلاتا تھا۔ سومیری زبان میں اس خطے کو "کی۔ این۔ گی" یعنی "جھاؤ کی زمین" کہتے تھے کیونکہ یہاں ندیاں اور نالے کثرت سے تھے اور سارا علاقہ جھاؤ اور نرسل سے بھرا ہوا تھا۔ تقریباً چھ ہزار برس گزرے چند قبیلے ایلم (جنوب مغربی ایران) سے پانی کے راستے اس ویران اور دلدلی علاقے میں آئے اور خلیج فارس کے شمالی ساحل پر آباد ہو گئے۔ اس زمانے میں یہ ساحل وہاں تھا جہاں اب بصرہ ہے (دریائے فرات ہر سال بارش کے موسم میں مٹی کا بہت بڑا ذخیرہ دہانے میں لاکر ڈھیر کر دیتا ہے جس کی وجہ سے سمندر برابر گھٹتا رہتا ہے اور خلیج فارس کا شمالی ساحل جنوب کی طرف سرکتا جاتا ہے۔ یہ عمل ہزاروں سال سے جاری ہے) ان نووارد لوگوں کے سب سے پرانے ڈھانچے ارید و، حسّنی اور دوسرے مقامات پر ملے ہیں۔ ان ڈھانچوں سے پتہ چلتا ہے کہ نوواردوں کے دانت لمبے تھے، جبڑے کی ہڈی موٹی اور ابھری ہوئی تھی۔ ان کا رنگ گندمی تھا اور سر کے بال سیاہ تھے۔ نسلی اعتبار سے یہ لوگ غالباً آرین تھے اور ان کا آبائی وطن بحرِ اسود اور بحرِ اخضر کا درمیانی علاقہ تھا۔ البتہ ان کی زبان اکثر آریائی زبانوں سے مختلف تھی۔ چنانچہ اس کے بارے میں ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کیونکہ سومیری زبان بہ یک وقت چینی، کورین (منگول)، تامل (دراوڑ)، گرگانی اور ترکی (آرین)، بنتو (افریقی) اور باسک (ہسپانوی) زبانوں سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔

سومیری قوم کے لوگ بڑے جفاکش، ذہین اور ہنرمند تھے۔ ابتدا میں انھوں نے چھوٹی چھوٹی بستیاں سمندر کے کنارے بسائی تھیں۔ وہ مویشی پالتے تھے، کھیتی باڑی کرتے تھے اور مچھلیاں پکڑتے تھے۔ وہ مٹی کے پکے برتن بناتے تھے جن پر اقلیدسی علامتیں نقش ہوتی تھیں (ان کی زراعت پیشگی کا سب سے بڑا ثبوت بھی اقلیدسی شکلیں ہیں) ان کے آلات اوزار لکڑی، پتھر اور دھات کے ہوتے تھے مگر جلد ہی انھوں نے اتنی ترقی کر لی کہ تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت میں مشرق قریب کی سب قوموں پر سبقت لے گئے۔ چنانچہ بعض محققین کی رائے میں انسانی تاریخ کا آغاز دراصل سومیر ہی سے ہوتا ہے۔ ان کی ایجادات و اختراعات کی فہرست بہت طویل ہے البتہ ان کا سب سے عظیم کارنامہ فن تحریر کی ایجاد ہے۔ ان کی یہ تحریر ابتدا میں تصویری تھی لیکن چار ہزار قبل مسیح میں صوتی ہو گئی۔ وہ گیلی مٹی کی تختیوں پر نرسل کے قلم سے پیکانی خط میں لکھتے تھے۔ سب سے پہلے مدرسے بھی انھیں نے قائم کیے جہاں استاد طلبا کو باقاعدہ لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے مگر لکھنے پڑھنے کا فن فقط مندر کے منتظمین اور شاہی خاندان کے چند افراد تک محدود تھا۔ سب سے پہلی جمہوری ریاستیں جن کا ہمیں علم ہے، سومیر ہی میں وجود میں آئیں۔ قانون کے ضابطے سب سے پہلے وہیں مرتب ہوئے۔ شہروں کی بنیاد سب سے پہلے وہیں پڑی۔ سب سے پہلی عدالتیں وہیں بنیں۔ دوا کا سب سے قدیم نسخہ ہمیں سومیر ہی سے ملا ہے۔ کاشتکاروں کی جنتری سب سے پہلے وہیں تیار ہوئی۔ تخلیق کائنات اور تخلیق انسان کا فلسفہ سب سے پہلے سومیری ذہن نے تخلیق کیا۔ اخلاقیات کے اصول سب سے پہلے انھوں نے وضع کیے۔ حیوانوں کی کہانیاں سب سے پہلے انھوں نے لکھیں۔ جنت اور جہنم کا تصور دوسری قوموں کو انھوں نے دیا۔ قیامت کا تذکرہ سب سے پہلے ان کے نوشتوں میں ملتا ہے۔ رزمیہ اور المیہ داستانیں سب سے پہلے انھوں نے تصنیف کیں۔ محبت کے سب سے پرانے گیت انھی کے ہیں۔ کتب خانے قائم کرنا اور کتابوں کی فہرست مرتب کرنا انسان کو انھوں نے سکھایا۔ شہر کا پہلا نقشہ (شہر نیفار) وہیں دستیاب ہوا ہے۔ منصوبے کے مطابق شہر بنانا، سیدھی سڑکیں بنانا، چوک اور بازار تعمیر کرنا، گندے پانی کی نکاسی اور زمین دوز نالیاں نکالنا بھی اہل سومیر ہی کے دماغ کی ایجاد ہے۔

شہری ریاستوں کا نظام

سومیر چھوٹی چھوٹی شہری ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان ریاستوں کا مرکز شہر ہوتا تھا اور شہر کا مرکز ریاست کے محافظ دیوتا کا مندر۔ ریاست کی معاشی، مذہبی، معاشرتی، صنعتی، تجارتی اور زرعی زندگی اس معبد عظیم کے مفاد کے گرد گھومتی تھی۔ قدیم مصر میں فرعون (بادشاہ) خدا کا اوتار ہوتا تھا۔ وہ ریاست کا سیاسی فرمانروا بھی تھا اور مذہبی پیشوا بھی مگر سومیر میں کسی شخص کو یہ مرکزی حیثیت حاصل نہ تھی بلکہ ہر شہر کا دیوتا مندر کا سارا کاروبار اپنے نائب کے ذریعہ انجام دیتا تھا۔ اسے سنگو کہتے تھے۔ اس کا وزیر نوباندہ کہلاتا تھا۔ شہر کی سب سے اونچی اور سب سے شاندار عمارت مندر کی تھی۔ ہر مندر میں ایک مینار ہوتا تھا جسے زی گورات کہتے ہیں۔ یہ عمارت اونچے ٹیلے پر بنائی جاتی تھی۔ زی گورات پر معبود اعظم آسمانی دیوتاؤں سے گفتگو کر سکتا تھا۔ شہر میں دوسرے دیوتاؤں کے مندر بھی ہوتے تھے مگر ان کی حیثیت ثانوی تھی البتہ اپنی املاک کی حد تک یہ چھوٹے مندر بھی خودمختار، خود کفیل اور صاحب اقتدار ہوتے تھے۔ ریاستی اراضی کا غالب حصہ معبد عظیم کی ملکیت ہوتا تھا اور ہر شہری مندر کی رعیت۔ مزروعہ زمین تین حصوں میں بٹی ہوتی تھی۔ ایک حصہ "نگنا" کہلاتا تھا۔ اس زمین پر زراعت براہِ راست مندر کی نگرانی میں ہوتی تھی اور ہر شہری کو وہاں کام کرنا پڑتا تھا

دوسرا حصہ "کُر" تھا۔ "کُر" کی اراضی شہریوں میں مفت تقسیم کی جاتی تھی۔ تیسرا حصہ "اروالی" کہلاتا ہے جو کاشتکاروں کو بٹائی پر دیا جاتا تھا۔

غلامی کا رواج نہ تھا البتہ جنگی قیدیوں کو مندر میں غلام کی حیثیت سے کام کرنا پڑتا تھا۔ مندر میں رقص و سرود کے مذہبی مناسک کی ادائیگی کے لیے دیوداسیاں مقرر تھیں۔ مندر کے باورچی خانے، لنگرخانے اور شراب کی بھٹیوں کی دیکھ بھال بھی دیوداسیاں ہی کرتی تھیں۔ گڈریوں، مچھیروں، بڑھیوں، ٹھٹھیروں، سناروں اور دوسرے دستکاروں سے ان کی پیداوار کا ایک حصہ بطور محصول لیا جاتا تھا یا پھر وہ مندر کے کل وقتی ملازم ہوتے تھے۔

ریاست کا خزانہ بھی مندر ہی میں ہوتا تھا۔ اس خزانے میں سونے چاندی اور قیمتی پتھروں کے علاوہ ضروریات و تعیشات زندگی کا وافر ذخیرہ موجود رہتا تھا مثلاً اناج، روغنیات، شراب، کھجور، خشک مچھلی، اُون، کھال، تانبے کے پیسے، نخور، جھاڑو اور بیل اور آلاتِ زراعت و صنعت وغیرہ، اور ان سب چیزوں کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ مندر کی انہی معاشی ضرورتوں نے سب سے پہلے فنِ تحریر کو ایجاد کیا۔ سومیر کی وہ قدیم ترین لوحیں جو عروق کے مندر سے نکلی ہیں دراصل یادداشتیں ہیں جن پر مندر کے کارخانوں اور گوداموں کے حساب اور ہدایات وغیرہ درج ہیں۔

اناج میں جو سب سے اہم پیداوار تھی البتہ جنگلی گیہوں کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ لوگوں کی عام غذا مچھلی تھی۔ بھیڑ، بکریاں اُون اور دودھ کے لیے پالی جاتی تھیں۔ جتائی کا کام بیلوں اور گدھوں سے لیا جاتا تھا۔ ہلوں میں جوڑی کے بجائے جو کڑی کا رواج تھا۔ تقسیمِ کار کا طریقہ عام تھا۔

ریاست کی حفاظت کے لیے پیشہ ور سپاہی ملازم رکھے جاتے تھے مگر امن کے زمانے میں ان کو بھی مندر کی خود کاشت زمین پر کام کرنا پڑتا تھا۔

سومیر کے لوگ وزن اور پیمائش میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ وزن کا پیمانہ "گر" کہلاتا تھا، چاندی کا "گن" اور زمین ناپنے کا "کان"۔

ریاست کی معاشی اور مذہبی زندگی پر کامل اقتدار کے باوجود مندر کے موبد اپنے آپ کو سیاسی امور سے الگ رکھتے تھے۔ سیاسی مسائل کا تصفیہ بالغ مردوں کی مجلسِ شوریٰ کرتی تھی۔ ریاست کو بیرونی حملے سے محفوظ رکھنے، ریاست کے اندر امن قائم رکھنے اور شہریوں کے آپس کے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے فرائض مجلسِ شوریٰ انجام دیتی تھی۔ اس کے علاوہ روزمرہ کے کاموں کی خاطر شہر کے بزرگوں کی ایک مجلسِ اعلیٰ ہوتی تھی۔ اِن دونوں ایوانوں میں شرکت کی بنیاد شہری ریاست میں سکونت تھی نہ کہ کسی خاص قبیلہ یا طبقے کی رکنیت۔ ان ایوانوں میں فیصلے کثرتِ رائے کی بجائے اتفاقِ رائے سے ہوتے تھے مگر جمہوری مساوات کا یہ پنچایتی نظام زیادہ دیر نہ چل سکا۔ دولت آفرینی کے ذرائع کو فروغ ہوا اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹنے لگی تو یہ پنچایتی نظام بھی درہم برہم ہو گیا اور اس کی جگہ شخصی حکومت قائم ہو گئی۔

ریاستوں کی باہمی آویزش نے بھی شخصی حکومت کے استحکام میں بڑی مدد دی۔ کیونکہ جنگ کے موقع پر تمام اختیارات لامحالہ طور سے ایک یا چند خودمختار شخصیتوں کو سونپنے پڑتے تھے۔ سومیری زبان میں اس شخص کو "لوگل" کہتے تھے جس کے معنی "بڑا آدمی"

یا بادشاہ کہے جاتے تھے۔ ابتدا میں لوگل کا عہدہ "باندہ" یعنی عارضی ہوتا تھا اور ہنگامی حالات کے گزر جانے پر تمام اختیارات مجلسِ شوریٰ کو منتقل ہو جاتے تھے مگر ہنگامی حالات کے آغاز اور اختتام کا فیصلہ لوگل باندہ ہی کرتا تھا چنانچہ ہنگامی حالات رفتہ رفتہ عارضی سے مستقل ہونے لگے اور لوگل باندہ، بادشاہ بن گئے۔ ابتدا میں یہ بادشاہت ان کی ذات تک محدود رہتی تھی اور بادشاہ کے لیے اعلیٰ خاندان کی شرط بھی نہ تھی چنانچہ عروق میں سیلابِ عظیم کے بعد جب بادشاہت قائم ہوئی تو وہاں کا ایک بادشاہ مچھیرا تھا۔ ایک بادشاہ بڑھئی اور ایک بادشاہ پروہت، مگر گل گمیش کے بعد بادشاہت موروثی ہو گئی۔

اہلِ سومیر کا اندازِ فکر

اہلِ سومیر کی نظر میں کائنات زندگی سے بھرپور ایک وحدت تھی۔ وہ چیزوں کو حیوانات، جمادات اور نباتات کے خانوں میں بانٹنے کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک ہر وہ شے جو ذہن، جذبے یا ارادے کو متاثر کر سکے حقیقی تھی اور جو حقیقی تھی وہ جاندار اور متحرک بھی تھی۔ اس کی ایک فعالی شخصیت تھی اور یہ شخصیت ارادہ، قدر شناسی اور عمل کی اہلیت رکھتی تھی لہٰذا ریت کا ذرہ ہو یا پتھر کا ٹکڑا، آندھی کے طوفان ہوں یا سمندر کی موجیں، سورج ہو یا چاند ستارے، جانور ہوں یا انسان سب صاحبِ ارادہ اور فعّال ہستیاں تھیں چنانچہ سومیر کا ایک قدیم شاعر نمک سے یوں مخاطب ہوتا ہے:۔

او نمک! جسے پاکیزہ مقام پہ پیدا کیا گیا
تجھے اِن لیل نے دیوتاؤں کی غذا ٹھہرایا
تیرے بغیر دیوتا، بادشاہ، شہزادے اور رئیس زادے
لوبان کی خوشبو نہیں سونگھ سکتے
او نمک! میرا طلسم توڑ دے
مجھے سحر سے آزاد کر دے
مجھ سے میرا سحر واپس لے لے۔

اور اگر کسی سومیری راہ گیر کا پاؤں زخمی ہو جاتا تو وہ اس حادثے کو یوں بیان کرتا تھا: "میں چلا جا رہا تھا کہ پتھر کے ٹکڑے نے میرے پاؤں میں ڈس لیا اور میرا انگوٹھا لہولہان ہو گیا۔"

سورج کا یہ قدیم انداز ابھی تک ختم نہیں ہو نیا کی قریب قریب سبھی زبانوں میں ایسے محاورے اور الفاظ اب بھی بکثرت ملیں گے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرانے زمانے میں لوگ ہر جگہ بے جان چیزوں میں بھی ارادے اور عمل کی صفتیں دیکھتے تھے مثلاً ہم آج بھی کہتے ہیں کہ سورج نکلتا ہے، دیوار کھڑی ہے، چھت گر پڑی ہے، دھول اُڑ رہی ہے وغیرہ۔ شاعری میں تو اظہارِ بیان کا یہ انداز بہت عام ہے، چنانچہ سومیری شاعر اگر نمک سے خطاب کرتا ہے تو اُردو شاعر آفتاب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ:

اے آفتاب! صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو

اور ستاروں سے یوں کلام کرتا ہے۔

ارے چھوٹے چھوٹے تارو — جو چمک دمک رہے ہو
تمھیں دیکھ کر نہ ہوئے — مجھے کس طرح تحیر

اور میر انیس فرماتے ہیں کہ :

ساحل پہ سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

اہلِ سومیر ظواہر اور حقائق، مشاہدہ اور رائے میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ سورج اگر مشرق میں طلوع اور مغرب میں غروب ہوتا تھا تو اس کا یہ سفر انسان کی نظر کا دھوکا نہ تھا بلکہ درحقیقت اُتُو دیوتا (شمس) صبح سویرے اپنی کشتی میں بیٹھ کر آسمان کے نیلے سمندر میں سفر شروع کر دیتا تھا اور شام کے وقت بحرِ ظلمات میں چلا جاتا تھا جو مغرب میں تھا۔ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ معاشرے کے عہدِ طفلی میں انسان کی ساری سوچ تصویری ہوتی تھی۔ وہ اشیا کا تصور مجردات کے بجائے شخصی اور تصویری انداز میں کرتا تھا۔ جس طرح ہم آپ اب بھی خواب میں یا شعر انشبیہوں اور خیالی تصویروں میں کرتے ہیں۔ دوسری پرانی قوموں کی مانند سومیری انسان بھی کسی حادثے یا واقعے کا سبب تلاش کرتے وقت یہ نہیں پوچھتا تھا کہ یہ حادثہ "کیسے" اور "کیوں" ہوا بلکہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس واقعہ کو "کس نے کیا"۔ کیونکہ اس کے نزدیک ہر حادثے کے پیچھے کوئی با ارادہ اور فعال شخصیت ہوتی تھی۔ ہر وجود کے لیے تکوین اور تخلیق لازمی تھی کیونکہ کسی ذات کے فیصلے اور عمل کے بغیر نہ کوئی شے وجود میں آسکتی تھی اور نہ مر سکتی تھی۔ موت کا باعث بھی عارضۂ جسمانی نہیں تھا بلکہ اس میں بھی کسی ذات کے ارادے یا خود موت کے فیصلے کو دخل تھا۔

سومیر کے لوگ کائنات کو بھی اپنی شہری ریاستوں کی طرح ایک ریاست خیال کرتے تھے۔ اس ریاست کا ایک بادشاہ تھا جس کو اَنُو کہتے تھے۔ یہ دیوتاؤں میں سب سے بڑا تھا کیونکہ وہ آکاش کا دیوتا تھا۔ اس کے ماتحت دیوتاؤں کی ایک مجلسِ شوریٰ تھی جو موجودات عالم کی تقدیر کا فیصلہ کرتی تھی۔ تقدیر کا یہ فیصلہ باقاعدہ ایک لوح پر لکھا جاتا تھا اور ایک دیوتا اس لوح کی حفاظت پر متعین تھا تاکہ کوئی شخص دیوتاؤں کے فیصلے میں تبدیلی نہ کرنے پائے۔ انُو کے پہلو میں اس کا بیٹا ان لیل بیٹھتا تھا (ان لیل کے لغوی معنی طوفان کا آقا ہیں چنانچہ ان لیل طوفان کا دیوتا تھا) ان لیل انُو کی طاقت کا مظہر تھا۔ وہ دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں کو نافذ کرتا تھا۔ وہ سب دیوتاؤں سے زیادہ صاحب جلال تھا اور آسمان زمین کے درمیان اسی کا راج تھا۔ ثورِ فلک اور حمبابا کی ہلاکت کے بعد جب دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ میں انُو یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ گل گمیش اور ان کدو میں سے ایک کو مرنا ہوگا تو ان لیل بڑے تحکمانہ انداز میں فیصلہ صادر کر دیتا ہے کہ "ان کدو کو مرنا ہوگا۔ گل گمیش نہیں مرے گا۔" شمس دیوتا اس کے جواب میں کہتا ہے کہ انھوں نے ثورِ فلک اور حمبابا کو میری اجازت سے ہلاک کیا تھا لہٰذا وہ بے قصور ہیں مگر ان لیل اسے ڈانٹ دیتا ہے "تم تو روزانہ ان کے پاس جاتے ہو۔ انہی میں گھل مل گئے ہو اسی لیے ان کی وکالت کرتے ہو۔" اور بے چارہ شمس خاموش ہو جاتا ہے لیکن ہماری داستان کا ہیرو اس ہیبت ناک دیوتا کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ حمبابا کو جو ان لیل کی طرف سے دیودار کے جنگل کا محافظ تھا ہلاک کر دیتا ہے۔ دراصل اس داستان میں ان لیل کوئی اہم کردار نہیں ہے۔

سومیری دیومالا میں تیسری عظیم طاقت زمین کی تھی۔ سومیری گیتوں اور نظموں میں زمین کے متعدد نام ہیں۔ وہ "ننتو" تھی جو سب کو جنم دیتی ہے "وہ" ننگ۔ ہر۔ سگ"۔ "نن۔ ما"۔ "ننگ۔ ندی۔ گ"۔ "دم۔ کی" تھی یعنی ہر اس شے کو بنانے والی جس میں زندگی ہے۔ وہ تخلیق اور افزائشِ نسل کی دیوی ہے

وہ دودھ پلاتی ماتا ہے۔ کئی سومیری مورتیوں میں وہ ایک بچے کو دودھ پلاتی دکھائی گئی ہے۔ کئی بچے اس کے پیرہن کے اندر سے جھانک رہے ہیں اور اس کے چاروں طرف رحمِ مادر کی شکلیں بنی ہیں۔ وہ "دیوتاؤں کی ماں" ہے۔ وہ "انسان کی ماں اور خالق" ہے سومیری دیومالا میں ننّی کے دو پہلو تھے اس لیے زمین کے دیوتا بھی دو تھے۔ ایک اِن کی تھا جو دانائی کا مظہر اور انسان کا ہمدرد اور سرپرست تھا اور دوسرا اِن ہرساگا تھا جو میٹھے پانی کا دیوتا تھا۔

ان سے نیچے درجے پر اُتو یا شمس تھا۔ شمس کی شخصیت دوسرے دیوتاؤں سے زیادہ روشن اور واضح تھی۔ وہ ہر روز صبح کے وقت تاریکی کے پیٹ سے پیدا ہوتا تھا (جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے) تمام دن انسان کی خدمت کرتا تھا اور شام کو سو جاتا تھا شمس بصیر و خبیر تھا۔ اس سے کائنات کا کوئی راز مخفی نہیں تھا۔ وہ منصف و عادل تھا، مشفق و مہربان تھا، دانا و بینا تھا، رحیم و کریم تھا چنانچہ سومیری زبان میں اُتو کے مدحیہ گیت کثرت سے موجود ہیں۔ شمس دراصل ایک آفاقی دیوتا ہے۔ اس کی عظمت عراق تک محدود نہیں ہے بلکہ مصر، ایران، وادیٔ سندھ، ہندوستان، چین اور دوسرے تمام قدیم ملکوں کے مذہبوں میں شمس کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ ہر جگہ زندگی کی علامت اور دانائی شعور اور بصیرت کا سرچشمہ ہے۔ گل گمیش کی داستان میں بھی ہیرو ہر موقع پر شمس تاباں ہی کی رضا حاصل کرتا ہے۔ اسی سے امداد کی درخواست کرتا ہے اور اسی کے سہارے بڑی سے بڑی مہم کو سر کرتا ہے۔

سومیری عقیدے میں کائنات کے دو حصّے تھے۔ ایک زمین اور آسمان کے درمیان کا حصّہ اور دوسرا زمین کے نیچے پاتال کا حصّہ۔ پاتال کو سومیری 'کُر' کہتے تھے۔ کُر ظلمات تھا۔ کُر کا نظم و نسق بھی دیوتاؤں کے سپرد تھا۔ کُر کی حاکمِ اعلیٰ اَرشی گل ملکہ ظلمات تھی جو اَنو کی بیٹی اور عشتار کی بہن تھی۔ قضا و قدر کا سارا عملہ اَرشی گل ہی کے ماتحت تھا۔ ہر شخص کو خواہ اس کے اعمال اچھے ہوں یا بُرے، مرنے کے بعد ظلمات کو جانا پڑتا تھا۔ وہاں اس کے اعمال کو میزان میں تولا جاتا تھا۔ ظلمات بڑی بھیانک جگہ تھی۔ انسان اور دیوتا سب اس کی دہشت سے لرزتے تھے اور اس سے پناہ مانگتے تھے۔ گل گمیش کی داستان میں بھی ظلمات کا بڑا ہولناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ظلمات کی ہیبت سے تو گل گمیش جیسے سورما کے چہرے کا رنگ بھی اُڑ جاتا ہے۔

سومیر کے لوگ ان دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے لیے عالی شان مندر بناتے تھے اور ان کی مورتیوں کو پوجتے تھے۔ ہر شہری ریاست کا ایک مخصوص دیوتا بھی ہوتا تھا جو اس ریاست کا محافظ، سرپرست اور حاکمِ اعلیٰ تصور ہوتا تھا مثلاً نِفّار کا خاص دیوتا اِن لیل تھا۔ اِن لیل کا سب سے بڑا مندر وہیں تھا۔ اسی طرح اَنو اور عشتار کے مندر عروق میں تھے۔ شہر لگاش کا خاص دیوتا ننگرسو اور شہر اُر کا ننّا تھا۔

سومیری مذہب میں سب سے دلچسپ شخصیت اِنانا (عشتار) کی ہے۔ وہ خداوند اَنو کی بیٹی اور قوت و جلال کے مظہر اِن لیل کی بہن ہے۔ وہ ذہنِ انسانی کی سب سے پہلی اساطیری تخلیق ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے باپ اور بھائی بہن سے بھی قدیم ہے۔ وہ عظیم ماں ہے، تخلیق اور افزائشِ نسل کی دیوی۔ اس کی بہ کثرت مورتیاں جھیل بیکال کے علاقے میں، مشرقی یورپ میں، اٹلی اور فرانس کے مصوّر غاروں میں، ایشیائے کوچک، مصر، عراق، ایران اور دریائے سندھ کی وادی میں دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ مورتیاں قدیم حجری دور کی ہیں اور پندرہ تا پچاس ہزار برس پرانی ہیں۔ دراصل دنیا کی سب سے پرانی مورتیاں یہی ہیں۔ ان مورتیوں میں جنسی اعضا۔ پستان، پیڑو وغیرہ۔ کو بڑی مبالغہ آمیز شکل میں دکھایا گیا ہے کیونکہ یہی اعضا تخلیق اور افزائشِ نسل کی علامت تھے۔

اِنانا شمس دیوتا سے بھی زیادہ آفاقی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اکادی اور آشوری تہذیب میں عشتار ہے۔ مصر میں آئی سس، توت،

الفوزا اور ننتھہ ہے، فلسطین میں اناث، اشیراہ، استارت اور عشتروتھ ہے۔ ایران میں شالا، اناہتیا اور نانیا ہے۔ ہندوستان میں اوما، پربتی، امبا، لکشمی، سرسوتی، درگا، کالی اور رتی ہے اور یونان میں ہیرا، ایتھینا، ایفرودتی اور آرتے میس ہے۔ بابل کی مشہور بیسوا زہرہ بھی یہی ہے جس نے دو فرشتوں —— ہاروت اور ماروت —— کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار کر کے ان سے اسمِ اعظم کا راز معلوم کیا اور ستارہ بن کر آسمان پر جا ٹنگی تھی۔ عربوں کی مشتری بھی یہی ہے۔

یہ دیوی قدیم حجری دور کی ذہنی تخلیق ہے اور اس وقت کے انسانی معاشرے کی خواہشوں اور ضرورتوں کی جذباتی علامت ہے۔ اس عہد کے انسان کا سب سے اہم مسئلہ بقائے نسل اور افزائشِ نسل کا مسئلہ تھا۔ اس کے نزدیک اس مسئلہ کا حل فقط عورت کے پاس تھا کیونکہ ماں اور اس کی کوکھ سے پیدا ہونے والے نومولود کے رشتے کے بارے میں شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بچہ جس کے پیٹ سے پیدا ہوتا تھا، وہی اسے دودھ پلا کر بڑا کرتی تھی، اسے اپنی گود میں بٹھا کر پیار کرتی تھی۔ اسے بولنا اور چلنا سکھاتی تھی اور اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ انسانی نومولود دوسرے جانوروں کے بچوں کے مقابلے میں اس لحاظ سے نامکمل پیدا ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کئی برس تک اپنی ماں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ شیر خوارگی کے زمانے میں جذباتی طور پر فقط ماں سے وابستہ ہوتا ہے اور اس کی تمام تر توجہ کا مرکز ماں کی ذات ہوتی ہے۔ باپ کی اہمیت ثانوی ہوتی ہے۔ پھر ذرا اس قدیم سماج کا تصور کیجئے جس میں کسی کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ بچہ عورت مرد کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ سماج تو فقط یہ جانتا تھا کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر سماج نے عورت کو دیوتا بنا کر اس کی پرستش کی تو ہمیں حیرت نہیں کرنی چاہیے۔

ماں کی اہمیت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ انسانی معاشرے کے عہدِ طفلی میں اموی نظام رائج تھا۔ اس نظام میں اقتدار اور اختیار کا سرچشمہ عورت ہوتی تھی۔ عورتوں نے فنِ زراعت ایجاد کیا تھا۔ کھیتی باڑی کا سارا کام عورتیں کرتی تھیں۔ مویشیوں کی دیکھ بھال بھی انہی کے ذمے تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہ کر حضری زندگی بسر کرتی تھیں۔ ان کی معیشت اور معاشرت زمین سے وابستہ تھی۔ اس کے برعکس مرد سفری زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ شکار کی تلاش میں بستی سے دور مارا مارا پھرتا تھا۔ بستی میں اس کی حیثیت اجنبی اور پردیسی کی سی تھی کیونکہ جس طرح آج عورت بیاہ کر اپنی سسرال میں جاتی ہے اسی طرح پرانے زمانے میں مرد اپنی جائے ولادت سے دور کسی اجنبی بستی میں بیاہ کر کے آباد ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی دیومالائی داستانوں کے سبھی ہیرو —— ہیراکلس، حاتم طائی، رام چندر، راجہ رسالو اور گل گمیش وغیرہ —— سیاح اور مہم جو ہوتے ہیں کیونکہ مرد کی یہی صفات سب سے نمایاں تھیں۔ شکار کے موقع پر دلیری دکھانا اور شکار کی تلاش میں دور دور تک سفر کرنا۔

اناتا یا عشتار دراصل اسی اموی دور کی دیوی ہے۔ جب انسان کی معاشرتی اور جذباتی زندگی پر عورت کا راج تھا۔ اس دیوی کے مختلف پہلو اور متعدد روپ تھے۔ وہ بیک وقت ماں، بہن، بیوی، محبوبہ سبھی کچھ تھی۔ وہ محبت کی دیوی بھی تھی اور جنگ کی دیوی بھی۔ مرد اگر اس کی اطاعت کرتا تھا اور اس سے پیار کرتا تھا تو وہ مشفق و مہربان ماں بن جاتی تھی اور اگر وہ اس کی محکومی سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا یا اس کے پیار کو ٹھکراتا تو وہ کالی کا روپ اختیار کر لیتی اور اس کے خون سے ہولی کھیلنے لگتی۔

گل گمیش کی داستان میں عشتار حسن و شباب کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ایرک پر بہت مہربان ہے کیونکہ ایرک اس کا مطیع و فرمان بردار ہے مگر جب وہ یہی حربہ گل گمیش پر آزماتی ہے تو گل گمیش اس کی لگاوٹ کی باتوں کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے

اور اس کی بے وفائیوں کی پوری فردِ جرم اسے سنا دیتا ہے۔ گل گمیش کے نقطۂ نظر کو حافظ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے ؎

مجو درستیِ عہد از جہانِ سست نہاد
کہ این عجوز عروسِ ہزار داماد است

تب عشتار مہر و محبت کا جامہ اتار دیتی ہے اور غیض و غضب کا پیکر اختیار کر لیتی ہے۔ وہ مرد کو اس گستاخی کی سزا دینا چاہتی ہے۔ مگر گل گمیش نہ صرف عورت کے جذبۂ اطاعت سے آزاد ہو چکا ہے بلکہ اس میں عورت کا مقابلہ کرنے اور اسے شکست دینے کی طاقت بھی موجود ہے۔

عشتار اور گل گمیش کی جنگ دراصل اُموی اور اَبوی نظام کی آویزشوں کا ذہنی پرتو ہے۔ یہ درست ہے کہ گل گمیش کے عہد میں قریب قریب ہر جگہ اُموی نظام کی جگہ اَبوی نظام قائم ہو چکا تھا اور سماج میں مرد کی فوقیت تسلیم شدہ حقیقت بن چکی تھی مگر عورت ہنوز انسان کے جذبات پر حاوی تھی اور اس کا لاشعور ہنوز عورت کے تابع تھا۔ یوں بھی ماضی کی اخلاقی اور سماجی قدریں فرسودہ ہو جانے کے بعد مدت تک زندہ رہتی ہیں اور انسان کے لیے ان کی گرفت سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ گل گمیش کی فتح اَبوی نظام کی فتح ہے اور اس لحاظ سے بڑی معنی خیز ہے کہ اس نے عشتار کی عظمت اور اس کے اقتدار پر بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔ ایک ایسا بت توڑا ہے جو ہزاروں سال سے انسان کے دماغ پر قبضہ کیے ہوئے تھا۔

گل گمیش کی داستان ابتدا سے انتہا تک جہد و پیکار کی داستان ہے۔ گل گمیش جو سومیری قوم بلکہ پوری انسانیت کے شعور، ارادہ اور عمل کی علامت ہے، ناسازگار ماحول کا مقابلہ کرتا ہے۔ مذہب کے فرسودہ رسوم کو توڑتا ہے اور معاشرے کے نظامِ کہنہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وہ عمائدینِ شہر کی مجلسِ شوریٰ کو خاطر میں نہیں لاتا کیونکہ اسے ان بزرگوں کی حب الوطنی کا تجربہ ہو چکا تھا کیا یہ وہی عمائدین نہ تھے جنھوں نے ریاست کیش کی اطاعت قبول کر لینے کا مشورہ دیا تھا؟ ان لوگوں کو گل گمیش سے تین شکایتیں ہیں۔ وہ مقدس طبل کو ذاتی تفریح کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ عروق کی دلہنوں کو شبِ عروسی سے پیشتر اپنی خواب گاہ میں لے جاتا ہے اور ریاست کے نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیتا ہے۔ یہ بڑی سنگین شکایتیں ہیں کیونکہ ان کا اثر اہلِ عروق کی مذہبی، ازدواجی اور سیاسی زندگی پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ مذہبی گروہ، عمائدین اور عوام سبھی گل گمیش سے نالاں ہیں مگر ان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ گل گمیش کو تخت سے اتار دیں یا اسے ان حرکتوں سے باز آنے پر مجبور کر دیں۔ وہ دیوتاؤں سے التجا کرتے ہیں اور دیوتا گل گمیش کا ایک حریف پیدا کرتے ہیں تاکہ اہلِ عروق کو گل گمیش کی مطلق العنانیوں سے نجات مل سکے مگر گل گمیش اس حریف کو پچھاڑ دیتا ہے اور وہ گل گمیش کا مطیع و فرماں بردار ہو جاتا ہے۔ اِن کِدُو کی شکست ایک پہلوان کی شکست نہیں ہے بلکہ ایک نظامِ اقدار کی شکست ہے کیونکہ اِن کِدُو صحرائی اور بدوی طاقتوں کا نمائندہ ہے اور اُموی نظام کے زیرِ اثر ہے۔ وہ انسان کا لاشعور ہے۔ یہ شکست اس لحاظ سے بھی بڑی اہم ہے کہ انسان نے پہلی بار دیوتاؤں کو زک دی ہے۔ دراصل دیوتاؤں کی یہ پہلی شکست ہے۔ اس شکست کے بعد عمائدینِ شہر خاموش ہو جاتے ہیں اور دیوتا بھی گل گمیش سے کوئی باز پرس نہیں کرتے۔ بہر حال وہ تضاد ختم ہو جاتا ہے جس کا باعث گل گمیش کی مطلق العنانی تھی لیکن اب ایک نیا تضاد اُبھرتا ہے۔ ایک نئی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ یہ کشمکش سومیری اور غیر سومیری طاقتوں کے درمیان ہے۔ یہ غیر ملکی طاقت حمبابا کی ہے جو لبنان یا ایلم کے دیودار کے جنگل کا پاسبان ہے۔ سومیر کو عمارتی لکڑی کی ضرورت ہے مگر جنگل کے علاقے پر

حمبابا کا راج ہے جو عظیم دیوتا اِن لیل کا نمائندہ ہے۔ گل گمیش حمبابا سے لڑنے کا عزم کرتا ہے مگر عمائدینِ شہر اسے منع کرتے ہیں۔ اِن کِدُو بھی یہی مشورہ دیتا ہے لیکن گل گمیش کی یزداں شکار طبیعت اِن مشوروں کو ٹھکرا دیتی ہے۔ وہ مہم پر روانہ ہو جاتا ہے اور حمبابا کو ہلاک کر کے مظفر و منصور واپس آتا ہے۔ دیوتاؤں کے مقابلے میں انسان کی یہ دوسری فتح ہے۔ اب اروک کے لوگ اپنے بادشاہ سے بہت خوش ہیں۔

اس فتح کے بعد ایک نیا تضاد اُبھرتا ہے۔ گل گمیش ایک نئی آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے۔ حُسن و محبت کی دیوی اسے لُبھانے کی کوشش کرتی ہے مگر گل گمیش اس کے دام میں نہیں آتا بلکہ اُلٹا اس کی سخت توہین کرتا ہے۔ عِشتار اپنے باپ آنُو سے شکایت کرتی ہے اور بالآخر عظیم دیوتا اس بات پر راضی ہو جاتا ہے کہ گل گمیش کو گستاخی کی سزا دینے کے لیے ثورِ فلک کو اس کے مقابلے پر بھیجا جائے لیکن گل گمیش ثورِ فلک کو بھی ہلاک کر دیتا ہے۔ دیوتاؤں کی یہ تیسری شکست ہے۔ تب دیوتاؤں کی مجلسِ شوریٰ بیٹھتی ہے اور اِن کِدُو کی موت کا حکم صادر کیا جاتا ہے۔

اِن کِدُو کی علالت اور موت گل گمیش کی زندگی کا نہایت اندوہناک اور فیصلہ کن سانحہ ہے۔ اس حادثے کے باعث گل گمیش کی پوری شخصیت ہی بدل جاتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو داستان کا نقطۂ موڑ بھی یہی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس المیہ کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اس سے پیشتر گل گمیش کی ساری فتح مندیاں اور کامرانیاں دراصل تمہید تھیں اور ان کا مقصد المیہ کے شدتِ تاثر میں فقط اضافہ کرنا تھا۔ حقیقی منشا حیات و موت کی آویزش کو واقعاتی رنگ میں پیش کرنا تھا۔

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اِن کِدُو کی موت سے گل گمیش پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کیونکہ گل گمیش زندگی کی بے ثباتی سے ابتدا ہی سے واقف تھا چنانچہ اس کا رفیق اِن کِدُو جب اسے دیودار کی مہم پر جانے سے روکتا ہے تو گل گمیش اسے یوں سمجھاتا ہے:۔

"میرے دوست! وہ کون انسان ہے جس کی رسائی آسمان تک ہو سکے؟
نورانی شمس کی اَبدی رفاقت تو دیوتاؤں ہی کو نصیب ہے
رہے ہم انسان، سو ہمارے دن تو گنتی کے ہوتے ہیں
اور ہمارا کاروبارِ زندگی ہوا کے جھونکے کی طرح رفتنی و گزشتنی ہے
پس موت سے ڈرنا فضول ہے"

اور جب شمس اسے اس مہم سے روکتا ہے تو گل گمیش دیوتا کو یہ جواب دیتا ہے:۔

"یہاں شہر میں تو انسان دل شکستہ ہو کر مر جاتا ہے
اور اس کی جان غم و اندوہ میں نکلتی ہے
میں نے فصیل پر سے کھڑے ہو کر
لاشوں کو دریا میں بہتے دیکھا ہے
میری تقدیر میں بھی یہی لکھا ہے
میں جانتا ہوں کہ میرا انجام بھی یہی ہوگا

کیونکہ اونچے سے اونچے آدمی کی رسائی بھی آسمان تک نہیں ہو سکتی"۔

لہٰذا ہم یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یونان کے المیہ ڈراموں کی مانند گل گیمش کی داستان کے پس منظر میں بھی فنا کا احساس، موت کی ہیبت اور تقدیر کی جبریت ابتدا ہی سے موجود ہے۔ یہ خصوصیت اس داستان تک محدود نہیں ہے بلکہ عالم کی بے ثباتی اور مستقبل کے بارے میں تردّد اور پریشانی سومیری اور اشوری ادب کی سرشت میں داخل ہے۔ اس کا باعث جنوبی عراق کا قدرتی ماحول ہے ——— وہاں کا زراعت پیشہ انسان ہمیشہ قدرت کے رحم و کرم پر رہتا تھا۔ ہل جوتنے سے اناج کاٹنے تک کی ساری مدت فصل کی خیر مناتے پر گزرتی تھی وہ ہر وقت موسم کی خوشگواری کی دعا کرتا رہتا تھا اور اس کی نگاہیں اوپر آسمان پر جمی رہتی تھیں۔ اس کی زندگی دجلہ و فرات سے وابستہ تھی مگر یہ بڑے ناقابلِ اعتبار دریا تھے۔ چنانچہ آج بھی اگر آرمینیا میں برف باری یا بارش معمول سے زیادہ ہو جائے تو ان دریاؤں کی سطح اچانک بہت اونچی ہو جاتی ہے اور ساحل کی آبادیاں اور کھیتیاں ہزاروں میل تک غرقِ آب ہو جاتی ہیں۔ عراق کے دریا کئی مقامات پر کھاڑیوں میں سے ہو کر گزرتے ہیں اور کبھی کبھی چٹانوں کے لڑھک جانے سے دریاؤں کا قدرتی بہاؤ یکا یک رُک جاتا ہے۔ پھر جب یہ چٹانیں کھسکتی ہیں تو پانی کا ذخیرہ سیلاب بن کر جنوب کا رُخ کرتا ہے۔ بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ نہریں پٹ جاتی ہیں، بستیاں تہ آب آجاتی ہیں اور ملک کا سارا زرعی نظام تہس نہس ہو جاتا ہے۔

خلیج فارس بھی اپنی شر سامانیوں میں دجلہ و فرات سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس میں جوار بھاٹے کا بڑا زور رہتا ہے اور بعض اوقات جوار بھاٹے میں سمندر کی لہریں آٹھ دو فیٹ اونچی اٹھتی ہیں جن سے ساحلی علاقے غرقاب ہو جاتے ہیں۔ پھر جنوبی ہوائیں چلتی ہیں تو دریاؤں کے کنارے کئی کئی گز تک ریت سے پٹ جاتے ہیں۔

چنانچہ سومیری ادب میں اگر سیلاب کے تذکرے بہ کثرت ملتے ہیں تو یہ اتفاقی بات نہیں ہے اور اگر سومیری زندگی کی ناپائداری کا رونا روتے ہیں تو یہ بھی قدرتی بات ہے:

"سیلاب کے طوفانی بہاؤ کو کون روک سکتا ہے؟
اس سے تو آسمان لرزتے ہیں اور زمین پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے
وہ ماں اور بچے کو المناک کمبل میں لپیٹ لیتا ہے
اور شاخِ بید کی ہریالی کو پامال کر دیتا ہے
اور پکی ہوئی فصلوں کو زمین پر گرا دیتا ہے
چڑھتا ہوا پانی، انسان کی آنکھوں کو مجروح کرنے والا
طاقتور سیلاب جو فصیلوں کو ڈھا دیتا ہے
اور روئیدگی کے چھتنار درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے
دیوانہ وار سیلاب، اس کی تیزیٔ رفتار سے سب چیزیں پراگندہ اور منتشر ہو جاتی ہیں"۔

یہی حال لُو کے تھپیڑوں اور آندھی کے طوفانوں کا ہے، جن کی ہلاکت خیزیوں سے ہر عراقی آج بھی پناہ مانگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سومیری دیوتاؤں میں سب سے قوی دیوتا انلیل ہے، طوفان اور سیلاب کا دیوتا۔

سومیریوں نے بڑے نامساعد حالات اور ناموزوں ماحول میں اپنی تہذیب کی بنیاد اس علاقے میں رکھی تھی۔ ان کے دیو مالائی عقیدے اور ادب پر ان چیزوں کا بہت گہرا اثر پڑا ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جس ملک اور سماج کا قدرتی ماحول عراق کی مانند ناخوشگوار اور غیر یقینی ہوگا وہاں کے عقیدے اور ادب میں قدرت کا جباری اور قہاری رُخ زیادہ نمایاں ہوگا اور انسان اپنی مجبوری اور بے بسی کو نوشتۂ تقدیر کے رنگ میں پیش کرے گا مگر یہ کلیہ فقط ان معاشروں پر صادق آتا ہے جن کی زندگی کا انحصار کھیتی باڑی کرنے یا درختوں کے پھل جمع کرنے پر ہے۔ وہ قدیم انسانی معاشرہ جس کا رزق جانوروں کے شکار سے وابستہ تھا اس کلیہ سے آزاد ہے۔ اسی طرح خالص صنعتی معاشرہ بھی قدرت کو اس رنگ میں نہیں دیکھتا ہے۔

اِن کدُو کی موت سے پیشتر تضاد کی نوعیت خارجی اور سماجی تھی چنانچہ گل گمیش نے اس تضاد کو قوت، جرأت اور عزم سے حل کیا۔ جب تک گل گمیش عملی انسان تھا کوئی طاقت خواہ وہ کتنی ہی بھیانک کیوں نہ ہو اسے ڈرا نہیں سکتی تھی کیونکہ "وہ دلیر، دانا اور دبنگ تھا۔" اس نے عروق کی دیواریں اور فصیلیں بنوائیں۔ شہر کو پشتوں سے مستحکم کیا۔ کیش کے فرماں روا کو اطاعت پر مجبور کیا۔ حمبابا کو ہلاک کر کے دیودار کے جنگل کو عروق کے علاقے میں شامل کیا اور ثورِ فلک کو جس نے ہزاروں باشندوں کی جان لی تھی مار ڈالا۔ مگر اِن کدُو کی ہلاکت کے بعد تضاد کی نوعیت داخلی اور ذہنی ہو جاتی ہے۔ گل گمیش موت سے ڈرتا ضرور ہے مگر وہ موت سے شکست ماننے کو تیار نہیں ہے۔ اس کی ہمت، خود اعتمادی اور عالی حوصلگی، موت کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر قبول کر لینے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ زندگی کو دوام بخش کر دم لے گا لہٰذا وہ حیاتِ جاوداں کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتا ہے۔ شجرِ حیات مل جائے تو زندگی اور موت کا ابدی تضاد حل ہو جائے۔ انسان امر بن جائے مگر شجرِ حیات کیا شے ہے؟ وہ کہاں ملتا ہے اور انسان کے ذہن میں اس کا تصور کہاں سے آیا؟

شجرِ حیات

شجرِ حیات کا تصوّر اس ابتدائی دَور کی یادگار ہے جب انسان فقط پھل پھول اور سبزیاں کھا کر زندگی بسر کرتا تھا۔ اشجار ہی اس کی حیات کے ضامن تھے اور اسے طاقت و توانائی بخشتے تھے۔ یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہا اور اشجار کی اہمیت اور افادیت انسان کے تحت الشعور میں اس طرح رَچ بس گئی کہ شجری دَور کے گزر جانے کے بعد بھی وہ اشجار کے تاثر سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس کا خیال آفریں ذہن اشجار کی تاثیر میں اضافہ ہی کرتا گیا اور اس نے اشجار سے وہ خواص بھی منسوب کر دیے جو ان میں موجود نہ تھے (چنانچہ آج بھی جڑی بوٹی اور سلاجیت بیچنے والے ان چیزوں سے ہر مرض کا علاج کرنے کا دعویٰ کرتے رہتے ہیں) درختوں کی پوجا ہونے لگی کیونکہ درخت دیوتاؤں کے مسکن قرار دیے گئے۔ رفتہ رفتہ درخت بجائے خود زندگی کی علامت بن گیا چنانچہ رِگ وید میں لکھا ہے کہ وِشوا کرما نے جو خالقِ کائنات ہے دنیا کو درخت سے بنایا۔ متھرا اس دیوتا (ایرانی) درخت کی چوٹی سے پیدا ہوا تھا اور مصریوں کا اوزائرس دیوتا درخت کے کھوکھلے تنے ہی میں دفن ہوا تھا۔ تب اس کو دوبارہ زندگی ملی تھی اور حضرت موسیٰ کے والدین نے ان کو (روایت کے مطابق) لکڑی کے صندوق میں بند کر کے دریائے نیل میں بہا دیا تھا۔ اس طرح ان کی جان بچی تھی۔ حضرت مسیحؑ سے بہت پہلے قدیم مصریوں اور دروزیوں میں لکڑی کی صلیب اسی وجہ سے زندگی کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ وہ درخت سے مشابہ ہوتی تھی۔ حضرت مسیحؑ کو بھی صلیب پر چڑھنے کے بعد ہی حیاتِ جاوداں عطا ہوئی تھی چنانچہ سٹراس برگ (جرمنی) کے ایک کلیسا میں حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہونے کی جو تصویر نقش ہے اس کی صلیب بالکل

درخت کی ہم شکل ہے۔ اسی طرح ایران کی پرانی تصویروں میں شجرِ حیات کثرت سے نظر آتا ہے۔ شجرِ حیات کا یہ موتیف ایرانی قالینوں میں تو اب تک رائج ہے۔

فلسطین کی پرانی قومیں بھی شجرِ حیات کے تصور سے بخوبی واقف تھیں چنانچہ انجیل کی کتاب پیدائش میں لکھا ہے کہ خداوند خدا نے آدم اور حوّا کو بہشتِ عدن میں رکھا اور "باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا"۔ اور آدم اور حوّا کو تنبیہہ کر دی کہ خبردار ان درختوں کو نہ چھونا اور نہ ان کا پھل کھانا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے مگر سانپ نے حوّا کو بہکا کر درخت کا پھل کھلا دیا اور حوّا نے یہ پھل آدم کو بھی کھلایا اور ان کی آنکھیں کھل گئیں اور انھیں اپنی عریانی پر شرم آنے لگی۔ خدا کو جب یہ معلوم ہوا کہ "انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا" تو اسے اندیشہ ہوا کہ "اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا اور باغِ عدن کے مشرق کی طرف کروبیوں کو اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کو رکھا کہ وہ زندگی کے درخت کی حفاظت کریں"۔

شجرِ حیات کا ذکر نئے عہدنامے میں بھی آیا ہے چنانچہ یوحنّا عارف کے مکاشفے میں خدا اپنے برگزیدہ بندوں سے وعدہ کرتا ہے کہ جو بداعمالیوں پر "غالب آتے ہیں اسے اس زندگی کے درخت میں سے جو خدا کے فردوس میں ہے پھل کھانے کو دوں گا"۔ خدا نے یوحنّا کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ "میں پیاسے کو آبِ حیات کے چشمے سے مفت پلاؤں گا"۔ یوحنّا عارفِ کامل تھے لہٰذا فرشتے نے انھیں آسمانی یروشلم کی سیر بھی کروائی اور "بلّور کی طرح چمکتا ہوا آبِ حیات کا دریا دکھایا جو خدا اور مسیحؑ کے تخت سے نکل کر اس شہر کی سڑک کے بیچ میں بہتا تھا اور دریا کے وار پار زندگی کا درخت تھا"۔

امر بننے کی یہ خواہش عراق اور فلسطین تک محدود نہیں ہے بلکہ بڑی عالمگیر خواہش ہے مثلاً ہندو دیومالا میں حیاتِ جاوداں امرت پینے سے حاصل ہوتی ہے جسے امرت مل جائے وہ امر ہو جائے چنانچہ کہتے ہیں کہ دنیا کی سب چیزیں سمندر کو متھنے سے پیدا ہوئیں سمندر کو متھنے کا کام دیوتاؤں اور راکششوں کے سپرد تھا جب سب چیزیں سمندر سے نکل چکیں تو دھنونتری مہاراج جو دیوتاؤں کے وید تھے امرت کو چاند کے پیالے میں لیے ہوئے سمندر سے نکلے۔ امرت کا پیالہ دیکھ کر سبھی دیوتا اور راکشش ان کی طرف لپکے۔ راہو نامی راکشش سب سے آگے تھا۔ اس نے پیالہ کو دھنونتری کے ہاتھ سے چھین کر منہ کو لگا لیا مگر ابھی امرت کا گھونٹ اس کے حلق سے نیچے نہ اترا تھا کہ دیوتاؤں نے اس کا سر قلم کر دیا (اس کا دھڑ مٹی میں مل گیا لیکن اس کا سر امر ہو گیا۔ تب سے راہو کا سر چاند کا پیچھا کیے ہوئے ہے۔ وہ چاند کو منہ میں رکھ لیتا ہے تو چاند گرہن لگ جاتا ہے مگر اس کی گردن کٹی ہوئی ہے اس لیے چاند دوسری طرف سے نکل جاتا ہے) امرت کا پیالہ راکششوں کے قبضے میں آ گیا تو وشنو مہاراج کو یہ فکر ہوئی کہ کہیں راکشش امرت پی کر امر نہ ہو جائیں۔ پس وہ ایک سندر ناری کے روپ میں ان کے بیچ میں آئے اور اپنے ناچ سے راکششوں کا من موہ لیا اور راکششوں کو امرت پینے کی سدھ نہ رہی۔ تب موقع پا کر وشنو نے امرت کا پیالہ راکششوں کے ہاتھ سے چھین لیا اور دیوتاؤں کے حوالے کر دیا۔

یہی آبِ حیات فارسی اور اردو ادب میں بھی ابدیت کی علامت بن کر داخل ہوا ہے۔ چنانچہ فارسی اور اردو کے ان اشعار کا مجموعہ اگر مرتب کیا جائے جن میں آبِ حیات کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو سکتا ہے۔ آبِ حیات کے قصّے کو غالباً سب سے پہلے فردوسی نے بڑی تفصیل سے نظم کیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ قصّہ قرآن شریف کے ان مفسرین

کے ذریعہ اسلامی دنیا میں رائج ہوا ہوگا جنھوں نے سورۂ الکہف کے "مرد نیک" کو حضرت خضر سے تعبیر کیا اور پھر آب حیواں کا قصہ سامی اور عراقی داستانوں سے لے کر خضر، سکندر اور آب حیواں کا وضعی قصہ گھڑ لیا حالانکہ قرآن شریف میں حضرت خضر کا نام یا تذکرہ کہیں نہیں آیا ہے۔ فردوسی کا سکندر بھی تاریخی سکندر نہیں ہے بلکہ افسانوی ہیرو ہے۔ وہ ہندوستان، مصر، حبشہ اور دوسرے مشرقی ملکوں کو فتح کرنے کے بعد شہر ہرُوم میں آتا ہے جہاں عورتیں حکومت کرتی ہیں۔ چند روز قیام کرنے کے بعد وہ لشکر سمیت مغرب کا رُخ کرتا ہے۔ راستے میں اس کا گزر ایک شہر میں ہوتا ہے، اور وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ اس علاقے میں قابلِ دید چیز کیا ہے۔ ایک پیر مرد اسے جواب دیتا ہے کہ:

یکے آب گیر است اناں سوئے شہر   کز آں آب کس را نہ دیدیم بہر
(شہر کے اس طرف ایک جھیل ہے   کہ ہم نے کسی کو اس میں سے پانی لیتے نہیں دیکھا)

کہ خورشیدِ تاباں چو آں جا رسید   براں ژرف دریا شود ناپدید
(کیونکہ سورج جب وہاں پہنچتا ہے   تو پانی کی گہرائی میں ڈوب جاتا ہے)

خرد یافتہ مردِ یزداں پرست   بدو در یکے چشمہ گوید کہ ہست
(ایک دانش مند بندۂ خدا کہتا ہے   کہ اس تاریکی میں ایک چشمہ ہے)

کشادہ سخن مرد با رائے و کام   ہمی آب حیوانش خواند بہ نام
(وہی عاقل اور سخن ور   اسے آب حیواں کہتا ہے)

چنیں گفت روشن دلِ پُر خرد   کہ ہر کآبِ حیواں خورد کے مُرد
(اور وہ یہ بھی کہتا ہے   کہ جو آبِ حیواں پی لے وہ کب مرتا ہے)

سکندر نے وہاں جانے کا عزم کیا۔ فوج کو شہر میں چھوڑا اور ایک رہبر کو ساتھ لے کر آبِ حیواں کی تلاش میں چل پڑا۔ اس رہبر کا نام خضر تھا۔ راستے میں خضر نے سکندر کو سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی:۔

اگر آبِ حیواں بہ چنگ آوریم   بسی بر پرستش درنگ آوریم
(اگر ہمیں آبِ حیواں مل گیا   تو ہم عبادت میں کوتاہی کریں گے)

نمیرد کسے کو رواں پرورد   بہ یزداں پناہد ز راہِ خرد
(جو اپنی رُوح کی پرورش کرے   وہ از روئے عقل خدا کی پناہ میں چلا جاتا ہے)

مگر سکندر نہ مانا۔ تب خضر نے کہا کہ میرے پاس دو مہرے ہیں کہ پانی دکھاؤ تو اندھیری رات میں آفتاب کی مانند چمکتے ہیں:۔

یکے را تو برگیر و در پیش باش   نگہبانِ جان و تنِ خویش باش
(ان میں سے ایک تو لے کر آگے چل   اور اپنی جان و تن کی نگہبانی خود کر)

دِگر مہرہ باشد مرا شمعِ راہ   بہ تاریکی اندر شوم با سپاہ
(دوسرا مہرہ مجھے راستہ دکھائے گا   میں تاریکی میں معہ فوج کے چلوں گا)

یہ لوگ دو دن اور دو رات چلتے رہے۔ کسی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا، راستہ بہت تاریک تھا۔

سد بگر بہ تاریکی اندر دو راہ	پدید آمد و گم شد از خضر شاہ
(پھر اس تاریکی میں ایک دوراہہ ملا	اور بادشاہ کا ساتھ خضر سے چھوٹ گیا)
پیمبر سوئے آب حیواں کشید	سر زندگانی بہ کیواں کشید
(نتیجہ یہ ہوا کہ خضر تو آب حیواں کی راہ پر چل پڑے	اور ان کی زندگی جاوداں ہو گئی)
براں آب روشن سر و تن بہ شست	نگہ دار بجز پاک یزداں نہ جست
(انھوں نے اس شفاف پانی سے پیا اور جسم دھویا	اور خدا کے سوا کسی کو اپنا محافظ نہ بنایا)
بخورد و بیاسود و برگشت زود	ستائش ہمی آفریں بر فزود
(پانی پیا، آرام کیا اور بہت جلد واپس آگئے	اور خدا کی تعریف میں اضافہ کرتے رہے)

اور سکندر راستہ بھول کر کہیں اور جا نکلا اور آب حیواں سے محروم ہو گیا۔

موت سے نجات پانے کی یہ آرزو مشرق بعید کے ملکوں میں بھی ملتی ہے مثلاً چین کے قدیم فلسفی کو ہونگ کے بارے میں کہتے ہیں کہ اپنی عمر کا آخری زمانہ اس نے امرت کی گولیاں تیار کرنے میں بسر کیا۔ اس کا نسخہ بہت آسان تھا۔

"ڈیڑھ سیر اصلی شنگرف لو اور اسے آدھ سیر سفید شہد میں خوب حل کرو۔ اس مرکب کو دھوپ میں سکھاؤ۔ پھر آگ پر رکھ کر اسے اتنا نرم کرو کہ اس کی گولیاں آسانی سے بن سکیں۔ یہ گولیاں پٹو (سن) کے بیج کے برابر ہوں۔ ہر روز دس گولیاں صبح سویرے کھائی جائیں۔ ایک سال کے اندر سفید بال سیاہ ہو جائیں گے، نئے دانت نکل آئیں گے اور جسم میں توانائی آجائے گی۔ اگر کوئی بوڑھا آدمی یہ دوا زیادہ عرصہ تک استعمال کرے تو وہ جوان ہو جائے گا اور جو شخص یہ گولیاں تمام عمر باقاعدگی سے کھائے گا وہ کبھی نہ مرے گا۔"

اور یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے کہ جوان پانسے والیوں (JUAN PONCE DE LEON) جس نے فلوریڈا کو دریافت کیا "بی می نی" یعنی چشمہ شباب کی تلاش میں وہاں گیا تھا۔

اِن کِدُو کی موت نے سُومیر کے سب سے بڑے سُورما کو احساسِ مرگ میں مبتلا کر دیا ہے۔ "مجھے چین کیسے آئے۔ مجھے سکون کیسے نصیب ہو، میرا سینہ تو رنج سے لبریز ہے۔ میں مروں گا تو میرا انجام بھی وہی ہوگا جو میرے بھائی کا ہوا۔ موت کے خوف سے میں مارا مارا پھرتا ہوں" مگر گل گمیش مایوس نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دیوتاؤں نے ایک انسانِ فانی کو حیاتِ جاودانی بخشی تھی۔ اس کا نام اُتناپشتیم تھا۔ وہ ارضِ دلمون میں گلشنِ شمس ——— میں رہتا تھا لہٰذا گل گمیش اُتناپشتیم کے پاس جانے کا عزم کرتا ہے تاکہ اس سے مل کر حیاتِ ابدی کا راز معلوم کرے۔

گل گمیش راستے میں جنگلی شیروں سے لڑتا ہے۔ کوہِ مشو کے محافظوں کو جو آدھے بچھو اور آدھے انسان ہیں پہاڑ کا پھاٹک کھولنے پر مجبور کرتا ہے اور ۲۴ کوس کی تاریکی کو عبور کر کے جب وہ شمس کے سامنے آتا ہے تو شمس اس سے کہتا ہے کہ "تجھے وہ زندگی

"کبھی نہ ملے گی جس کو تو تلاش کر رہا ہے۔" گل گمیش دیوتاؤں کے اس فیصلے سے ابتدا ہی سے واقف تھا کیونکہ اِن کِڈُو نے پہلی ملاقات ہی میں اسے بتا دیا تھا کہ "تیری تقدیر میں شاہی لکھی ہے مگر حیاتِ ابدی تیری قسمت میں نہیں ہے۔" مگر وہ ہمت ہارنے والا انسان نہیں ہے چنانچہ وہ شمس کو جواب دیتا ہے کہ:

بیابان میں اتنی دُور تک مارے مارے پھرنے
اور اتنی سختیاں اٹھانے کے بعد
کیا میں سو جاؤں؟
اور زمین کو اجازت دے دوں
کہ وہ میرا سر ہمیشہ کے لیے ڈھانپ دے؟
میری حالت مُردے سے بہتر نہیں ہے
پھر بھی مجھے سورج کی روشنی دیکھنے دے

کوہِ تاریک سے نکلنے کے بعد گل گمیش کی مڈبھیڑ ایک جوان عورت سے ہوتی ہے۔ گل گمیش اپنا دکھڑا اس سے بھی روتا ہے۔

"اپنے بھائی کے انجام کے سبب مجھے موت سے ڈر لگتا ہے
لیکن شراب بنانے والی جوان عورت
اب کہ میں نے تیرا چہرہ دیکھ لیا ہے
مجھے موت کا چہرہ نہ دیکھنے دے
کیونکہ میں اس سے خوف زدہ ہوں۔"

سِدُوری کہتی ہے کہ "تو جس زندگی کی تلاش میں ہے وہ تجھے کبھی نہ ملے گی کیونکہ دیوتاؤں نے انسان کی قسمت میں موت لکھ دی ہے اور حیاتِ ابدی کو اپنے لیے مخصوص کر لیا ہے۔ پس اے گل گمیش اپنے شکم کو اچھی چیزوں سے بھر، دن رات عیش کر، خوشیاں منا، زرق برق لباس پہن اور انجام کی فکر چھوڑ دے۔" گل گمیش کے لیے یہ بڑی آزمائشوں کا وقت تھا۔ ایک طرف شباب، شراب اور عیشِ چند روزہ کی دعوت تھی، دوسری طرف حیاتِ ابدی کی کشش تھی۔ گل گمیش اس آزمائش میں بھی پورا اترا۔ اس نے سدوری کا مشورہ رد کر دیا۔ غرض بڑی مشکل سے وہ اُتناپشتیم کے پاس پہنچتا ہے۔ اس سے سارا ماجرا بیان کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ "جس زندگی کی مجھے تلاش ہے وہ کیونکر ملے"

اُتناپشتیم اس کے جواب میں اسے فنا اور تغیر کا فلسفہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہے:

"دنیا میں کسی شے کو ثبات نہیں ہے
کیا ہم مکان یہ سمجھ کر بناتے ہیں کہ وہ ہمیشہ قائم رہے گا؟
کیا ہم معاہدے پر مہر اس خیال سے لگاتے ہیں
کہ وہ دوامی ہو جائے گا؟

کیا بھائی اپنی موروثی جائداد کو آپس میں اس لیے بانٹتے ہیں
کہ وہ سدا محفوظ رہے گی؟
کیا دریا میں سیلاب کا موسم ہمیشہ رہتا ہے؟
درباری ہوں یا باناری دونوں کی تقدیر میں فنا ہے۔"

لیکن گل گمیش کو یہ دلیلیں مطمئن نہ کر سکیں۔ اس نے اُتناپشتیم سے پوچھا کہ تو بھی تو مجھ جیسا انسان تھا، پھر تجھے حیاتِ جاوداں کیسے نصیب ہوئی اور اگر تو ابدی ہو سکتا ہے تو میں ابدی کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں اُتناپشتیم سیلابِ عظیم کا قصہ بیان کرتا ہے۔ یہ قصہ سیلابِ نوح کے قصے سے بہت مشابہ ہے۔ قصہ سُنا کر وہ گل گمیش سے پوچھتا ہے کہ میری پشت پناہی تو دیوتاؤں نے کی تھی چنانچہ انہی کے طفیل میری جان بچی اور انہی نے مجھے حیاتِ ابدی عنایت کی لیکن تیری پشت پر کون دیوتا ہے۔ یہ دلیل گل گمیش کو لاجواب کر دیتی ہے مگر مطمئن وہ اب بھی نہیں ہے لہٰذا اُتناپشتیم نے اس سے کہا کہ اگر تو چھ دن اور سات راتیں نیند پر قابو پا لے اور جاگتا رہے تو تیری مُراد پوری ہو جائے گی۔ اُتناپشتیم کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ انسان اتنا کمزور ہے کہ موت تو درکنار نیند کے غلبے سے بھی نہیں بچ سکتا۔ گل گمیش یہ شرط پوری نہ کر سکا۔ "نیند کی دُھند دُھنکے ہوئے نرم اُون کی مانند اس پر لہرانے لگی" اور گل گمیش حیاتِ جاوداں سے محروم ہو گیا مگر اُتناپشتیم کی بیوی نے اس پر ترس کھایا اور اپنے شوہر سے کہا کہ اس بدنصیب کو کوئی چیز تو بطور یادگار دے دو تاکہ اس کی اشک شوئی ہو (یہ امر غور طلب ہے کہ گل گمیش ابتدا ہی سے عورت کی سرپرستی اور اطاعت کا مخالف ہے مگر آخر میں عورت ہی اس پر شفقت کرتی ہے) اُتناپشتیم گل گمیش کو شجرِ شباب کا پتہ بتاتا ہے جو کہ تہہ میں اُگتا ہے۔ گل گمیش یہ بوٹا حاصل کر لیتا ہے مگر خود نہیں کھاتا بلکہ وطن کے بڈھوں کے لیے لے جانا چاہتا ہے لیکن راستے میں ایک دن وہ باؤلی میں نہا رہا ہوتا ہے کہ ایک سانپ باؤلی میں سے نکلتا ہے اور جوانی کے پودے کو چٹ کر جاتا ہے اور گل گمیش ناکام و نامراد وطن واپس آ جاتا ہے اور کچھ عرصہ بعد مر جاتا ہے۔

سانپ کے بارے میں دنیا کی قریب قریب سبھی پُرانی قوموں (ہندوؤں، میکسیکو اور امریکہ کے ریڈ انڈینوں وغیرہ) میں عام عقیدہ یہی ہے کہ وہ کبھی نہیں مرتا اور ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ وہ ہر سال کینچلی اتار دیتا ہے تو کینچلی کے ساتھ اس کا بڑھاپا بھی دور ہو جاتا ہے۔

ہیرو ورمتھ

گل گمیش کی داستان ایک ہیرو متھ ہے۔ اس قسم کے ہیرو متھ قریب قریب ہر پُرانی قوم اور ہر زبان میں موجود ہیں مثلاً فردوسی کے شاہنامے میں رستم، نوشیرواں اور سکندر وغیرہ۔ ہومر کی اوڈیسی میں ہیراکلیس۔ مہابھارت میں ارجن، بھیم اور کرشن مہاراج اور راماین میں رام اور لچھمن۔ اُردو ادب کا دامن بھی اس دیومالائی خزانے سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ امیر حمزہ اور حاتم طائی کی داستانیں ہیرو متھ کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ پنجاب کی لوک کہانیوں میں راجہ رسالو کا کردار بھی ہیرو متھ ہی ہے۔ ان سب فرق قطری داستانوں میں زمان و مکاں کے فرق کے باوجود بہت سی باتیں مشترک ہیں اور یہ وہی باتیں ہیں جن سے متھ اور متھ کے کرداروں کی تشکیل ہوتی ہے۔

متھ قدیم انسان کا فلسفہ حیات و کائنات ہے۔ قرونِ وسطیٰ اور اس سے پیشتر کا انسان مظاہرِ قدرت کی تخلیق اور ان کے اندازِ عمل و تغیر کی تشریح متھ کے ذریعے سے کرتا تھا۔ متھ ہی کی مدد سے وہ تخریبی طاقتوں کو خیالی طور پر تسخیر کرتا تھا اور مہربان طاقتوں کی

عنایت حاصل کرتا تھا۔ متھ قدیم انسان کی پروازِ تخیل کی معراج ہے۔ اس کی سماجی آرزوؤں کا رنگین مرقع ہے۔ اس کی تشنہ تمناؤں کی ذہنی تکمیل ہے۔ متھ اسے جہادِ زندگانی میں اعتماد، عزم اور قوتِ عمل عطا کرتا تھا۔ متھ کی دنیا اس کی خواہشوں کی تابع ہوتی تھی۔ متھ اس کی زندگی کو خوشگوار، بامعنی اور بامقصد بناتا تھا۔ اس کی جدوجہد کی راہیں متعین کرتا تھا اور ان راہوں کو ہموار کرتا تھا۔ متھ اس کے ہر ارادے کو پورا کر دیتا تھا اور اس ارادے کے راستے میں جو رکاوٹیں ہوتی تھیں ان کو خیالی طور پر دور کر دیتا تھا۔ سماجی اعتبار سے دیکھا جائے تو متھ انسان کا بہت کارآمد حربہ تھا۔

متھ کی نوعیت خوابوں سے بہت ملتی جلتی ہے۔ جس طرح ہمارے خواب ہماری تمام ممکن اور محال خواہشوں کو حقیقت کے روپ میں پیش کرتے ہیں اسی طرح متھ فوقِ فطرت باتوں کو بھی فطری پیکر میں پیش کرتا ہے۔ خواب کی مانند متھ میں بھی عجوبہ اور انہونی باتیں روزمرہ کی چیزیں بن جاتی ہیں۔ اساطیری داستانوں میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی۔ مُردے زندہ ہو سکتے ہیں۔ زندہ آدمی پتھر کا ہو کر دوبارہ انسان بن سکتا ہے۔ انسان کاٹھ کے گھوڑے یا سی مرغ کی پیٹھ پر یا اُڑن کھٹولے میں بیٹھ کر دُور دراز کا سفر پلک جھپکتے طے کر لیتا ہے۔ سلیمانی ٹوپی اوڑھ کر لوگوں کے درمیان سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے اشارے پر پہاڑ سنگریزے ہو جاتے ہیں اور سمندر کے اندر خشک راستہ نکل آتا ہے۔ اس کا عصا اژدہا بن جاتا ہے۔ اژدہوں، درندوں اور گزندوں کو وہ یوں ہلاک کر دیتا ہے جس طرح ہم مکھی مچھر ہلاک کرتے ہیں۔ جن پری اور دیو اس کے تابع ہوتے ہیں اور اس کے حکم سے چشم زدن میں عالی شان محل تعمیر کر دیتے ہیں اسے تائید غیبی حاصل ہوتی ہے چنانچہ غیبی طاقتیں ہر مشکل وقت پر اس کے آڑے آتی ہیں۔

دنیا کی سبھی زبانوں میں کہ معاشرے کے عہدِ طفلی کی تخلیق ہیں ایسی کہاوتیں بکثرت ملیں گی جن سے متھ اور خواب کی بنیادی خصوصیات بخوبی واضح ہو جاتی ہیں مثلاً ہم کہتے ہیں کہ "رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کا" یا "بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں" یہ کہاوتیں اس سچائی پر دلالت کرتی ہیں کہ خواب میں ہم لاشعوری طور پر اپنی اُن دبی ہوئی خواہشوں کی تکمیل کرتے ہیں جو بیداری میں پوری نہیں ہوتیں۔ متھ بھی قدیم انسان کے لیے سنہری زندگی کا سنہرا خواب تھا۔ جس طرح مفلس آدمی سوتے جاگتے دولت کے خواب دیکھتا ہے، محکوم انسان آزادی کے خواب دیکھتا ہے، بھوکا لذیذ کھانوں کے خواب دیکھتا ہے، اسی طرح قدیم انسان عالمِ بیداری میں ان چیزوں کے خواب دیکھا کرتا تھا جن سے وہ محروم تھا۔ دونوں میں بس اتنا فرق ہے کہ خواب فقط ہماری انفرادی خواہشوں کی تکمیل کا پرتو دکھاتے ہیں اور متھ سماج کی مجموعی خواہشوں کی منظر کشی کرتے ہیں۔ اسی لیے متھ کو قوم کے اجتماعی خواب سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

خواب کی مانند متھ کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ متھ کا اندازِ اظہار تصویری ہوتا ہے۔ جس طرح خواب میں انسان کا لاشعور قوتِ باصرہ کے علاوہ دوسرے حواس سے کم کام لیتا ہے اسی طرح متھ میں بھی الفاظ اور فقرے تصویریں بناتے ہیں اور پڑھنے یا سُننے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ سینما کے پردے پر فلمی تصویریں دیکھ رہا ہے یا کسی نگار خانے کی سیر کر رہا ہے۔ چنانچہ اساطیری داستانوں کا تاثر بھی تصویری ہوتا ہے مثلاً گل گمیش کی داستان میں ہر واقعہ تصویروں کا ایک مرقع ہے۔ اس داستان کو کہیں سے پڑھیے، آپ کے ذہن میں واقعات کی ایک تصویر کھنچ جائے گی۔ عروق کے لوگ گل گمیش کی عیش کوشیوں اور سخت گیریوں سے بہت نالاں ہیں۔ سومیری شاعر اس ذہنی کیفیت کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے:-

"عمائدینِ شہر اپنے دیوان خانوں میں ملول بیٹھے تھے

ان کو شکوہ تھا کہ گل گمیش مقدس طبل کو اپنی تفریح کے لیے بجاتا ہے
گل گمیش کسی بیٹے کو باپ کے پاس نہیں رہنے دیتا
گل گمیش کی ہوس کسی کنواری لڑکی کو عاشق کے پہلو میں نہیں بیٹھنے دیتی"

اِن کیدُو جنگلی انسان ہے۔ اس کے سراپے کی نقاشی ان لفظوں میں کی گئی ہے:۔

"اس کے سر کے بال عورتوں کی مانند تھے
ان میں اناج کی دیوی نسابا کی طرح لہریں اٹھتی تھیں
اور اس کا بدن مویشیوں کے دیوتا سموقان کی طرح چٹائی نما بالوں سے ڈھکا تھا
اِن کیدُو غزالوں کے ہمراہ گھاس چرتا
اور جنگلی جانوروں کے ساتھ چشمے پر کودتا پھرتا
اور چوپایوں کے ساتھ پانی میں چہلیں کرتا رہتا"

اس داستان میں مکالموں کی کثرت ہے مگر یہ مکالمے بھی تصویری ہیں۔ حتیٰ کہ مکالمے کے آغاز میں جہاں دورِ حاضر کا داستان گو "اس نے کہا" کا فقرہ استعمال کرے گا وہاں تصویری داستان گو "اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا" کا فقرہ استعمال کر کے اس بات کو بھی تصویر کا رنگ دیتا ہے۔

داستان میں جہاں کہیں خواب بیان ہوا ہے وہاں تصویر کشی کا حسن اور نکھر آیا ہے مثلاً گل گمیش اِن کیدُو کی آمد سے پیشتر خواب دیکھتا ہے اور اپنی ماں سے یوں بیان کرتا ہے:۔

"نوجوان سورما میرے گرد جمع ہیں
اور میں آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ میں چل رہا ہوں
اچانک انُو کے جوہر کا ایک شہابِ ثاقب آسمان سے گرا
اور میں نے اُسے اٹھانا چاہا
مگر وہ اتنا بھاری تھا کہ میں اُسے اٹھا نہ سکا
عمائدینِ عروق شوقِ دید میں اس کے گرد حلقہ کیے ہوئے تھے
اور شہری ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے
اور اُمرا اس کے قدم چوم رہے تھے"

اظہارِ خیال کا یہ تصویری انداز قدیم انسان کے ذہنی ارتقا کے عین مطابق تھا کیونکہ اس کا ذہن فقط ٹھوس چیزوں کا ادراک کر سکتا تھا حتیٰ کہ وہ تجریدی رشتوں کو بھی تصویر کی شکل دے دیتا تھا۔ چنانچہ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ ہمارے پرکھوں کی فنی تخلیق کے ابتدائی نمونے سب کے سب تصویری ہیں مثلاً مشرق میں جھیل بیکال سے لے کر مغرب میں فرانس تک اور شمال میں سویڈن سے لے کر جنوبی افریقہ تک غاروں اور پہاڑ کی چٹانوں پر جانوروں کی ہزاروں رنگین اور سادی تصویریں دستیاب ہوئی ہیں جو چالیس پچاس ہزار برس پرانی ہیں یہ تصویریں

دراصل ہماری سب سے پہلی کتابیں ہیں جن میں شکاری دور کے انسان نے اپنے قبیلے یا گروہ کے لوگوں کو مسائلِ حیات اور ان کے حل سے آگاہ کیا ہے۔ یہ تصویریں بڑی معنی خیز ہیں اور اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی ہم ان سے قدیم انسان کے مفہوم کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے ابتدائی رسم الخط بھی تصویری ہوتے تھے مثلاً اگر کتا بتانا ہو تو کتے کی تصویر بنا دیتے تھے۔ اگر مرد یا عورت بتانا ہو تو مرد یا عورت کی تصویر بنا دیتے تھے۔ گھر بتانا ہو تو گھر کی تصویر بنا دیتے تھے۔ دوستی کا رشتہ ظاہر کرنا ہوتا تھا تو دو ہاتھ مصافحہ کرتے بنا دیے جاتے تھے۔ دشمنی کا رشتہ ظاہر کرنا ہو تو دو آدمیوں کو نیزہ یا تیر کمان لیے ایک دوسرے کے مقابل کھڑا ہوا دکھاتے تھے۔ رسم الخط کی شکلیں گو بدل چکی ہیں مگر تصویری علامتیں ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہیں مثلاً ترازو ہنوز عدل کی علامت ہے۔ اظہارِ خیال کا یہ تصویری انداز بڑا اثر انگیز ہوتا تھا۔ چنانچہ آج بھی ہم جب کسی شاعر کے کلام کی تعریف کرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ اس نے الفاظ کے ذریعے جذبات و احساسات کی تصویر کھینچ دی ہے۔

ہیرو متھ تین چیزوں سے مل کر بنتا ہے۔ اوّل ہیرو، دوئم مہم اور سوئم شجرِ مراد۔ ہیرو وہ قوت ہے جس کے وسیلے سے متھ اپنی تشنہ آرزوؤں کی تکمیل کرتا ہے۔ مہم وہ شرطیں، رکاوٹیں، دشواریاں اور مخالف طاقتیں ہیں جو ہیرو اور اس کے مقصد کے درمیان حائل ہوتی ہیں۔ متھ کے اندر وہ اژدہا، دیو، جادوگر اور دوسری بھیانک شکلوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ شجرِ مراد وہ مقصد ہے جس کے لیے مہم اختیار کی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ مہموں کو سر کرنا اور شجرِ مراد تک پہنچنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے حوصلے، جرأت اور ہوشیاری کی ضرورت رہتی ہے لہٰذا ہیرو کی بڑائی کو ناپنے کا پیمانہ یہی ہے۔ جو ہیرو جتنا بڑا ہوگا اس میں یہ خصوصیات اتنی ہی زیادہ ہوں گی مگر ہیرو ایک فرد نہیں ہوتا بلکہ پورے معاشرے کی قوتِ ارادی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے کارناموں کی اہمیت ذاتی نہیں بلکہ سماجی ہوتی ہے۔ اس کا تعلق کسی ورائے شخصی واقعہ کی اجتماعی معنویت سے ہوتا ہے۔ اس کی خواہشیں، اس کے اضطرابات و ہیجانات اور اس کی سعوبتیں روحِ عصر کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے متھ کے ہیرو اور "انسانِ کامل" (SUPER MAN) میں بنیادی فرق ہے۔ انسانِ کامل کا نظریہ تاریخ کے اہم واقعات کو — خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی اور روحانی — افراد (بادشاہ، سیاسی لیڈر، فوجی جنرل یا پیر مرشد) کے ذاتی اعمال و رجحانات کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہیرو کی زندگی کے انفرادی واقعات ورائے شخصی اور اجتماعی حقیقتوں کا پرتو ہوتے ہیں۔ متھ اپنے ہیرو کی نجی زندگی کی تفصیلات میں نہیں جاتا بلکہ انہی پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے جو ازلی (ARCHE TYPAL) نمائندہ ہوتے ہیں۔

ہیرو متھ اَبوی نظامِ معاشرہ کی تخلیق ہیں چنانچہ سبھی دیو مالائی داستانوں کے ہیرو مرد ہوتے ہیں مگر ان کی مردانگی کئی مدارج سے گزری ہے۔ ہیرو اَموی نظام اور اس کے اثر سے جتنا قریب ہوگا مردانگی کا جوہر اس میں اسی نسبت سے کم ہوگا اور جو ہیرو اَموی نظام اور اس کے اثر سے جتنا دُور رہوگا جوہرِ مردانگی اس میں اسی نسبت سے زیادہ ہوگا لیکن اَموی نظام سے ہیرو کی یہ قربت یا دُوری زمانی نہیں بلکہ کیفیتی ہوتی ہے۔ اَموی نظام سے متاثر ہونے والے ہیرو میں شعور لاشعور کے تابع ہوتا ہے۔ اس پر نسوانیت کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ قوتِ عمل سے قریب قریب محروم ہوتا ہے۔ اس کی زندگی عورت کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ اس کی مثال چھوٹے بچوں کی سی ہے جو ماں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتے ہیں، اسی کی مرضی پر چلتے ہیں اور ان کی اپنی کوئی انفرادیت یا ذاتی شخصیت

نہیں ہوتی۔ اندر سبھا کا ہیرو گلفام اور مثنوی سحر البیان کا ہیرو بے نظیر ایسے ہی کردار ہیں وہ دراصل برائے نام ہیرو ہیں۔

سبز پری گلفام نامی ایک کم سن شہزادے پر عاشق ہوتی ہے جو بام پر سو رہا ہے۔ وہ شعورِ خوابیدہ رکھنے والے اس صاحبزادے کو اپنے گھر اٹھوا منگواتی ہے اور انھیں لاڈلا کہہ کر جگاتی ہے۔

سوتے ہو کیا بے خبر چھوڑ کے تم گھر بار
آنکھیں کھولو لاڈلے نیند سے ہو ہوشیار

شہزادہ جاگتا ہے تو اسے اجنبی ماحول اور اجنبی عورت کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے مگر ان نئے حالات میں اس کا طرزِ عمل کسی دلیر اور پختہ کار نوجوان کا سا نہیں ہوتا بلکہ وہ بچوں کی طرح گھر والوں کے لیے روتا اور فریاد کرتا ہے اور سبز پری اسے یوں دلاسا دیتی ہے جیسے ماں بچے کو دلاسا دیتی ہے۔

سر پہ آنکھوں پہ کلیجے پہ بٹھاؤں تجھ کو — آمری جان گلے سے میں لگاؤں تجھ کو
دل و جاں سے مجھے بھاتی ہیں ادائیں تیری — پاس لا چاند سا منہ لے لوں بلائیں تیری

شہزادہ گلفام کی ضدیں بھی بچوں کی سی ہیں۔ وہ راجہ اندر کے دربار کا منظر دیکھنا چاہتا ہے۔ سبز پری ایک دانا اور تجربہ کار عورت کی مانند اسے سمجھاتی ہے کہ یہ خیال دل سے نکال دو مگر گلفام اپنی ضد پر قائم رہتا ہے۔ سبز پری اسے اپنے ہمراہ لے جاتی ہے راجہ اندر کو گلفام کے آنے کی خبر ہو جاتی ہے اور وہ شہزادے کو کنوئیں میں بند کر دیتا ہے۔ پوری داستان میں گلفام کا عدم وجود دونوں برابر ہیں۔ یہی کیفیت مثنوی سحر البیان کے ہیرو شہزادہ بے نظیر کی ہے۔ جس وقت ماہ رخ پری اسے اٹھا لے جاتی ہے تو اس کی عمر بارہ برس کی ہے۔

زبس تھا وہ لڑکا نہ سمجھا ابھی کچھ
ہوا کچھ دلیر اور حیران بھی کچھ

گلفام راجہ اندر کے حکم سے کنوئیں میں قید ہوتا ہے اور شہزادہ بے نظیر کو ماہ رخ پری، بدرِ منیر کے عشق کی پاداش میں کنوئیں میں قید کر لیتی ہے۔ غرض دونوں ہی مجہول اور بے عمل ہیرو ہیں۔ عشق میں وہ پہل نہیں کرتے بلکہ پریاں ان پر عاشق ہوتی ہیں اور یہ پریاں ان کے ساتھ اس طرح پیش آتی ہیں جس طرح ماں اپنے کم سن لڑکے کے ساتھ پیش آئے۔

دوسری قسم ان ہیروؤں کی ہے جن کا شعور بیدار ہو چکا ہے مگر وہ ہنوز لاشعور کے اثر میں ہیں۔ وہ سنِ شعور کو پہنچنے کے باوجود عورت کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ امومی نظام کی گرفت ڈھیلی ہو چکی ہے مگر بندھن ابھی تک ٹوٹے نہیں ہیں۔ وہ دلیر بھی ہوتے ہیں اور مہم کی سختیوں سے ڈرتے بھی نہیں مگر ان میں جرأت اور جوہرِ مردانگی کی کمی ہوتی ہے۔ ان کا عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں عورت کہیں زیادہ صاحبِ عزم و حوصلہ، کہیں زیادہ دلیر ہوتی ہے۔ وہ حصولِ مقصد کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے بھی گریز نہیں کرتی۔ اسے نہ اپنی بدنامی کی پروا ہوتی ہے اور نہ موت کا ڈر۔ پنجاب کی کلاسیکی داستانوں میں عورت مرد کے کردار کا یہ فرق بہت واضح ہے۔ ہیر کا کردار رانجھا سے کہیں زیادہ عظیم کردار ہے۔ وہ سماج کی مقدس اور مروجہ قدروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی۔ احتیاط اور مصلحت کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے اور قوتِ ارادی اور قوتِ عمل میں رانجھا سے بھی دو قدم آگے ہے سسی پنوں

اور سوہنی مہینوال میں بھی ہیروئن کو ہیرو پر نمایاں فوقیت حاصل ہے۔ عاشقوں کے سرتاج میاں مجنوں کا بھی یہی حال ہے۔ان کی دشت نوردی اور آبلہ پائی دراصل راہِ عمل سے فرار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان میں شجرِ مراد کو حاصل کرنے کی قوت اور صلاحیت بالکل نہیں ہے۔ اس قسم کے تمام ہیروؤں کو ہم اُموی نظام اور اَبوی نظام کے درمیانی اور عبوری دور کا نمائندہ کہیں گے۔ اس عبوری دور میں شعور اور لاشعور کی کشمکش بڑی شدت اختیار کر جاتی ہے شعور لاشعور یز ابوی نظام اُموی نظام پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے مگر شعور میں ابھی اتنی طاقت نہیں آئی ہے کہ وہ لاشعور کو مکمل طور پر اپنے تابع کرلے۔ دراصل ابھی لاشعور کا پلڑا بھاری ہے۔ ابھی اُموی نظام کو فوقیت حاصل ہے۔

کچھ عرصہ گزرا لاہور کے ایک اخبار میں کسی نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ مشرق کی اکثر رومانی داستانوں کے ناموں کی ابتدا عورت سے کیوں ہوتی ہے مثلاً شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سسّی پنوں اور سوہنی مہینوال میں ہیروئن کا نام ہیرو سے پہلے کیوں آتا ہے بہت ممکن ہے کہ اس کا باعث فقط صوتی روانی ہو مگر ان داستانوں کی اصل نوعیت پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ہیرو دراصل عورت ہے اور مرد کا کردار اس سے کم رتبہ ہے یعنی ان داستانوں پر اُموی نظام کا غلبہ ہے اور اسی وجہ سے عورت کو مرد کے کردار پر فوقیت ملی ہے کیونکہ اُموی نظام میں مرد کی حیثیت ثانوی ہوتی تھی۔

ہیرو کی تیسری قسم وہ ہے جس میں شعور لاشعور پر مکمل فوقیت حاصل کرلیتا ہے۔ ہیرو اُموی نظام اور اس کے اقدار کی گرفت سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے۔ اب وہ عورت کی اطاعت اور فرماں برداری نہیں کرتا بلکہ عورت اس کی تابع ہوتی ہے۔ ہیرو کا جوہر مردانگی اب پورے عروج پر ہے۔ اس کا شعور اب بالکل بیدار ہے۔ اس کی ہر مہم لاشعور پر شعور کی فتح کو اور مستحکم کرتی ہے۔ اس کی مردانہ شخصیت کو اور اُبھارتی ہے، اُموی نظام کے باقی ماندہ اثرات کو زائل کرتی ہے اور اَبوی نظام کی قدروں کو تقویت بخشتی ہے۔ اب وہ نسوانی آزمائشوں کے جال میں نہیں پھنس سکتا۔ اب کوئی شے اسے نخلِ مراد تک پہنچنے اور اپنی خواہش پوری کرنے سے نہیں روک سکتی۔ گل گمیش، ہراکلیس، رستم، سکندر، راجہ رسالو اور حاتم طائی ایسے ہی ہیرو ہیں۔ وہ ہیرو منتہٰی کی معراج ہیں۔

ہیرو سورج کے قبیلے کا فرد ہے۔ سورج جو شعور ہے، علم ہے، روشنی اور زندگی ہے چنانچہ آرین دیومالا کے اکثر ہیرو "سورج بنسی" ہوتے ہیں کیونکہ سورج دیوتا نے ان کی ماں کے ساتھ صحبت کی تھی۔ گل گمیش بھی سورج بنسی ہے لہٰذا شمس دیوتا ہر نازک موقع پر گل گمیش کی حمایت اور حفاظت کرتا ہے۔ گل گمیش کی ہر التجا منظور کرتا ہے، اسے نیک مشورے دیتا ہے اور اسے تاریکی سے نکالتا ہے۔ سورج ہیرو کی علامت ہے۔ سورج جو ہر صبح تاریکی کے بطن سے نمودار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتا جاتا ہے مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتا ہے اپنی موت سے بھی قریب تر ہوتا جاتا ہے تا آنکہ شام ہو جاتی ہے اور اس کا سفینۂ حیات مغرب کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ دیومالائی ہیرو بھی اسی طرح ماں کے بطن سے جو تاریک ہے پیدا ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ ماں کے تسلط سے آزاد ہوتا جاتا ہے۔ اس کا شعور بیدار ہوتا جاتا ہے۔ کامیابیاں اس کا قدم چومتی رہتی ہیں مگر آخرکار اس کا نقطۂ عروج آپہنچتا ہے اور آفتاب کی مانند اسے بھی شامِ زندگی کا خوف ستانے لگتا ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتا لیکن اس کا ہر قدم اسے موت سے قریب تر کرتا جاتا ہے۔ گل گمیش اُتناپشتیم سے شجرِ حیات کا طالب ہوتا ہے۔ سکندر خضر سے آبِ حیواں کی راہ پوچھتا ہے۔ گل گمیش کو شجرِ حیات تو نہیں ملتا البتہ نخلِ شباب مل جاتا ہے مگر وہ بھی سانپ کی نذر ہو جاتا ہے اور اب وہ اپنی تقدیر پر قناعت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سکندر آبِ حیواں کا راستہ بھول جاتا ہے اور ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں عزرائیل اسے موت کی

پیشین گوئی سُناتا ہے۔

گل گمیش کی دو شخصیتیں ہیں۔ ایک تاریخی دوسری دیومالائی۔ مگر اس داستان کو گل گمیش کی تاریخی شخصیت سے کوئی سروکار نہیں ہے کیونکہ تاریخی شخصیت محدود شخصیت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اساطیری شخصیت بڑی لامحدود ہوتی ہے۔ وہ تاریخی شخصیت سے عظیم تر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داستان میں فقط تمہید کے طور پر یا داستان کو صداقت کا رنگ دینے کی خاطر گل گمیش کی ملک گیری، مطلق العنانی اور عیش پسندی کی جانب ہلکا سا اشارہ کر دیا گیا ہے۔ غالباً اسی سبب سے گل گمیش اور اگا فرمانروائے کیش کے تصادم کے تذکرے کو داستان میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ یہ خالص تاریخی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں نہ کسی دیوی دیوتا کا ذکر ہے اور نہ فریقین کوئی فوق الفطرت کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔ اس کے برعکس داستان میں گل گمیش کی اساطیری شخصیت کو ابھی طرح سے نمایاں کیا گیا ہے داستان کی ابتدا در اصل اس مقام سے ہوتی ہے جہاں پہنچ کر گل گمیش کی تاریخی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔

داستان گو شاعر تاریخی صداقت کے دائرے کو توڑ دیتا ہے مگر فنی صداقت کا دامن اس سے کہیں نہیں چھوٹتا۔ داستان دیومالائی حقیقتوں سے سرمو انحراف نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ داستان کا تدریجی ارتقا بہت فطری ہے۔ واقعات کی کڑیاں بڑی لطافت سے ملتی جاتی ہیں۔ کرداروں کا تعارف بڑے سلیقے سے ہوتا ہے اور وہ ایک مخصوص منصوبے کے تحت یکے بعد دیگرے داستان میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ داستان گو الگ الگ حادثات کا ایک مجموعہ ہے مگر حسن ترتیب کے باعث اس میں ابتدا سے انتہا تک ایک ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔ داستان میں فقط چند کردار ہیں لیکن وہ افراد نہیں ہیں بلکہ ٹائپ ہیں اور کسی خاص خیال، اصول یا نظریۂ زیست کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بڑے بامعنی کردار ہیں اور زیبِ داستاں کے لیے نہیں شامل کیے گئے ہیں۔ مثلاً بہلیا اور اس کا باپ ہے کہ دونوں ہم پیشہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا رول بہت مختصر ہے مگر شاعر نے دونوں کے کردار کو بڑی خوبی سے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ بہلیا ایک ناتجربہ کار نوجوان ہے۔ وہ اِن کِدُو کی بھیانک شکل دیکھ کر ڈر جاتا ہے اور سارا ماجرا باپ سے بیان کرتا ہے۔ باپ بڑا تجربہ کار ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جنگلی انسان کو اگر کوئی قوت شائستہ اور مہذب بنا سکتی ہے تو وہ عورت ہے، اس کا حسن و شباب ہے۔ وہ لڑکے سے کہتا ہے کہ عروق جا اور وہاں سے مندر کی ایک بیسوا لے آ تو تیرا کام بن جائے گا۔ اسی طرح شراب بنانے والی نوجوان عورت سِدُوری کا کردار مندر کی دیوداسی سے مختلف ہے۔ سِدُوری گل گمیش کو "کھاؤ، پیو اور مزے اُڑاؤ کہ یہ زندگی چند روزہ ہے" کی تعلیم دیتی ہے، اس کے برعکس دیوداسی اپنے بیسواپن کے باوجود نہایت سنجیدہ عورت ہے۔ وہ اِن کِدُو کو جنگلی زندگی ترک کر کے شہر کی مہذب زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہے۔

اُتناپشتیم بڑا عالم و دانا بزرگ ہے مگر ہے بڑا غصہ ور، سخت گیر اور سخت دل۔ وہ اُرشانبی (ملاح) سے کہتا ہے کہ تو میری اجازت کے بغیر گل گمیش کو میرے پاس لے آیا ہے لہٰذا اب تو کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔ وہ گل گمیش کو حیات و موت کا فلسفہ سمجھاتا ہے اور سیلابِ عظیم کی پوری داستان سُناتا ہے مگر دلجوئی اور چارہ سازی کا ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہیں نکلتا بلکہ جب گل گمیش کو نیند آ جاتی ہے تو وہ اس کے عزم کی کمزوری پر ہنستا ہے۔ اس کے برعکس اس کی بیوی کا کردار ہمدرد اور مہربان ماں کا کردار ہے وہ کہتی ہے کہ بے چارہ بڑی دُور سے اور بڑی مصیبتیں جھیل کر تم سے مدد مانگنے آیا ہے، اسے خالی ہاتھ تو نہ واپس کرو۔ اسی طرح دیوتاؤں کے کردار بھی نہایت واضح ہیں شمس شفیق باپ ہے اور عشتار قہر و غضب کا پیکر۔

مگر سب سے عجوبہ کردار اِن کِدُو کا ہے۔ دیوتا اسے اس لیے خلق کرتے ہیں کہ وہ گل گمیش سے لڑے اور یروق کو بادشاہ کے مظالم سے نجات دلائے چنانچہ وہ ہر اعتبار سے گل گمیش کی ضد واقع ہوا ہے۔ گل گمیش ایک مہذب شہری ہے اور اِن کِدُو نرا جنگلی انسان ہے۔ گل گمیش عشتار کی دعوت وصل کو بڑی حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور اِن کِدُو عورت کے اشارے پر چلتا ہے۔ عورت کی رہنمائی قبول کر لیتا ہے اور اس کے مشورے پر عمل کرتا ہے۔ گل گمیش ابوی نظام کا نمائندہ ہے اور اِن کِدُو اُموی نظام کا نمائندہ ہے۔ گل گمیش سرتا پا شعور ہے اور اِن کِدُو ہمہ تن لاشعور ہے مگر اس تضاد کے باوجود دیوتاؤں کے حکم کے مطابق وہ "گل گمیش کی پرچھائیں" ہے اور جب گل گمیش مقابلے میں اسے ہرا دیتا ہے تو جو حریف تھا وہ حلیف بن جاتا ہے۔ گل گمیش اسے اپنا بھائی اور دوست کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور اِن کِدُو اسے اپنا آقا تسلیم کر لیتا ہے۔

اِن کِدُو کا کردار اور گل گمیش سے اس کا رشتہ بظاہر بڑا پیچیدہ معلوم ہوتا ہے مگر عہدِ قدیم کے قصّوں میں دو متضاد شخصیتوں کا اتحاد بڑی عام بات تھی۔ دراصل یہ متضاد شخصیتیں ایک ہی شخصیت کے متضاد پہلو ہوتے تھے جن کے میل سے پوری شخصیت کی تعمیر کی جاتی تھی۔ ان جڑواں شخصیتوں میں کبھی بھائی بھائی کا رشتہ ہوتا تھا، کبھی باپ بیٹے کا، کبھی میاں بیوی کا، کبھی آقا اور غلام کا اور کبھی دو دوستوں کا۔ ان میں سے ایک کے بغیر دوسرے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ہابیل اور قابیل، رستم اور سہراب، یزدان اور اہرمن (پانچویں صدی عیسوی کے ارمنی مؤرخ کو کھپ کے بیان کے مطابق یہ دونوں جڑواں بھائی تھے) رام اور لچھمن، موسیٰ اور ہارون، ابراہیم اور اسمٰعیل، اوڈیپس اور ایاگو، میکبتھ اور لیڈی میکبتھ، ڈان کوئیک، زوٹ اور سانچو پانزا، گل گمیش اور اِن کِدُو سب جڑواں شخصیتیں ہیں۔ نفسیات کے عالم ان میں سے ایک کو انسان کے شعور اور دوسرے کو اس کے لاشعور سے تعبیر کرتے ہیں۔

قدیم انسان واحد شخصیت کی تعبیر دو متضاد شخصیتوں کی تعمیر سے اس لیے کرتا تھا کہ وہ حقیقت کا شعور اس کی ضد کے بغیر کر ہی نہیں سکتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ ہیراک لائٹس سے ہیگل تک اکثر فلسفیوں نے قانون تغیر کی تشریح اجتماع ضدین ہی کے نظریے سے کی ہے اور سائنس کا نظریۂ ارتقا بھی قدیم انسان کے اسی اندازِ فکر کی تائید کرتا ہے۔ ان فلسفیوں کے مطابق ہر شے کے اندر اس کی نفی موجود ہوتی ہے اور انہی کے تصادم سے ایک تیسری حقیقت ظہور میں آتی ہے۔ ہر شے اپنے داخلی تناؤ سے ترقی کرتی ہے جیسے کمان کہ کھینچی بھی ہے اور تیر کو آگے بھی پھینکتی ہے۔ قدیم انسان ساری کائنات کو تضادات کا مجموعہ سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک دن رات، سردی گرمی، روشنی تاریکی، پستی بلندی سب "متضاد وحدتیں" تھیں۔ وہ کسی حقیقت کا اس کی ضد کے بغیر تصوّر ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں فرائیڈ نے کے آبیل کی ایک تصنیف کا حوالہ دیا ہے جس میں لسانیات کے اس جرمن عالم نے دنیا کی قدیم زبانوں سے بہت سے ایسے الفاظ مثال کے طور پر پیش کیے ہیں جو کسی شے اور اس کی ضد دونوں کی بیک وقت نمائندگی کرتے ہیں۔ ان زبانوں میں دیوتا اور دیو، اندھیرا اور اُجالا، اونچا اور نیچا، بڑا اور چھوٹا، موٹا اور دُبلا، قوی اور ضعیف اور اسی نوع کے دوسرے بہ کثرت متضاد تصوّرات کو واحد لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

> "ہمارے تصوّرات مقابلے اور موازنے سے اُبھرتے ہیں۔ اگر ہمیشہ روشنی ہوتی تو
> ہم روشنی اور تاریکی میں تمیز ہی نہ کر سکتے۔ چنانچہ نہ ہم روشنی کا تصوّر کر سکتے اور نہ ہمارے
> پاس روشنی کے لیے کوئی لفظ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر ہر شے

اعتباری ہے۔ وہ اسی حد تک آزاد وجود رکھتی ہے جس حد تک اسے دوسری
چیزوں سے تمیز کیا جاسکے۔ چونکہ ہر تصور اپنی ضد کا جڑواں بھائی ہے اس لیے اس
ضد کے پیمانے سے ناپے بغیر اس کا خیال کیسے پیدا ہوسکتا تھا۔ اس خیال کو
دوسروں تک پہنچایا کیسے جاسکتا تھا۔ چونکہ قوت کا کوئی تصور ضعف کے تصور کے
بغیر محال تھا لہٰذا جو لفظ قوی کی علامت بنا اسی نے ضعیف کی یاد دہانی بھی کی۔
انسان نے اپنے سب سے قدیم اور سب سے سہل تصورات بھی ان کی ضد کا
تصور کیے بغیر حاصل نہیں کیے۔ اس نے (ANTI-THESIS) کے دونوں
پہلوؤں کو الگ کرنا اور ان کا دوسرے سے مقابلہ کیے بغیر علیحدہ تصور کرنا
آہستہ آہستہ سیکھا۔"

اِن کِدُو پر گل گمیش کی فتح لاشعور پر شعور کی فتح ہے۔ اب لاشعور شعور کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس کا بھائی اور رفیق بلکہ غلام بن جاتا ہے۔ عقل عشق کی رہنمائی کرنے لگتی ہے۔ فکر اور جذبے کا یہ آہنگ نہایت صحت بخش اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ اگر انسان سرتاپا شعور ہو جائے اور عشق و جذبے کی اس کے کردار میں کوئی گنجائش باقی نہ رہے تو سماج کا جمالیاتی پہلو بالکل فنا ہو جائے۔ تہذیب اپنی تمام لطافتوں اور نفاستوں سے محروم ہو جائے کیونکہ شعر و نغمہ، رقص و مصوری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کا وجود جذبے ہی کے دم سے ہے۔ شعور اور لاشعور کا یہ توازن جب تک گل گمیش اور اِن کِدُو کی دوستی کی شکل میں قائم رہتا ہے ہمارا ہیرو ہر مہم میں کامیاب ہوتا ہے مگر اس کی ہر فتح لاشعور کو مجہول بناتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن کِدُو گل گمیش کو ان مہم بازیوں سے بار بار منع کرتا ہے لیے ہمبابا کے پھاٹک کو اکھاڑنے کے بعد تو اس کے بازو ہی شل ہو جاتے ہیں۔ انجام کار شعور کا غلبہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ لاشعور کی موت واقع ہو جاتی ہے لیکن لاشعور کی موت زندگی کے لیے اتنی ہی مہلک ہے جتنی شعور کی موت، چنانچہ اِن کِدُو کی موت کے بعد گل گمیش کا ذہنی توازن ہی بگڑ جاتا ہے۔ موت کے خوف سے وہ قریب قریب دیوانہ ہو جاتا ہے۔

سانڈ اور سانپ

دو علامتیں اور بھی ہیں جن کی تشریح ضروری ہے۔ ایک تو بیلِ فلک ہے جسے گل گمیش ہلاک کرتا ہے اور دوسرے سانپ ہے جو شجرِ شباب کو چرا کر کھا جاتا ہے۔ علمائے نفسیات ان جانوروں کو بلکہ تمام دیومالائی جانوروں کو لاشعور کی علامت قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق اُسوی نظام سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علماء جانوروں پر فتح پانے کو لاشعور پر فتح پانے سے تعبیر کرتے ہیں مگر علم الانسان کے محققین اس آسان تشریح سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی سبھی پرانی قوموں میں بے شمار دیومالائی داستانیں اور مذہبی رسمیں سانڈ اور سانپ سے منسوب ہیں۔

یوں تو گاؤ بیل کا شکار ابتدائی حجری دور میں بھی کیا جاتا تھا (التمیرا اور لیسکا کے غاروں میں سحر زدہ اور زخمی گایوں اور بیلوں کی بہ کثرت رنگین تصویریں دیواروں پر بنی ملی ہیں۔ یہ تصویریں پندرہ تا پچاس ہزار برس پرانی ہیں) مگر اس وقت ان جانوروں

کی حیثیت شکار کے دوسرے جانوروں سے مختلف نہ تھی اور نہ انھیں کوئی دیومالائی اہمیت حاصل تھی البتہ جب کھیتی باڑی کی ابتدا ہوئی تو گائے بیل کا افادی پہلو دوسرے جانوروں سے زیادہ نمایاں ہو گیا۔ بیل کا تصور فصلوں کی فراوانی اور زمین کی زرخیزی سے وابستہ ہو گیا۔ بیل کو ہلاک کرنا یا اس کی قربانی دینا زمین کے اُبھاؤ پن کو بڑھانے اور اناج کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری ٹھہرا مثلاً جزیرہ کریٹ کے لوگ دو سال میں ایک بار ایک تہوار مناتے تھے اور اس موقع پر ایک زندہ بیل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا جاتے تھے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق سبزی اور انگوری شراب کے دیوتا ڈائیونی سس (DIONYSUS) کو دشمنوں نے اس وقت قتل کیا تھا جب وہ بیل کا روپ اختیار کیے ہوئے تھے۔ مشرقی پروشیا (جرمنی) میں جب فصلیں ہوا میں لہراتی تھیں تو کہتے تھے "بیل کھیت میں سے گزر رہا ہے۔" کھیت کے کسی ٹکڑے میں اگر فصل بہت اچھی ہوتی تھی تو کہتے تھے "یہاں بیل لیٹا ہوا ہے۔" اگر فصل کاٹنے والے کو چوٹ لگ جاتی تو لوہرین کے لوگ کہتے تھے کہ "اس کو بیل نے مارا ہے۔"

فصل کی کٹائی کے بعد بیل کی قربانی عام تھی۔ چنانچہ ایتھنز (یونان) میں جون کے آخر یا جولائی کے شروع میں جب اناج کھلیانوں سے گھروں پر پہنچ جاتا تھا تو بیل کی قربانی کرتے تھے۔ اس تہوار کو یونانی زبان میں بُوفونیا کہتے تھے یعنی بیل کو قتل کرنے کا تہوار۔ اس موقع پر گندم اور جو کا گندھا ہوا آٹا عید اور زیوس کے معبد کی قربان گاہ پر رکھ دیا جاتا تھا اور بہت سے بیل قربان گاہ کے گرد ہنکائے جاتے تھے۔ جو بیل آٹا کھا لیتا تھا اس کو پکڑ کر قربان کر دیتے تھے۔ اسی طرح گنی کے جزیرے میں ہر سال دو بیلوں کو قربان کرتے تھے تاکہ فصل اچھی ہو۔ چین کے ہر صوبے اور ضلع میں موسم بہار کی آمد پر بیل کی قربانی کا تہوار منایا جاتا تھا۔ اس موقع پر بیل کا مٹی یا کاغذ کا بہت بڑا پتلا بنایا جاتا تھا۔ اس کے پیٹ میں پانچ قسم کا اناج بھر دیا جاتا تھا۔ پھر اس پتلے کو جلا دیتے تھے یا پتھر مار مار کر توڑ دیتے تھے۔ اس کے بعد ایک زندہ بیل کی قربانی کی جاتی تھی۔

قدیم ایرانی مذہب میں (متھراس دیوتا) بیل کی قربانی فصلوں کی فراوانی کی علامت تھی۔ چنانچہ ایسے مجسمے بکثرت دستیاب ہوئے ہیں جن میں متھراس بیل کی پیٹھ پر جھکا ہوا اس کی پسلی میں چھرا بھونک رہا ہے اور اس کے پیٹ سے خون کے بجائے اناج کی بالیاں نکل رہی ہیں۔

جزیرہ کریٹ کی دیومالا میں بھی بیل کو بہت اہم مقام حاصل ہے۔ وہاں ہر سال بیل کی قربانی کا تہوار بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ وہاں کے بادشاہ منیوس نے ایک بار لالچ میں آکر سب سے عمدہ بیل کو قربان کرنے کے بجائے اپنے مویشی خانے میں بھیج دیا اور دیوتا کو ایک معمولی درجے کے بیل کی قربانی دے کر ٹال دینا چاہا مگر دیوتا بہر حال دیوتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو یہ سزا دی کہ اس کی بیوی اس خوبصورت بیل پر عاشق ہو گئی اور اس کے پیٹ سے ایک ایسا جانور پیدا ہوا جس کا آدھا دھڑ انسان کا تھا اور آدھا بیل کا۔ یہ بیل آدم خور تھا اور ہر سال سات نوجوان مرد اور سات نوجوان عورتیں اس کی خوراک بنتے تھے۔ آخر کار ایک یونانی ہیرو تھیسئس (THESEUS) نے اسے ہلاک کر دیا۔

غرضیکہ گائے بیل کا زراعت اور افزائش سے تعلق ہر جگہ مسلّم ہے چنانچہ فرعون بھی اپنے مشہور خواب میں سات موٹی گائیں اور پھر سات دُبلی گائیں دیکھتا ہے اور حضرت یوسف اس خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مصر میں سات سال تک فصلیں بہت اچھی ہوں گی اور اس کے بعد سات سال تک بڑا سخت قحط پڑے گا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ گل گمیش کی داستان میں جب

عشتار اپنے باپ انو کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اسے ثورِ فلک بنا دے تو انو ایک بڑی معنی خیز بات کہتا ہے:-

"اگر میں نے تیری خواہش پوری کر دی
تو دنیا میں سات سال تک قحط رہے گا
اور اناج کے دانے کھوکھلے ہو جائیں گے
تو کیا تو نے لوگوں کے لیے کافی اناج فراہم کر لیا ہے؟
اور جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست ہو گیا؟"

اور عشتار اس کے جواب میں کہتی ہے کہ ہاں میں نے اناج اور چارے کا انتظام کر لیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیل کا رشتہ زراعت سے بہت گہرا اور بہت قدیم ہے اور بیل کی قربانی کرنا یا اسے مارنا شروع ہی سے مذہبی فریضے میں داخل تھا چنانچہ گل گمیش نے بیل کی غالباً کوئی بڑی قربانی کی ہوگی جس نے شاعر کے تخیل میں باقاعدہ جنگ کی شکل اختیار کر لی یا پھر سومیر میں تہوار کے موقع پر بیل کو باقاعدہ لڑ کر ہلاک کرنے کی رسم تھی جیسے سپین میں آج بھی سانڈ اور انسان کی لڑائی ہوتی ہے۔

سانپ کے بارے میں قدیم انسان کے جذبات بڑے ملے جلے سے ہیں کبھی وہ سانپ کو دیوتا مان کر اس کی پوجا کرتا ہے، کبھی وہ اسے اپنا دشمن سمجھ کر اس سے ڈرتا اور نفرت کرتا ہے اور کبھی وہ سانپ کو حیاتِ ابدی سمجھنے لگتا ہے۔ ہمیں سانپ اور انسان کے رشتے کی عہد بہ عہد تاریخ نہیں لکھنی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سانپ زمانہ قبل از تاریخ کا بہت پرانا دیوتا ہے اور بعض محقق (ای پورٹن سائیکس) تو "مشرق کی ناگی دیومالا" کو "ماتا دیوی" سے بھی قدیم خیال کرتے ہیں۔ مشرق میں سانپ کی پرستش آریاؤں کی یلغار سے بہت پہلے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ ویدوں میں کئی ایسی ناگی قوموں کا ذکر آیا ہے جن سے آریا حملہ آوروں کی جنگیں ہوتی ہیں مثلاً شیش ناگ ہے جو ایک ہزار سر کا دیوتا ہے وہ مار پرستوں کا راجہ ہے اور پاتال پر حکومت کرتا ہے۔ اسی طرح مدائن (مغربی ایران) کے بادشاہ آریوں سے پیشتر مار پرست تھے۔ آریاؤں نے ایران اور ہندوستان وغیرہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد یہاں کے جن مقامی دیوی دیوتاؤں کو اپنایا ان میں سانپ بھی تھا مگر ان کی اس یگانگت میں بھی بیگانگی اور مخاصمت کا پہلو جھلکتا ہے۔ مثلاً زرتشتی عقیدے کے مطابق ایک سانپ آزی داہکا نے خداوند اہورمزدا کی پہلی فانی تخلیق یاما کو مار کر دو ٹکڑے کر دیے تھے۔ سانپ سے ایرانیوں کی دشمنی ضحاک کی داستان میں بہت واضح ہو جاتی ہے۔ بادشاہ ضحاک کے شانوں پر ظلم و سفاکی کے باعث دو آدم خور سانپ نکل آئے تھے۔ آخر ایک ایرانی ہیرو انھیں ہلاک کرتا ہے اور ملک کو بادشاہ کے مظالم سے نجات دلواتا ہے۔

آریائی قومیں سانپ کو شاید اس وجہ سے بُرے رُوپ میں پیش کرتی تھیں کہ وہ مفتوح قوموں کا دیوتا تھا اور اس کے اثر کو کم کیے بغیر آریائی دیوتاؤں کا تسلط مفتوح قوموں پر نہیں قائم ہو سکتا تھا مگر سانپ سے نفرت کرنے کا جذبہ سامی قوموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سانپ ان کے سابق مصری آقاؤں (فرعون) کا شاہی نشان تھا۔ انجیل کے مطابق شیطان حضرت حوا کے پاس سانپ ہی کی شکل میں آیا تھا اور انھیں شجرِ ممنوعہ سے پھل توڑ کر کھانے کی ترغیب دی تھی اور پھر انسان حیاتِ ابدی سے محروم ہو گیا تھا۔

مصری دیومالا میں سانپ کا مقام بہت بلند ہے چنانچہ جنوبی مصر کی تاجدار دیوی اوادجیت (UADJIT) سانپ

ہی ہے۔ فراعنہ مصر کے تاج پر بھی سانپ بنا رہتا تھا۔ فرعون سیتی اول (چودھویں صدی قبل مسیح) کے مندر میں بادشاہ اور دیوی آئی سس (عشتار) کی جو تصویریں بنی ہیں ان میں فرعون کے تاج پر ایک سانپ ہے اور آئی سس کے تاج پر دو سانپ ہیں۔ (مروق کے بادشاہ اِن میکر کا ایلچی ارانا کے بادشاہ سے اپنے آقا کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے "میرا آقا سومیر کا مارِ عظیم ہے"، فرعونی جادوگر حضرت موسےٰ کو ڈرانے کے لیے سانپوں ہی کے کرشمے دکھاتے ہیں اور حضرت موسےٰ کا عصا بھی سانپ بن کر انھیں نگل جاتا ہے الف لیلہ، حاتم طائی اور اُردو کی دوسری داستانوں میں ناگ کے بکثرت قصّے موجود ہیں۔

اب ہم سانپ کے علامتی پہلو کا جائزہ لیں گے کیونکہ گل گمیش کی داستان میں شجرِ حیات چرانے والا سانپ یقیناً ایک علامت ہے۔ دنیا کے مختلف حصّوں سے ایسی متعدد تصویریں دستیاب ہوئی ہیں جن میں سانپ اپنی دُم کو منہ میں دبائے ہوئے ہے اور ساری کائنات اس کے دائرے کے اندر بند ہے مثلاً عراق میں ڈیڑھ ہزار برس پُرانا ایک دھات کا پیالہ ملا ہے جس میں سانپ اپنی دُم کو منہ میں لیے ہوئے ہے اور گھیرے کے اندر چند طلسماتی نقوش کندہ ہیں۔ بابل کی ایک پیکانی لوح پر بھی یہی ناگی حلقہ کندہ ہے۔ قبلیوں کی کھودی ہوئی ایک چوبی تختی ملی ہے جس کے ناگی حلقے کے اندر سورج، چاند، زمین اور دیوتا سبھی مصور ہیں۔ اسی قسم کا نقش نائیجیریا (مغربی افریقہ) کی ایک پیتل کی سینی پر بھی کندہ ملا ہے۔ اسی طرح میکسیکو کی ایک حجری جنتری کے گرد بھی سانپ حلقہ کیے ہوئے ہے کیمیا کی ایک پُرانی جرمن کتاب میں ایک پَردار سانپ بنا ہے جو اپنی دُم کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے مگر ناگی حلقے کا سب سے پُرانا قصہ وہ ہے جو وشنوجی سے منسوب ہے۔ وشنوجی اپنے دوسرے اوتار میں کچھوہ بن کر سمندر کی تہ میں جاتے ہیں تاکہ سمندر کو متھ کا کائنات کی تخلیق کریں۔ ان کی پیٹھ پر پہاڑ کا ستون رکھا ہوتا ہے اور اس ستون کے گرد سانپ لپٹا ہوتا ہے۔ کچھوے کی پیٹھ سمندر کو متھنے والی مدانی کی چکّی ہے، پہاڑ مدانی کا ڈنڈا ہے اور سانپ اس کی رسّی۔ رسّی کا ایک سرا اہرمن کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا راکشش کے ہاتھ میں۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پُرانی قومیں سانپ کو ہلاکت ہی کا موجب نہیں سمجھتی تھیں بلکہ ان کی نظر میں سانپ حیاتِ اَبدی کی علامت بھی تھا ——— حلقہ جس کی نہ ابتدا ہوتی نہ انتہا ——— جس کا نہ آگا ہوتا نہ پیچھا ——— جو نہ عمودی ہوتا نہ اُفقی۔ بلکہ ایک خود کفیل حقیقت ہوتا ہے۔ زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ——— وہ فونیشیا والوں کا پُراسرار انڈہ ہے۔ کیمیا والوں کا گولہ ہے، وشنو کے گلے کا ہار ہے، اشوک کا چکّر ہے ——— وہ ابدیت ہے ———

سانپ کی یہی ابدیت تھی جس نے گل گمیش کو شجرِ شباب سے محروم کر دیا کیونکہ ابدیت یا دوامی شباب تو اسی کا حق ہوتا ہے جو اَبدی ہو۔ فانی انسان کیونکر اَبدی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانپ نے آدم و حوّا کو بہکایا اور ایسی چال چلی کہ وہ حیاتِ ابدی سے محروم ہو گئے۔

حیاتِ اَبدی کی جستجو ئے ناکام ختم ہو گئی۔ گل گمیش کو موت سے ہار ماننی پڑی مگر موت بھی تو ابدیت ہے۔ انسان جیتے جی حیاتِ ابدی نہ پا سکا لیکن موت نے اسے اَمر بنا دیا البتہ انسان موت کی اَبدیت پر قانع نہیں ہے۔ وہ زندگی میں اَمر بننا چاہتا ہے وہ موت کی نفی کرنا چاہتا ہے۔ نہ جانے کب سے وہ موت پر فتح پانے کا خواب دیکھ رہا ہے کیونکہ موت اس کی شخصیت کو پامال کر دیتی ہے، اس کی ذات کو فنا کر دیتی ہے۔ انسان تو موت کو قانونِ قدرت تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتا رہا ہے چنانچہ حجری

انسان اپنے مردوں کو چولھے کے پاس دفن کرتے تھے تاکہ "خوابیدہ" انسان آگ کی گرمی سے جاگ اُٹھے۔ قدیم مصری اپنے بادشاہوں کی ممی بنا لیتے تھے اور راہِ عدم کو بادشاہ کی ضرورت کی سب چیزوں سے آراستہ کر دیتے تھے۔ اکادی بادشاہ کی لاش کے ساتھ اس کی ملکہ اور محل کے پورے عملے کو زندہ دفن کر دیتے تھے تاکہ بادشاہ کے نظام کار میں کوئی خلل نہ آنے پائے۔ مذہب بھی ابدیت کا یہ رنگین خواب دیکھتا رہا ہے۔ امر بننے کی خواہش سبھی کرتے رہے ہیں اس لیے کہیں آواگون اور نروان کا فلسفہ وضع ہوا ہے۔ کہیں جسدِ خاکی کو خاک میں ملا کر روح کو حیاتِ ابدی سے سرفراز کیا گیا ہے اور جنت کو اس کا مسکن ٹھہرایا گیا ہے۔ بعضوں کے نزدیک تو راہِ حق میں جان دینے والوں کا جسم بھی رُوح کی مانند ابدی ہوتا ہے۔ غرضکہ مرنے سب ہیں مگر مرنا کوئی نہیں چاہتا کیونکہ یہ دنیا بڑی حسین جگہ ہے۔

دریافت کی داستان

اس داستان کی دریافت کا سہرا ابنایانِ مغرب کے سر ہے۔ یہ درست ہے کہ ان محققینِ آثار کی سرگرمیوں کے باعث مشرق اپنے بیش بہا تہذیبی خزانوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا ہے اور امریکہ اور مغربی یورپ کے عجائب گھر اور کتب خانے اس دولتِ نایاب سے مالا مال ہیں مگر ان کا یہ احسان کیا کم ہے کہ ان کے شوقِ جستجو نے اِن دفینوں کو ضائع ہونے سے بچا لیا اور مشرقِ قدیم کی مُردہ زبانوں کو دوبارہ زندہ کر کے دنیا کو اس خطۂ ارض کی پُرانی تہذیبوں اور پُرانے علوم و فنون سے آگاہ کیا۔ ان کی کوششوں کی بدولت تاریخ اور قبل تاریخ کا فرق آہستہ آہستہ مٹتا جاتا ہے۔ انسانی تہذیب کے عہد بہ عہد ارتقا کی منزلیں واضح ہوتی جاتی ہیں اور تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں مشرق کی خدمات کا شعور بڑھتا جاتا ہے۔

داستانِ گل گمیش کی دریافت اسی شوقِ جستجو کی مرہونِ منت ہے۔ اس کی ابتدا ایک انگریز نوجوان ——— آسٹین ہنری لیئرڈ نے تقریباً ایک سو بیس برس پیشتر کی۔ آسٹین لیئرڈ کو مشرقی آثارِ قدیمہ دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔ لندن کے زمانۂ قیام میں اس نے ان آثار کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت بھی حاصل کر لی تھی چنانچہ ۱۸۳۹ء میں جب اس کے چچا نے جو سیلون میں رہتا تھا اسے ملازمت کے لیے سیلون بُلایا تو لیئرڈ نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی اور خشکی کی راہ لنکا کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ راستے میں شام، عراق، ایران اور ہندوستان کے آثار دیکھتا ہوا لنکا چلا جائے گا۔ وہ مدت تک موصل، نینوا، نیمرود، بغداد، طاق بستیون، تہران، اصفہان، خوزستان، بصرہ اور خرم آباد کے تاریخی کھنڈروں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ راستے میں وہ کئی بار رہزنوں کے ہاتھوں لُٹا اور گرفتار ہوا۔ ہفتوں ننگے پاؤں پاپیادہ اور خالی جیب سفر کرتا رہا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ بالآخر اس نے سیلون کا ارادہ ترک کر دیا اور آثارِ قدیمہ کی کھدائی میں مصروف ہو گیا۔

حُسنِ اتفاق سے آشوری پایۂ تخت نینوا کی کھدائی میں لیئرڈ کو شہنشاہ اشور بنی پال کا کتب خانہ ہاتھ آ گیا۔ اشور بنی پال فقط ایک فاتح اور جنگجو فرماں روا نہ تھا بلکہ بڑا علم دوست انسان بھی تھا۔ اس نے اپنے کاتبوں کو حکم دیا تھا کہ عروق، اُر، بابل اور دوسرے قدیم تہذیبی مرکزوں میں جائیں اور وہاں کے لوک گیتوں، لوک کہانیوں اور علمی چیزوں کو قلم بند کر لائیں۔ اس نے شاہی محل میں ایک کتب خانہ تعمیر کیا تھا جس میں یہ کتابیں محفوظ کی گئیں۔ یہ کتابیں کچی مٹی کی تختیاں تھیں جن پر پیکانی خط میں لکھا گیا تھا۔ لیئرڈ نے ایسی ۲۴ ہزار

ثابت اور شکستہ تختیاں ملبوں میں سے نکالیں اور لندن بھجوا دیں۔ چند سال بعد ہرمز د رسام کو اسی مقام سے کچھ اور تختیاں دستیاب ہوئیں تو یہ تختیاں بھی برٹش میوزیم میں ڈھیر کر دی گئیں مگر اس وقت تک کسی کو اکادی زبان نہ آتی تھی اس لیے یہ تختیاں میوزیم میں بیکار پڑی رہیں۔

بارے ان تختیوں کو پڑھنے کی نوبت بھی آ گئی۔ یہ خدمت ایک دوسرے انگریز نوجوان جارج سمتھ نے سر انجام دی جارج سمتھ کو اشوری آثار اور علوم کے مطالعے کا بڑا اشوق تھا۔ اس کے شوق سے متاثر ہو کر برٹش میوزیم کے افسروں نے اسے اشوری شعبے میں ایک چھوٹی سی ملازمت دلوا دی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے ان تختیوں کی مدد سے اشوری زبان سیکھ لی اور تختیوں کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ ایک دن وہ ایک تختی کو پڑھ رہا تھا جو درمیان سے ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کا آدھا حصہ غائب تھا۔ سمتھ اپنی آپ بیتی میں لکھتا ہے کہ:

"کسی زمانے میں اس تختی میں چھ کالم رہے ہوں گے۔ میں نے تیسرا کالم پڑھا تو میری آنکھیں اس مقام پر ٹھہر گئیں جہاں لکھا تھا کہ جہاز کوہ نذیر پر رک گیا۔ اس کے آگے فاختہ اڑانے کا قصہ درج تھا اور یہ کہ فاختہ کو زمین پر اترنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ ملی لہٰذا وہ جہاز میں واپس آ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے حضرت نوح کے سیلاب کے کلدانی تذکرے کا کم سے کم ایک ٹکڑا پا لیا ہے۔"

یہ واقعہ ۱۸۷۲ء کا ہے۔ ۳ دسمبر ۱۸۷۲ء کو سمتھ نے مجلس آثار انجیل کے جلسے میں اس دریافت پر ایک مقالہ پڑھا تو لندن کے پڑھے لکھے حلقوں میں سنسنی پھیل گئی۔ اخبار "ڈیلی ٹیلی گراف" نے سمتھ کو ایک ہزار پونڈ سفر خرچ دے کر نینوا بھیجا کہ وہ نینوا کے کھنڈروں میں شکستہ تختی کا گم شدہ ٹکڑا تلاش کرے۔ حسن اتفاق سے یہ ٹکڑا اسے پرانی کھدائیوں کے ملبوں ہی میں سے مل گیا۔

سمتھ کو نینوا کے ملبوں میں سے کل بارہ لوحیں ملیں۔ ان لوحوں پر گل گمیش کی داستان مرقوم تھی۔ سمتھ نے اس نظم کے ہیرو کا نام "ازدو بار" پڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ انجیل کا نمرود یہی شخص ہے۔ گل گمیش کے رفیق ان کِدو کا نام سمتھ نے "ابانی" پڑھا۔ اس کی رائے میں یہ شخص جوتشی یا رمال تھا۔ ان تختیوں میں ازدو بار کی فتوحات، ابانی اور ہیلیے کا قصہ، ابانی کی عورت (حرمیتو) سے ملاقات، ازدو بار اور ابانی کی دوستی، حمبابا کی مہم، ازدو بار اور عشتار کا جھگڑا، ابانی کا خواب اور اس کی موت، ہسی سادرا (اتنا پشتیم) سے ملاقات کے لیے ازدو بار کا سفر، دونوں کی گفتگو حیات و ممات پر، سیلاب عظیم کا قصہ، ازدو بار کی واپسی اور پھر ابانی کے لیے ازدو بار کا ماتم تفصیل سے قلم بند کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد گل گمیش کی داستان کے اور نسخے دوسرے مقامات سے بھی برآمد ہوتے رہے اور شاید ان دریافتوں کا سلسلہ ہنوز ختم نہیں ہوا ہے۔ اب تک جو نسخے ملے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ سومیری نسخے۔ گل گمیش کی داستان کی سب سے قدیم اور شاید سب سے مستند روایت ظاہر ہے کہ سومیری نوشتوں کی ہو گی۔ سومیری زبان کی چودہ لوحیں جن پر یہ داستان کندہ ہے، نفار سے برآمد ہوئی ہیں۔ ایک سومیری لوح کیش کے مقام سے اور دو نامعلوم جگہوں سے بھی ملی ہیں۔ ان سب کا عہد تین ہزار قبل مسیح کا آخری اور دو ہزار قبل مسیح کا ابتدائی زمانہ ہے۔

۲۔ بابلی نسخے۔ یہ شہنشاہ سَرگن کے زمانے کے ہیں جو بابلی بادشاہوں کے پہلے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا عہد دو ہزار قبل مسیح کا ابتدائی زمانہ ہے۔

۳۔ رِتّی نسخہ ۔ وسطی اناطولیا (ترکی) میں بوغازکوئی مقام پر حتی زبان کے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں، وہ دو ہزار قبل مسیح کے وسط کے ہیں۔
۴۔ حری زبان کا نسخہ۔ اسی مقام سے حری زبان کا ایک کتبہ بھی ملا ہے جس میں گل گمیش کے سفر کا تھوڑا سا حال درج ہے۔ یہ سب لوحیں آریائی زبانوں میں ہیں۔
۵ سامی زبان کے نسخے:۔ (الف) اکادی زبان کے چند ٹکڑے بوغازکوئی میں اور دو لوحیں کالمی سلطان ٹیپ کے مقام پر ملے ہیں ایک لوح میں انکیدو کی علالت کا حال درج ہے اور دوسری لوح میں انکیدو کی موت، تجہیز و تکفین اور گل گمیش کا مرثیہ لکھا ہے۔
(ب) سب سے جامع نسخہ نینوا کے شاہی کتب خانے کا ہے جو اشوربنی پال کے عہد میں ساتویں صدی قبل مسیح میں مرتب ہوا تھا۔
ان نسخوں کے علاوہ مغیدو (فلسطین) سے ایک ٹکڑا ملا ہے۔ اس ٹکڑے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجیل میں سیلاب نوح کی جو داستان منقول ہے اس کے مصنفین گل گمیش کی داستان سے آگاہ تھے۔

نِفار، نینوا، بوغازکوئی اور مغیدو سے ان لوحوں کا دستیاب ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ گل گمیش کی شہرت سومیر کے چھوٹے سے خطے تک محدود نہ تھی بلکہ اس کے کارناموں سے تقریباً دو ہزار برس تک ترکی، عراق، فلسطین اور ایران یعنی پورا مشرق قریب واقف رہا ہے اور باوجودیکہ گل گمیش کی داستان مختلف زبانوں، مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں رائج رہی ہے لیکن داستان کے نسخوں میں واقعات کی حد تک کوئی بنیادی فرق نہیں پایا جاتا بلکہ سب نسخوں میں داستان قریب قریب ایک ہی ہے۔ فرق فقط جزئیات کا ہے۔

لیکن حیرت ہے کہ اشوربنی پال کی وفات کے بعد جب ایرانیوں نے ۶۱۲ ق م میں نینوا کو تاخت و تاراج کیا تو نہ فقط داستان گل گمیش کی لوحیں زمین میں دفن نہیں ہو گئیں بلکہ مشرق قریب کے اس ہیرو کے کارنامے بھی ذہنوں سے محو ہو گئے۔ کم از کم ایرانی ادب میں یا سامی ادب میں گل گمیش کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا۔ سینڈرس اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ ہمسایہ قومیں اشوریوں کو سخت ناپسند کرتی تھیں کیونکہ اشوری فرمانرواؤں نے اور ان سے پیشتر بابل کے بادشاہوں نے اپنے عہدِ اقتدار میں ان قوموں پر بڑے بڑے مظالم توڑے تھے۔ اس کے علاوہ ایرانیوں اور عراقیوں کی نزاع آبائی تھی۔ ایرانیوں کی دیومالا عراقیوں سے جدا تھی۔ اُن کے دیوتا اور رہبر و بھی مختلف تھے۔ پھر وہ رقیب قوم کے ہیرو گل گمیش کی یاد کو کیوں زندہ رکھتے۔ فاتح قوموں کی مانند ان کی کوشش بھی یہی رہی ہوگی کہ وادی دجلہ و فرات کے لوگ اپنے تاریخی ورثہ کو فراموش کر دیں اور ایرانی اقدارِ حیات کو اپنا لیں۔ سامی قوموں کی نفرت بھی قدرتی تھی کیونکہ اشوری فاتحوں نے کئی بار یہودی شہروں کو برباد کیا۔ ان کے نبیوں کو گرفتار کیا اور ہزاروں یہودیوں کو غلام بنا کر عراق لے گئے۔

پس نینوا کی بربادی ایک شہر یا ایک سلطنت کی بربادی نہ تھی بلکہ ایک قدیم تہذیب کی بربادی تھی۔ اس تہذیب کا سکہ بحرِ روم سے بحرِ ہند کے ساحل تک چلتا تھا۔ ایرانی اقتدار نے اس تہذیب پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کا ارتقائی تسلسل ہی ٹوٹ گیا اور اس کی انفرادیت دوسری تہذیبوں میں گم ہو گئی۔

جارج سمتھ کے بعد سومیری اور اکادی علوم و تہذیب کی تحقیق کو بڑا فروغ ہوا ہے۔ سمتھ کے ترجموں میں جو غلطیاں تھیں وہ بھی درست ہو گئی ہیں اور ناموں اور شہروں کا املا بھی صحیح کر لیا گیا ہے۔ (مسلسل)۔

یہ تمہید ہے اس قدیم ترین داستان کی جسے "گل گامش کی داستان" کے عنوان سے سید سبط حسن نے آزاد نظم میں ترجمہ کیا ہے ——— جو آئندہ مسلسل پیش کیا جائے گا۔ (ادارہ)

شہر آشوب حاتم دہلوی

ڈاکٹر محمد عمر

شیخ ظہور الدین حاتم ۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰ء-۱۶۹۹ء) میں پیدا ہوئے۔ لفظ "ظہور" سے تاریخ برآمد ہوتی ہے اور ۱۱۹۷ھ (۸۳-۱۷۸۲ء) میں اُن کی وفات ہوئی۔ اس طرح وہ دورِ اوّل کے شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُن کا سابقہ دورۂ ایہام گویان میں شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، مصطفیٰ خاں یکرنگ وغیرہ سے بھی رہا اور اس کے بعد انھوں نے میر، سودا، درد اور سوز کے عروج کا زمانہ بھی دیکھا۔ پھر دورِ سوم میں انشا، مصحفی، رنگین اور جرأت کے عہد تک زندہ رہے۔ ان کے ہوش ہی میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا تھا، جس نے یہاں کے فارسی گو شعرا کی توجہ یک لخت اردو شاعری کی طرف مبذول کر دی۔ حاتم نے بھی ابتدا میں ایہام گوئی کی طرف اپنی طبیعت کو مصروف رکھا تھا۔ جب مرزا مظہر، یقین اور میر نے سادہ گوئی کی بنیاد رکھی تو حاتم نے اپنا سب کلام نظری کر دیا۔ اس کا ایک انتخاب تیار کیا جس کا نام "دیوان زادہ" رکھا۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے بعض کام کی باتیں بتائی ہیں۔ جن سے اس عہد کے میلانات اور رجحانات میں تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہ "دیوان زادہ" ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس کے قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک نسخہ آزاد لائبریری علی گڈھ میں ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں بھی محفوظ ہے۔

یہاں حاتم کا ایک شہر آشوب نقل کیا جاتا ہے جس کا متن آزاد لائبریری علی گڈھ کے مخطوطے پر مبنی ہے۔ یہ پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔ اور اس میں کہیں کہیں قیاسی تصحیح بھی کی گئی ہے۔ جو الفاظ مغشوش ہیں اُنھیں اسی طرح چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس شہر آشوب سے اس عہد کے سماجی اور تاریخی حالات کا بہت واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ ایک بات تو خاص طور سے بداہتہً محسوس ہوتی ہے کہ طبقاتی کشمکش اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی اور اعلیٰ متوسط یا متوسط طبقے کے لوگ اپنی اقتصادی پریشانیوں کے ساتھ "اراذل" کے عروج یا ادنیٰ طبقہ کی ترقی کو حسد کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ ایک خاص طور کے معاشرتی اور معاشی نظام میں انقلاب کا مرثیہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ حاتم نے جن پیشہ ور اقوام کے "عروج" کا نوحہ کیا ہے وہ بھی اس دور میں پریشان حال اور پراگندہ روزی پھر رہے تھے۔ چنانچہ میر کہتے ہیں ؎

صنّاع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

جب زوال اور انحطاط کا یہ عمل اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تو اُن ہنرمندوں اور صنّاعوں کا مرکز دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو گیا اور وہاں

ایک بار پھر وہ معاشرہ قائم ہو گیا جس کے قدم زوالِ سلطنت کی وجہ سے دہلی کی سرزمین پر نہ جم سکے تھے۔ اردو میں شہر آشوب کی تاریخ پر کام کرنے والے حضرات کے علاوہ اس عہد کی معاشرتی زندگی میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی یہ شہر آشوب نہایت اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شہر آشوب

(ص ۲۴۲)
شہوں کے بیچ[1] عدالت کی کچھ نشانی نہیں[2] — امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بوسے مہربانی نہیں — تواضع کھانے کی جا ہو کہیں تو پانی نہیں
گویا[3] جہان سے جاتا رہا سخاوت و پیار[4]

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور — یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اُدر[5] — یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موسا فرور

. . . .

امیر زادے ہیں حیران اپنے حال کے بیچ — تھے آفتاب پر اب آ گئے زوال کے بیچ
پھریں ہیں چرخی سے ہر دن تلاشِ مال کے بیچ — وہی گھمنڈِ امارت[6] ہے پھر خیال کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر ہو پر اب تو ہے دشوار

(ص ۲۴۳)
رزالی آج نشے بیچ زر کے جاتے ہیں — پہن لباس زری سب کو سج دکھاتے ہیں
مسی پہ پان کھا سر خرو دکھاتے ہیں؟ — کبھو ستار کبھی ڈھولکی بجاتے ہیں
غرور و غفلت و جوبن کی مدھ[7] میں ہیں سرشار

---

[1] متن قائم کرنے میں قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کی نشان دہی ہر جگہ لازماً نہیں کی گئی۔

[2] اسے نئیں بروزن تئیں (فعل) پڑھا جائے گا۔ اس دور میں یہ جائز تھا۔ [3] یہ بھی بروزن فعل

[4] ہندی اور فارسی الفاظ کے درمیان حرفِ عطف بھی جائز تھا اب اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔

[5] یعنی دوسرے کی طرف۔ حاتم کے وقت تک اُدر (لفظ ہندی بمعنی طرف) عام طور سے رائج تھا۔ عہدِ میر میں اس کا رواج کم ہوا۔ ناسخ کے زمانے تک قطعاً متروک ہو گیا۔ ایک بار لالہ بالمکند حضور کے مشاعرے میں غزل پڑھی جس میں یہ لفظ استعمال ہوا تھا کسی نے برسرِ مشاعرہ اعتراض کر دیا تو انھوں نے جواب دیا۔
رکھتا ہوں میر صاحب و قبلہ سے میں سند — یہ جانتا نہیں کہ زباں ہے کہاں کی "اُدر"
اس کے بعد میر کا یہ شعر سند میں پڑھا۔
بے ادبی تو وحشت میں بھی سرزد ہم سے کم ہی ہوئی — کوسوں اس کی اُدر گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

[6] "گھمنڈِ امارت" بھی اسی دور کی اُن گھڑ زبان ہے۔ اب یہ اضافت جائز نہیں۔

[7] مدھ ہندی لفظ ہے جس کے معنی "شراب" ہیں۔

روپے اشرفی اچھالیں ہیں رات دن صراف　　مغشش و بادے میں غرق ہیں کناری باف
کتاب خانے کے وارث ہوئے ہیں مفت صحاف (کذا)　　نہاری پیز[1] کا دوکاں پر کرے ہیں گلہ و لاف (کذا)
ہمیشہ سونے و روپے میں کھیلتا ہے سنار

نظر میں آتے ہیں پر کیسے آج نائی کے　　اکڑتے پھرتے ہیں پی پی کے دود دائی کے
ہوئے ہیں فربہ دیکھو[2] گوشت کھا قصائی کے　　کمینے بھول گئے دن دیا سلائی کے
زنانے مردمی پکڑ باندھنے لگے تروار[3]

ہے آج گرم، شجاعت میں نان بیز[4] کی دکان　　کبابی قیمہ کرے ہے بخیوں کو ھر آن
تمع فروش کے سب جرب ہے او پریشان　　ہے مثال باغ کے سرسبز کو بجڑے کا مکان
دھینور[5] کا بحر میں مچھلی کا کھیلنا ہے شکار (کذا)

شگفتہ لب ہے ہر ایک آن بھول والے کا　　بھلایا دھنے[6] نے اب دل سے نرخ گالے[7] کا
لہار زور دکھاتا ہے اپنے طاسے[8] کا　　یہاں دماغ فلک پر ہے اب رزالے کا[9]
جلا ہے دیتے ہیں طعنہ[10] ہر ایک کو ہر بار

پھریں ہیں چکنے جہاں بیچ آج تیلی کے (کذا)　　ملیں ہیں تیل سدا بیل اور چنبیلی کے
ہوئے ہیں صاحب مال و زر و حویلی کے　　رکھیں ہیں شوق سدا دل کے بیچ سیلی کے
گئے ہیں بھول غذائے قدیم ماش و جوار

(ص ۲۴۴)

---

[1] نہاری پیز = نہاری پکانے والا　　[2] بروزن فعل (دیکھو)
[3] حروف ل اور ر متبادل ہیں۔ عام گفتگو میں تلوار کو تروار بھی بولا جاتا ہے۔　　[4] مراد نان بائی
[5] دھینور (بکسر دال و نون غنہ و بفتح واؤ) بروزن فعل، ایک پیشہ ور قوم جس کا کام بار برداری وغیرہ ہوتا ہے۔
[6] ندّاف
[7] نرخ گالے کا = مراد روئی کا بھاؤ
[8] اب والے اور گالے کا قافیہ طاسے نہیں آسکتا لیکن اس دور میں جب اصول زبان وضع نہیں ہوئے تھے۔ یہ بھی جائز تھا۔ چنانچہ دھڑ کو سر کا قافیہ اور اخلاص کو وسواس کا قافیہ بنا دیتے تھے۔ اس میں چونکہ صوتی اعتبار سے ایہام ہے اور نالے سے مناسبت، اس لیے حاتم نے لوہار کے ساتھ طاسے کا لفظ استعمال کیا ہے۔
[9] رزالے - مراد رذیل
[10] یہاں طعنہ کو بھی تانتے سے مناسبت ہے اس لیے استعمال ہوا ہے۔

رنگیلا شہر میں رنگریز کا[1] بن آتا ہے — دھوبی کا[2] اور کے کپڑے پہ سج دکھاتا ہے
سقّے[3] کا مفت بہشتی دیکھو کہاتا ہے — چمار چھوڑ چرم چرمدہ کماتا ہے
چھنال وگانڈو و بھڑوے کا گرم ہے بازار

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے — جو چور تھے سو ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
(ص ۲۴۵) جو زبردست تھے سو ان دنوں ہیں زور ہوئے — جنھوں کو زور تھا سو اب مثالِ مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار

خدا نے کی ہے میسّر رفوگروں کو شال — پھرے ہیں پیٹ بھرے بچے سب لالوں لال
لگے ہیں زاغ بھی چلنے کو آج کبک کی چال — حرام زادوں کو یکساں ہوا حرام و حلال
جہل کا گھر ہے جہاں میں تو خانۂ خمّار

جہاں کے بیچ نہیں حلوائی شیریں کام (کذا) — بھرا ہے میوہ فروشوں کے پستہ و بادام
نگینے ساز کا عالم میں ہو رہا ہے نام — نظر میں لاتا نہیں اپنے صاحبوں کو غلام
جدھر تدھر چڑھے پھرتے ہیں پالکی میں کہار

بورچی[4] کھا کے ڈکاریں ہیں اب دوپیازہ[5] پلاؤ — اور اپنے زعم میں کھاتا ہے کاغذی کا ناؤ
گرانی غلے سے بنیئے کا اور ہی ہے سبھاؤ — گلی گلی میں ہے ہر ایک اپنے راجا راؤ
نوار باف پلنگ پر پڑا ہے پاؤں پسار

(ص ۲۴۶) جہاں میں صاحبِ خسخانہ گھاس والے ہیں — جنھوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہمنے دکھ ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں — سو اب دماغ میں وہ رانی خاں کے سالے ہیں
وہ ہیں سلام طلب ہم سے جب ہوئے دوچار

سبھوں کے بیچ یہاں سرخرو ہے تنبولی — کمہار رکھتے ہیں بندوق توپ اور گولی
ہوا ہے خضر کا چشمہ بھنگیرے کی جھولی — ہنسے ہیں بیگم و خانم کو دیکھ کر ٹولی (کذا)
ہر ایک صبح کو یاقوت کھاتے ہیں عطّار

---

[1] رنگریز کا = مراد رنگریز کا لڑکا۔ اسی طرح مصرع ثانی میں "دھوبی کا" سے مراد دھوبی کا لڑکا۔
[2] دھوبی بروزن "فعل" بہ تخفیف واؤ آیا ہے۔
[3] سقہ = بلا تشدید۔ یہ بھی بروزن "فعل" استعمال ہوا ہے۔
[4] گفتگو میں بہ تخفیف الف بولا جاتا ہے اسی طرح نظم ہوا ہے
[5] دوپیازہ = بہ تخفیف یا نظم ہوا ہے۔

عجب یہ اُلٹی ہی ہے گی باؤ دلّی میں — کہ شاہ بار چڑی مار کے ہے اٹی میں
روغن[1] فروش کی ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں — جنگل[2] کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہیں بستی میں
بجیب چھوڑ کے شہروں کو میں جنگل میں خوار

ہر ایک جنس کے خاوند ہیں گے دست فروش — کیمبری صاحب ظرفوں کے نہیں (پا) پوش (کذا)
جوتی فروش دکھاتے ہیں سب کے تئیں پاپوش — بجیب خانہ بدوش ایک میں اور دو گوش
ہے باغباں کے گھر میں بہار جوں گلزار (ص ۲۴۷)

تمام شہر میں کھتو نکے مالک ہیں گے بزاز — اور آج سب میں بڑے خود نما ہیں آئینہ ساز
سنار اپنا دکھاتے ہیں سب کو آتش باز — کمان گر بھی ہوئے گھر میں اپنے تیر انداز
نہائی آرے چلاتا ہے عسلق پر نجار

جہاں میں صاحب شمشیر ہیں گے صیقل گر — ہے گندھیوں کا معطر سدا دوکان اور گھر
ہمیشہ نازاں ہیں بھر بھوبجے اپنے بختوں پر — ابیر دود ملائی دہی سے ہیں خوگر
بنا ہے خانہ نقاش رشک نقش و نگار

دلوں کے بیچ صفائی نہیں ہے یاروں میں — کہیں جو ہوئے بھی شاید تو اب ہزاروں میں
صندوق[3] ساز کی زر ہے بھرا اٹاروں میں — جو تھے سائیس[4] سو نوکر ہیں اب سواروں میں
عراقیوں نکے[5] ہوئے ہیں سر طویلہ حمار

(غیر مطبوعہ)

---

[1] روغن = بروزن فعل بہ تخفیف واؤ
[2] جنگل = بروزن فعل بہ تخفیف نون
[3] صندوق = نون غنّہ کے ساتھ
[4] سائیس = بروزن رئیس بہ تخفیف الف
[5] مراد عراقی گھوڑے

پہلا نسوانی اردو دیوان

نصیر الدین ہاشمی

اردو شاعری کے آغاز کو امیر خسرو سے تسلیم کیا جاتا ہے اس کے بعد شمالی ہند میں صرف چند مگر گجرات اور دکن میں کئی صوفیائے کرام نے اردو میں شعر کہے ہیں۔ مگر پہلا صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی کو قرار دیا گیا ہے جس کو مرے ہوئے آج ساڑھے تین سو سال سے زیادہ عرصہ ہوتا ہے۔

اس طرح جب اردو شاعری میں صنف نازک کی طرف نظر ڈالی جائے تو بعض نام ایسے ملتے ہیں جنھوں نے ۱۱۱۱ھ یا اس کے بعد شاعری کے میدان میں اپنی جولانی طبع کا نمونہ پیش کیا ہے۔ مگر جس خاتون شاعرہ کا دیوان ہم دست ہوا ہے۔ اس وقت کے معلومات کے لحاظ سے اس کو پہلی صاحب دیوان شاعرہ کہہ سکتے ہیں وہ لطف النسا بیگم امتیاز ہے۔ اس کو حیدر آباد سے تعلق تھا اور آصفجاہ ثانی (۱۱۷۵ھ تا ۱۲۱۸ھ) کے عہد میں موجود تھی۔ اولاً اس کے جو حالات ہم دست ہوئے ہیں۔ ان کی صراحت کی جاتی ہے اور پھر اس کے دیوان کا تذکرہ کیا جائے گا۔

لطف النسا نام امتیاز تخلص تھا حیدر آباد وطن تھا۔ شاہی خاندان کے رشتہ داروں میں شامل تھی۔ ماں کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا۔ شاہی خاندان میں پرورش ہوئی۔ مشہور شاعر اسد علی خان تمنا سے بیاہی گئی۔ مگر نوجوانی میں بیوہ ہو گئی کیونکہ تمنا کا انتقال ۱۲۰۰ھ میں ہوا ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد اس نے مذہب سے زیادہ شغف پیدا کر لیا۔ شاہ عطاء اللہ کی مرید ہوئی۔ شاہ عطاء اللہ بیجاپور سے حیدر آباد آئے تھے۔ آپ شاہ امین الدین علی کی اولاد میں شامل اور اُن کے سلسلہ میں منسلک تھے۔ بڑے حسین اور خوبصورت تھے۔ اپنے ذاتی ہاتھی پر سفر کرتے تھے۔ حیدر آباد میں کچھ عرصہ قیام کے بعد کرنول چلے گئے وہاں کا والی آپ کا مرید ہو گیا۔

امتیاز اولاً اپنا تخلص غالباً لطف کرتی تھی اس کے بعد امتیاز تخلص کیا تھا۔ اپنے (۳۶) سال کے سن میں دیوان مرتب کیا۔ یہ دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب ہوا ہے۔

امتیاز کی ایک ضخیم مثنوی تقریباً چھ ہزار شعر پر مشتمل ہے اس کا قلمی نسخہ بھی ہم دست ہوا ہے۔ یہ مثنوی گلشن شعرا سے موسوم ہے۔ اس میں ایک داستان نظم کی گئی ہے۔

امتیاز کب تک زندہ رہی اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

امتیاز کا دیوان (۱۰ ۱/۲ × ۶ ۱/۲) سائز کے (۱۵۶) صفحے پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ میں (۱۵) سطریں نستعلیق خط میں لکھی ہوئی ہیں۔

دولت آباد کے چکنے کاغذ پر لکھا گیا ہے۔ جدول سرخ ہے۔ دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب اور اس نسخہ کی کتابت سنہ (۱۲۲۳ھ) میں ہوئی ہے۔ جلد لاکھی رنگ کی ہے۔ اس پر نقش منقش ہے۔ اس کو سالار جنگ کے مورث محمد علی خاں نے ۱۲۴۲ھ میں خریدا ہے۔ غالباً اس سنہ میں جلد بنوائی گئی ہے۔ دیوان میں اولاً ردیف وار غزلیات ہیں جو (۱۹۱) صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں تمام حروف کے ردیف ہیں اس کے بعد (۲۲) فرد ہیں۔ فرد کے بعد (۱۵) رباعی (۵) قطعے ایک مخمس (۳) مسدس ہیں اس کے بعد پھر چند مخمس اور ایک دو مسدس ہیں۔ ان کے بعد عرضی بجناب حضرت امام حسین کی مثنوی ہے اس کے بعد کئی قصاید کی ایک طویل مثنوی بھی ہے۔

اس مثنوی میں اس دیوان کے ابیات کی تعداد اور ترتیب کا سنہ بھی درج ہے جو حسب ذیل ہے:۔

مناقب قصائد جو لکھا   مخمس دگر ریختہ جو ہوا
ہے تعداد ابیات دیوان جو   ہوئے دو ہزار ساٹھ اور ایک سو
(۲۱۶۰)
کیا سن ہجری کو میں جب عیاں   ہوئے ایک ہزار دو سو بارہ جاں

اس دیوان کے علاوہ اس کا کلام اور تھا چنانچہ لکھتی ہے۔

مرتب تو دیوان اتنا ہوا   وہ بیش از لکھا ورے ہے کیا کر دیا

اس تفصیل کے بعد امتیاز کا نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ اولاً غزلیات کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

جب سے صنم کے عشق میں دیوانہ بن گیا   کعبہ سے دل مرا ہے تو بت خانہ بن گیا
مدت سے گر سراغ جو خوش قامتوں کا اب   مینائے دل مرا تو پری خانہ بن گیا
تو چشم پر خمار کتیں دیکھ اے صنم   نرگس کا ہر چمن میں ہے پیمانہ بن گیا
رہ رہ کے روز و شب تری زلفوں کی یاد میں   پھٹ کر ہزار جا سے جگر شانہ بن گیا
رکھتا ہے امتیاز جو تو گل و غنچوں سے شوق   عالم میں تیرے عشق کا افسانہ بن گیا

مجھ سے بسمل کو ذبح کر تو نے   آج قاتل بڑا ثواب کیا
امتیاز اب ترا لقب ہم نے   جہاں فدائے ابو تراب کیا

نہ مشفق ہے، نہ ہمدم ہے کوئی بے کس ایسا اپنا
نہ ہے اب ساقی اپنا جام اپنا گلعذار اپنا

بہار آئی ہے گلشن میں کیا تاراج گھر اس کا
جفا ہے ان دنوں بلبل پہ ظالم باغباں ایسا

سینہ تری جفا سے معمور ہو رہا تھا — پر زخم دل میں ظالم ناسور ہو رہا تھا
اس جور اور جفا پر شکوہ کسی کے آگے — ہرگز گیا نہ گرچہ مجبور ہو رہا تھا
بیٹھا تھا جا چمن میں اک شب وہ چاندنی میں — پی کر شراب خوش ہو مخمور ہو رہا تھا
ساقی دلی مہیا محفل ہے عاشقوں کی — میرا بھی کچھ ذرا سا مذکور ہو رہا تھا
کہتے ہیں راہ دل سے ہے دل کو اس جہاں میں — جا دیکھوں کیا تماشا کچھ زور ہو رہا تھا
جب امتیاز جا کر اس باغیچے میں تنہا — گوشے میں اک مکان کے مستور ہو رہا تھا

محو ہو دیکھ کے جلوے کو جمال ازلی — نقد جان سب کی خریدی میں خریدار بنا
گو ریاست ہو مجھے ملک جنوں کی واللہ — عقل کو شہر بدر کر دوں گنہگار بنا

ہم سے نظروں کو چرا غیروں سے کرنا باتیں — رس بھری آنکھیں پھرا کر وہ رسیلا میرا
اس کا نانی ہے کہیں سچ کہو یارو مجکو — اور ہجیلیوں میں مگر ایک ہجیلا میرا

منہ پہ جب زلف کج خمدار جھکا — صبح روشن پہ گویا ابر گہربار جھکا

ہر گھڑی ہر آن دل میں امتیاز اب یاد کر
واقعہ کو کربلا کے لا نظر میں کر عشرت دش

زلف عارض پہ تری سورہ والیل ضحےٰ — کس نے دیکھا ہے کبھی کفر میں اسلام کہیں
عمر کا شیشہ بہت نازک ہے یہ سنگ اجل — جب کرے گا چور ہی تو ہم عزیزاں پھر کہاں
ساقیا محفل میں تیری کوئی دن مہمان ہیں
دیکھ لیں یہ گریہ مینا جام خنداں پھر کہاں

آب رواں ہو سبزہ ہو اور گلعذار ہو — ساقی ہو جام اور بغل میں نگار ہو
ہووے جو رات چودھویں اور فرش چاندنی — ساغر بلوریں ہات صنم ہمکنار ہو
ہم لب بہ لب ہو آہ جھکیں ایک جام پر — سب لوٹنے مزے کے جو ایسی بہار ہو
شاہ دکن ہی رستم دوراں ہے امتیاز — شافی شفا کو اس کے بھی پر وردگار ہو

مدت سے وہ پیاسا ہے کر فتنہ شتابی سے   لو ہو سے اسیرے ظالم خنجر کو کر آلودہ

پھی کیا کھلبلی جبکہ کہا ساقی نے رندوں سے   تمھاری بزم میں اے میکشو صہبا کو بار آئی

اس سوادل میں نہیں آتا ہے بہتر امتیاز
عشق کے سودے میں نقد دل گنوا بیٹھیے

میرے جگر میں آہ و نالوں کی کیا کمی   پھر جستجو میں اس کے خیالوں کی کیا کمی
صیاد منتظر ہے عبث صید دام کا   دشت جنوں میں آہ غزالوں کی کیا کمی
اس لعل لب کی یاد میں جاتا ہے جی مرا   ورنہ مجھے تو اشک کے لعلوں کی کیا کمی
اس شعلہ رو کے عشق میں اب امتیاز کو   لخت جگر میں آگ کے چھالوں کی کیا کمی

ہم سے نہ پوچھے جو کبھی لذت وصل
عمر گزری ہے ہمیں ہجر میں مرتے مرتے

نہ سمجھیں کفر کو کیا ہے نہ کچھ جانیں مسلمانی   ہمیں دیر و حرم یکساں عبث سب کو ہے حیرانی
شور صحرا میں مرے آنے کی کچھ دھوم سی ہے   عمل قیس کے اٹھ جانے کی کچھ دھوم سی ہے

زمیں سے آسماں تک جلوہ افروزی ہے آدم کی
جو کوئی دیکھے اس خاکی کے ساب کیا کیا جھگڑتے ہیں

دو رباعیاں، ملاحظہ ہوں :-

چلا کر تیر مژگاں کو ہلایا ابرو کماں تو نے   کیا ہے دل ہمارا صید ناحق نوجواں تو نے
کہا یہ کون ہے جو اس طرح دیتا ہے جان اپنی   گلی میں رات کو سن کر مرا شور و فغاں تو نے

شکر اللہ خانہ دل عیش سے آباد ہے   راحت جان جہان ہو کر خوشی سے شاد ہے
شکر حق آتے ہیں اب نواب صاحب مہرباں   چو طرف سے ہے ہجوم اور لیو مبارکباد ہے

ایک مخمس کے دو بند ملاحظہ ہوں :—

وارث ہے دو جہاں میں جو تخت کلاہ کا — ہے شاہ بے نظیر وہ کیا عز و جاہ کا
نیں (نہیں) آسرا ہے اس کے بغیر از پناہ کا — شافع ہے حشر میں جو ہمارے گناہ کا
کیا دل کشا مکاں ہے مری سجدہ گاہ کا

دل نے کیا تھا قول یہ روز الست میں — رہوے گا ہو غلام یہ تا اپنے ہست میں
دیکھا ہے جس نے عالم بالا و پست میں — جا گر چکا ہے ان کے قدم کے نشست میں
کیا دل کشا مکاں ہے مری سجدہ گاہ کا

غزل رباعی کے بعد مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو :—

یہ موسم ہے اے ساقی گلعذار — یہ موسم ہے اے ساقی نو بہار
یہ موسم ہے اے ساقی ماہ رو — یہ موسم ہے اے ساقی مشکبو
یہ موسم ہے اے ساقی سبز رنگ — ترا مجھ سے اب سخت دل مثل سنگ
یہ موسم ہے اے ساقی جور خو — یہ موسم ہے کچھ ہم سے کر گفتگو

.. ..

قسم ہے تجھے اب نبی الھدا — کہ ٹک کان دھر سن میرا ماجرا
قسم ہے تجھے مرتضےٰ کی میری — قسم تجھ کو خیر النسا کی میری
قسم ہے تجھے میرے حسنین کی — قسم ہے میرے جان بے چین کی
رہا نہیں ہے مجھ میں ذرا امتیاز — ہے مشفق کہاں جس سے کہتی یہ راز
تو بہتر ہے اب دوسری کیفیت — رقم ہے کروں اوس کی سب سرگذشت
سنو ہائے اے غم چشیدہ ببات — غم درد آمیز ہے یہ نکات
سنو ہائے اے غم کشیدہ بہ درد — بھر و سن کے تم دم بدم آہ سرد
کہ آنکھوں سے اب مینہ برسنے لگا — تڑپ کر میرا جان جانے لگا
نہ طاقت زبان کو کہ وہ گفتگو — کرے کچھ بھی تقریر جو ہو بہ ہو

.. ..

دیا تب فرشتوں کو رو رو جواب — کروں کیا بیان اب نہیں مجھ میں تاب

اس کے بعد وہ اپنے محبوب شوہر کا تذکرہ اس طرح کرتی ہے :—

کمیت شعر کا ہی نقاشہ سوار — سخن کے اقالیم کا شہریار

کہ تھے شہرا شعار کے کل وہاں ـــ ہزاروں ہی رنگ سے وہ تازہ بیاں
اسی نے کہا شعر بہت آب دار ـــ تھا عرصے میں شعرا کے چابک سوار
وہ سب خوبرویوں میں تھا نامدار ـــ کہ تھا کشور حسن کا تاجدار
شباب گلستان ہوا نوبہار ـــ عجب سبزہ و سیراب وہ گلعذار
کہ تھا نازنین خوش شکل نوجوان ـــ رکھے تیر مژگان و ابرو کماں
کہ جس کی نظر اس پہ جا کر پڑی ـــ وہ کر آہ بے تاب ہو گر پڑی
اسی نوجوان کا تمنا تھا نام ـــ اسد تھا علی کا سنے رو باہ نام
حسین و عجب نازنین خوش جوان ـــ کہ جس پر ہوں آنکھوں سے یہ خونفشاں
جو گردش سے اس چرخ کے وہ جوان ـــ ہوا ہائے زیر زمیں وہ نہاں

اب قصائد کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

دیکھے سے زلف کے ہے عجب پیچ و تاب ہے ـــ ابر سیاہ بجلی پہ جیسے نقاب ہے
مطلع میری زباں سے تقی الفور ہے رواں ـــ دل کا ہے جس سبب سے خانہ خراب ہے
ساقی کے دور میں بھی یہی شراب ہے ـــ خون جگر کا جام کلیجا کباب ہے
جس مخزن جمال کا یہ دل خراب ہے ـــ اوسکو کبھی کبھی لطف گوارہ ثواب ہے
کوشش یہ دل کی سعی کر و امتیاز کو ـــ یہ وقت امتحاں کا بابو تراب ہے

نعتیہ قصیدہ

اور اد اسم ذات کروں لیل اور نہار ـــ قائم اسی پہ رکھو مجھے میرے کردگار
مت کھو تو رائیگاں اسے دل دم کا پاس رکھ ـــ ہر دم ہے اوس کے یاد کا جیوتے رہنا ہو لر
جن و ملک و دیو و پری خوش اور طیور ـــ ہوئیں مطیع تیرے آکر ہو بہ اقتدار
تھے گرچہ بہت صاحب امت پیمبراں ـــ نہ دین کو قیام نہ امت ہے پایدار
ہیگا علی سا قوت بازو ترا اے شاہ ـــ جب ذوالفقار لیوی شہنشاہ کامگار
کیا پوچھنا ہے اوس گھڑی جیسے شجاع کا ـــ کیا دیکھنا ہے اوس کو ہے بروقت کارزار
جن و پری و انس کا اس میں ہے ذکر کیا ـــ آگے نہ ٹھیرا اوسکے سبھی ہوتے ہیں فرار
آکر اگر جلال میں مارے وہ ذوالفقار ـــ گاوی زمین کے پیٹ پہ جا بیٹھے اوسی دھار

حامی ہے امتیاز کے معصوم چاردہ
کوئی بلا نہ آنے دو اس پہ ہے اختیار

اپنے بادشاہ وقت آصف جاہ ثانی کی مدح میں کئی قطعے اور چند قصیدے ہیں قطعے اکثر فارسی ہیں۔ آصف جاہ ثانی کو [illegible] کا خطاب دربار دہلی سے ملا تھا اس کی تہنیت کا قطعہ ملاحظہ ہو۔

ذات والا بہتر از روشن چو مہر و ماہ شد — چوں خطاب از نزد حق اے آنکہ آصف جاہ شد
از برائے آں ہمیشہ فتح و بانصرت توئی — زانکہ از نام تو با نام علی ہمراہ شدہ

ایک قصیدہ کے چند شعر آغاز اور اختتام کے ملاحظہ ہوں۔ جس میں اپنے متعلق بھی عرض حال کرتی ہے۔ غالباً حج کو جانے کا ارادہ تھا۔

ہو کوئی شاہ شہنشاہ با محسن و جواد ہو — زیر فرمان ہو کہ تیرا ہے مطیع منقاد ہو
دو جہان کا ہو مقاصد پہ بھی تو شاہنشاہ — خاطر دل خواہ تری سب طرف سے شاد ہو
اب عنایت اور کرم سے ہے تیرے سر پہ شہا — سایہ گستر مصطفیٰ و آلہ الامجاد ہو
رہے جاری تو ثنا میں سکہ منہ سے حشر تک — کیا فرشتہ کیا پری اور کیا ہے آدم زاد ہو
پوچھنا کیا ہیگا اوسکے جاہ و حشمت کا اے دل — فضل حق سے یہ ریاست جس کو مادر زاد ہو

.. ..

ہیں جہان تک انس و جاں مداح ہیں تیرے مام — مدح میں تیری غزل کو مجھ سے ہے ایجاد ہو
کیا تعجب سب نمک خواروں میں ہوں کمتر میں ایک — کہ عنایت سے میرے پر اس گھڑی امداد ہو
ملتمس کر کر جناب عرش رفعت میں کہوں — خواہش دل یہ ہے بندی کے کہ اب آزاد ہو
تارک دنیا ہے دل واللہ نہیں ہے کچھ خلاف — وصل ہوں مطلب سے جا کر تیرے استمداد ہو
مدعا یہ ہے کہ بھیجے کعبۃ اللہ امتیاز — حرف رخصت اب زبان خاص سے ارشاد ہو

اس دیوان کے آخر میں ایک فارسی غزل درج ہے۔ اس سے واضح ہوسکتا ہے کہ امتیاز کو فارسی پر بھی دست رس تھا چند شعر ملاحظہ ہوں :-

شور دلم اے یار بارض و سما فتاد — لاکن اثر بزدل آہن و شا فتاد
حیرت ربوجان چہ صدائے قیامت است — مفہوم شد کہ دل ز دل دلبر با فتاد
پشت کہ خم شدہ فلک تیرہ روزگا — شاید ز دست آہ من او عصا فتاد
عشق کہ داشتیم ز جان مخفی بدل — در حیرتم چگونہ بعالم صدا فتاد
مارا کسے بعقدہ کشادن چہ حاجت است — کارے تو امتیاز با اہل عبا فتاد

اس تفصیل سے امتیاز کے دیوان کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک اس کی طباعت کا انتظام نہیں ہوا ہے۔ اگر طبع ہو جائے تو ہمدردان اردو کے لیے موجب تشکر ہوگا۔ یہ نایاب قلمی دیوان نواب سالار جنگ (حیدرآباد) کے کتب خانہ کی زینت ہے۔

مثنویاتِ قائم چاند پوری

نثار احمد فاروقی

قائم چاند پوری کے دیوان[1] میں تقریباً پندرہ مثنویاں ہیں۔ نسخہ رام پور میں قائم کی جو مثنویات شامل ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔ اس فہرس میں ہجویہ مثنویوں اور اخلاقی حکایتوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس طرح ان کی مجموعی تعداد ۲۷ ہو جاتی ہے۔ یہ اعداد و شمار رسالہ معارف جلد ۹۶ شمارہ ۴ سے لیے گئے ہیں :۔

(۱) مثنوی شدتِ سرما، ۵۶ شعر (۲) مثنوی عشقِ درویش، ۳۶۱ شعر (۳) مثنوی رمز الصلوٰۃ، ۱۶۹ شعر (۴) مثنوی قضا و قدر، ۶۸ شعر (۵) مثنوی درد قولنج، ۲۲ شعر (۶) مثنوی مردِ عیار، ۸ شعر (۷) مثنوی بندۂ درگاہ، ۷ شعر (۸) مثنوی سکندر و ارسطو، ۱۳ شعر (۹) مثنوی در صفت ہولی، ۵۴ شعر (۱۰) مثنوی زنِ اوباش، ۴ شعر (۱۱) مثنوی گرگ و گوسفند، ۱۶ شعر (۱۲) سان تراشی (کذا)، ۵ شعر (۱۳) مردِ طریق، ۱۱ شعر (۱۴) ہوس، ۱۲ شعر (۱۵) زنِ سبو بردار، ۱۲ شعر (۱۶) مردِ عارف، ۶ شعر (۱۷) پدر و پسر، ۱۰ شعر (۱۸) دو دوست، ۱۵ شعر (۱۹) استاد، ۴ شعر (۲۰) مردِ عالی مقام، ۷ شعر (۲۱) ہجوِ حافظ نابینا، ۴۴ شعر (۲۲) ہجوِ خارش، ۱۰ شعر (۲۳) ہجوِ کوزی، ۲۷ شعر (۲۴) ہجوِ حجام، ۲۵ شعر (۲۵) ہجوِ کیچڑ ملبسولی، ۳۶ شعر (۲۶) ہجوِ پتنگ باز، ۵۵ شعر (۲۷) ہجوِ شیخ، ۴ شعر۔

ان میں دو مثنویاں تو بہت طویل ہیں یعنی "قصہ عشقِ درویش"[2] جس میں ۳۴۳ اشعار ہیں۔ بعض روایتوں میں اشعار کی تعداد ۳۵۹ یا کم و بیش بھی ہے نسخہ رام پور میں ۳۶۱ اشعار ہیں۔ دوسری "مثنوی حیرت افزا" جو ۴۰۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسری مثنویوں کی فہرس یہ ہے :۔

(۱) مثنوی در ہجو کاذب۔ اس میں ۵۶ اشعار ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے :

آہ کیا ہو گئے وہ لیل و نہار

کہ کہو مرکو جھوٹ سے تھا عار

---

[1] قلمی نسخہ انڈیا آفس (لندن) محب مکرم ڈاکٹر مختار الدین احمد (ریڈر شعبہ علوم اسلامی علی گڑھ) کا ممنون ہوں جن کی توجہ سے اس نسخے کے مطالعے کا موقع ملا۔

[2] اس میں پنجاب کے ایک درویش کی داستانِ معاشقہ نظم کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے رسالہ سب رس، (فروری ۱۹۶۰ء) میں ملاحظہ ہو راقم الحروف کا مضمون بہ عنوان "قائم کی ایک عشقیہ مثنوی" [کلیاتِ سودا، طبع نولکشور ۱۸۸۷ء صفحات ۲۱۵ تا ۲۲۶]

(۲) مثنوی در ہجو طفل پتنگ باز۔ اس میں ۵۵[1] اشعار ہیں اور ابتدا یوں ہوتی ہے ۔

ایک لونڈا پتنگ کا ہے کھلاڑ ۔ دور ہیں اس کے ...... ہے ہزار

یہ مثنوی فحش ہے

(۳) مثنوی در ہجو[2] ...... یہ بھی فحش ہے اور کسی غیر معروف شخص کی ہجو میں ہے مجمع الانتخاب میں عنوان "در مذمت گوزی" ہے اس میں ۴۴ اشعار ہیں۔ نسخہ رامپور میں ۴۲ شعر ہیں۔ ابتدا یوں ہوتی ہے :

یاں جو کوئی غنی ہے یا محتاج ۔ چاہیے یہ کہ جانے قدر اناج

(۴) مثنوی در ہجو حجام ۔ اس میں ۵۳[3] اشعار ہیں اور قائم نے کسی مُوتراش کی ہجو میں لکھی ہے ۔ ابتدا یوں ہے :

اب جو حجّام اپنے ساتھ ہے یاں ۔ سو وہ بھڑوا، پلشت، گندہ دہاں

(۵) مثنوی در ہجو خارش ۔ کھجلی کی ہجو میں ۳۶[4] اشعار کی یہ مثنوی یوں شروع ہوتی ہے :

خارش کی ہے اس ہوا میں یہ دھوم ۔ لگتا ہے ہر اک بہ شکلِ مجذوم

(۶) مثنوی در ہجو کیچڑ بسولی ۔ قصبۂ بسولی میں برسات کی وجہ سے راستوں کی جو حالت ہو جاتی اس کا نقشہ کھینچا ہے مثنوی میں ۵۳[5] اشعار ہیں ۔

اے خامہ یہ کہہ تیری ہے کیا فکر ۔ کیچڑ کا بسولی کی ہے یاں ذکر

(۷) مثنوی در ہجو شدّت سردی ۔ یہ مثنوی بھی غلطی سے سوؔدا کی طرف منسوب ہوتی رہی ہے[6] مگر اصل میں قائم کی تصنیف ہے اس میں ۵۸[7] اشعار ہیں۔ ابتدا یہ ہے :

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید ۔ صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

(۸) مثنوی در ہجو اکول ۔ ۴۰ اشعار کی یہ مثنوی کسی حافظ کی فدح میں ہے جو کھانے کا بہت شوقین تھا نسخہ رامپور میں ۴۴ شعر ہیں اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

ایک حافظ ہم سے آشنا ہے ۔ کھانے کا وہ جی سے مبتلا ہے

(۹) مثنوی در صفت ہولی ۔ اس میں ۵۴[8] اشعار ہیں اور ہولی کا منظر بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے ۔ موضوع کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس مثنوی کے کچھ منتخب اشعار یہاں درج کر دیے جائیں :

دلا آج کچھ کہہ تو کیا ہے سبب ۔ کہ جوں غنچہ ہر دل ہے محوِ طرب

---

[1] مجمع الانتخاب (قلمی) میں تعداد اشعار ۵۲ ہے ۔ [2] مجمع الانتخاب میں ۴۳ اشعار ہیں [3] نسخہ رامپور میں ۴۵ شعر ہیں ۔

[4] مجمع الانتخاب میں ۳۵ شعر ہیں نسخہ رامپور میں اس کے صرف ۱۰ شعر دیے ہیں ۔ [5] نسخہ رامپور میں ۳۶ اشعار ہیں ۔

[6] کلیات سودا، طبع نولکشور، ۱۸۸۷ء ص ۱۸۸ تا ۱۹۰ ۔ [7] نسخہ رامپور میں ۵۶ اشعار ۔ نسخہ رامپور کے اشعار کی تعداد میں نے اپنی تحریری یادداشت کے علاوہ رسالہ معارف اعظم گڑھ جلد ۶۹ شمارہ ۴ تا ۶ مطابق اپریل تا جون ۱۹۵۲ء سے بھی حاصل کی ہیں ۔ معارف کے مذکورہ شماروں میں جناب محمد علی خاں اثر رامپوری کا مضمون بہ عنوان "قائم چاندپوری اور ان کا کلام" شائع ہوا تھا] [8] نسخہ رامپور میں تعداد اشعار ۴۴ ۔

نہ گل ایک پھولا سماتا نہیں
بہم لب کلی کا بھی آتا نہیں

ابھرتا ہے مستی سے مے کا حباب
ہے بالیدہ شادی سے موجِ شراب

نہیں آج حالت سے مستی کی دور
کہ جوں غنچہ ابلے دلوں سے سرور

ہے لبریز مستی چمن یاں تلک
کہ نرگس کی گردن گئی ہے ڈھلک

ہزارا لیے جام ہے انتظار
کھڑا ہے رکھے سر بہ خُم کو کنار

کہ گر محتسب کا ہو ادھر مرور
پلا دیں اسے یک دو ساغر بزور

اُڑانے کا ہے کیف، لالہ کو بیم
نشے سُرخ میں گھولتا ہے افیم

جہاں ہاتھ میں گل کے دیکھا ہے جام
طلب میں پسارا ہے غنچے نے کام

زبس اہلِ عالم ہیں محوِ شراب
ہے ممنوع اس دور میں صرفِ آب

نہ جوں شیشہ اک تن کو دیکھے گا تو
کہ ہووے وہ مے سے نہ تر تا گلو

ہے مستی سے یہ حال عالم تباہ
کہ ملّا نے گم کی ہے مسجد کی راہ

جو وعظ کہ زاہد کے یاں خاص ہے
ہے دکانِ خمّار میں رہنِ مے

جواب دیر کی راہ سے آئے ہے
نبلے پاؤں قاضی نکل جائے ہے

ہم رند و زاہد مے آشام ہیں
مگر یہ کہ ہولی کے ایّام ہیں

خوشا موسمِ عیش و عہدِ نشاط
کہ عالم کو ہے یاں تلک انبساط

جو بڑھیا غمِ فرقت سے تھی خرف
بجاتی ہے دن رات چلنی سے دف

ہے کیا ان دنوں تنگدستی سے عار
اک عالم کا ہے فاقہ مستی شعار

اگر حال دریا پہ کیجے قیاس
عجب کچھ ہے واں کے اجزا کا حال

کھلا رہ گیا ہے دہانِ صدف
لبِ جو سے جاری ہیں مستی میں کف

جو تر کر کے بہا گئے ہے موجِ آب
ہے نیچے لیے قمقمے کو حباب

یہ غالب ہے گرداب پر وجد حال
کہ جز رقص بھولا ہے سیدھی وہ چال

عجب کیا جو یہ حال نہیں ہوں پدید
نہیں عالمِ آب سے کچھ بعید

دفوں کا زبس شور ہے ہر طرف
ہر اک کان باجے ہے مانند دف

نہ تنہا زمیں کو ہی زلزل ہے
یہی آسماں کا بھی احوال ہے

ستاروں نے ہر سمت کھینچی ہے صف
بغل میں لیے ماہ پھرتا ہے دف

نہ اک زہرہ ہے محوِ خنیاگری
بجاتا ہے مریخ بھی کھنجری

ہے خوشے سے پروین کے روشن یہ بات
کہ اکٹھا ہوا چوہٹی کا یہ سات

جہاں گھر سے باہر ہو مہرِ منیر | ملے صبح چہرے کو اس کے عبیر
جیسے چرخ و انجم کہیں ہیں عوام | ہے اک خوان پُر نقلوں سے تمام
ہر اک سمت عالم میں ہے شور و شر | ہے ہر نا خبر آپ سے بے خبر
نہ واعظ کو مسجد کے منبر سے کام | نہ مسجد میں اب مقتدی نے امام
ہے کتوالِ شہر اس قدر بے وقار | کہ نت اس پٹھیاریوں کی ہے مار
زبس ہر گلی میں ہے لڑکوں کا شور | ہے کیچڑ میں ہر راہ رو شور بور
جو با آبرو یاں ہے دولاب دار | نت اس کے گلے میں ہے جوتی کا ہار
لیے ہاتھ پچکاریں خوب رُو | رکھیں ہیں ہر اک سمت چندیں غلو
کسی پر کوئی چپکے پھینکے ہے رنگ | کوئی قمقموں سے ہے سرگرم جنگ
کسی نے لگائی ہے کونے میں گھات | کہ بازی میں خلوت کی ہے لاگ بات
نگاہیں کسو کی ہیں یاں حرف جوش | ہے ابرو سے کوئی اشارت فروش
کسی کا کوئی کھولتا ہے نقاب | کوئی محوِ بازی میں ہے بے حجاب
ہے ڈوبا کوئی رنگ میں سربسر | فقط آب میں ہے کوئی تر بتر
زبس رنگ کی ہر طرف مار ہے | جہاں یک قلم زعفران زار ہے
دعا پر کر اب قصہ قائم یہ حرف | کہ طولِ سخن تجھ سے ہے بس شگرف
الٰہی ہے جب تک کہ یہ شور و شر | ہو عالم میں ہولی سے باقی اثر

کنور کے سبب چاند پور میں مدام
رہے برج سے جوگنی دھوم دھام

(۱۰) مثنوی درویش۔ اس مثنوی میں ۶۹[1] اشعار ہیں۔ نسخہ رام پور میں ایک شعر کم ہے۔ اس میں دکن کے ایک حجام کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے گھر میں گھس کر ایک بھیڑیے نے بچوں کو کھا لیا تھا۔ اس غم میں حجام نے کنوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی اور آخرکار اس کی بیوی نے بھی چھری سے اپنے تئیں ہلاک کر لیا۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

رات ایک فقیر بے سروپا | کہتا تھا یہ حال عبرت افزا

(۱۱) مثنوی قصہ بنگ خور۔ یہ ۹ شعروں کی مختصر سی مثنوی ہے جس میں ایک بنگ نوش کا قصہ بیان کیا ہے:

تھے اک بنگی لیکن نوآموز سے | کچھ افراط انھوں نے کی ہر روز سے

(۱۲) مثنوی رمز الصلوٰۃ۔ یہ ۲۵۲ اشعار کی مثنوی ہے[2]۔ اس میں نماز کے اوصاف اور فوائد بیان کیے ہیں۔ درمیان میں بعض

---

[1] نسخہ رام پور میں ۷۰ اشعر ہیں۔

تمثیلی قصے بھی آگئے ہیں انہی میں پورب کے ایک جوان اور ایک حسینہ کے عشق کا قصہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ حسینہ خود کنیز کا بھیس بدل کر اس کے پاس گئی اور اس سے اختلاط کیا پھر اسے مغالطے میں رکھا کہ ہماری بی بی سے کل آکر ملو جب یہ پہنچے تو اس نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ تمہیں مجھ سے عشق صادق نہیں بوالہوسی ہے' وغیرہ۔ یہ مثنوی اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

بنامِ طراز ندۂ جسم و جاں　　　کہ رکھتا ہے ہر تن میں حکم رواں

(۱۳) مثنوی در حکایت[1] — یہ ۲۳ شعروں کی ایک مختصر مثنوی ہے جس میں ایک تمثیل بیان کی گئی ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے:

عجم کے زمانے کا تاریخ داں　　　یہ لکھتا ہے احوالِ وارفتگاں

(۱۴) مثنوی قصۂ عشقِ درویش۔ یہ مثنوی ۲۶۱ اشعار پر مشتمل ہے اور غلطی سے کلیاتِ سودا میں بھی شامل ہو گئی ہے۔ اس میں پنجاب کے ایک درویش شاہ لدھا کی داستانِ معاشقہ ہے۔ یہ قصہ سب سے پہلے اورنگ زیب کے ابتدائی دور میں کسی شاعر نے فارسی زبان میں لکھا تھا بعد کو قائم چاندپوری، مرزا علی لطف اور راسخ عظیم آبادی نے بھی اسے نظم کیا۔ آغاز کا شعر یہ ہے ؎

الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل　　　تب دل دے بقدر خواہشِ دل

(۱۵) مثنوی "قصۂ نٹ" مسمّٰی بہ حیرت افزا۔ دیوانِ قائم نسخہ انڈیا آفس لندن میں یہ مثنوی ورق ۱۸۲ (الف) سے شروع ہوتی ہے اور ورق ۲۰۰ (ب) تک چلی گئی ہے اس میں ۴۸۷ اشعار ہیں اور ایک نٹ کی بازی گری کا قصہ بیان ہوا ہے۔ دیوانِ قائم کے نسخہ رام پور میں یہ مثنوی نہیں ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

سزاوارِ حمد و ثنا ہے وہ اسم　　　کہ باندھا ہے جن نے فلک سا طلسم

حمد و نعت کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ:

شب اک مرد دانائے فرخندہ رائے　　　کہے تھا یہ احوالِ حیرت فزائے
کہ تھا ہند میں پیش ازیں ایک شاہ　　　نہ شہ بلکہ خورشیدِ انجم سپاہ
عجب وقت تھا اور عجب روزگار　　　کہ تھا اہلِ فن کا یہ عزّ و وقار
اک اس وقت میں ہم نے سیکھا ہنر　　　کہ ہے یاں ہنر عیب سے بھی بتر
جو ہر ہاتھ میں اب جواہر ہیں گہر　　　نہ تھے خاک کوئی چہ جائے کہ دُر
دیا عیش کو ان کے اک دن رواج　　　کہ ہو منعقد جشن کی بزم آج
ہیں اس شہر میں اہلِ فن جس قدر　　　سب اپنا وہ دیں آکے عرضِ ہنر
نشیمن میں بیٹھا شہِ مسلمین　　　صدا اٹھی ہر سمت سے "یہ دیں دیں"

غرض جشن کا آغاز ہوا۔ بہت سے بازی گر حاضر ہوئے اور زمیں خدمت چوم کر انھوں نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اسی اثنا میں ایک بازی گر مع اپنی جوان اور خوبصورت بیوی کے پیش ہوا اور اپنے کرتب دکھانے کی اجازت چاہی۔ قائم نے اس عورت کا سراپا بھی کہے

---

[1] یہ بھی غلطی سے سودا کی طرف منسوب ہے لیکن اصل میں قائم ہی کی زائیدہ فکر ہے۔ [دیکھو کلیات سودا صفحات ۲۱۲ و ۲۱۳]

لے لے کر بیان کیا ہے :

نہ بازی گر اک آ کے حاضر ہوا — کھڑے ہو کے کی دو رشتہ کو دعا
کہ اوّل پس از رخصتِ شہریار — ہوئی ایک زن ان سے سرگرمِ کار
لگی بجنے ڈھول گت پر دو سو — ہوئی کچھ کے وہ رشکِ مہ دو برو
کروں کیا میں صورت کا اس کی بیاں — کہ ہر عضو اس کا تھا آشوبِ جاں
تھی خلقت سے اس آب و گل کی بری — نہ جانے کہ تھی حور، وہ یا پری
جو تھا قد میں اس کے "نکیلا پناں" — کہاں پائی برچھی نے ایسی سناں
نہ تھے ایک بال اس کے جی کا وبال — لیے جاتا تھا دل کو چہرے کا خال
کہوں کیا تبسم کی اس لب کے بات — گویا موج مارے ہے آبِ حیات
لگے جس کی آنکھ اس کے سینے کے ساتھ — جیسے جب نک مارے سینے پہ ہاتھ
کچ اس کے کہ تھے سب بدن کے امول — بنائے تھے یہ دستِ قدرت نے گول
گویا وقت خوبی کی تعمیر کے — ڈھلے ہیں یہ سانچہ میں تقدیر کے
تھی یہ صاف و نرم اس پری وش کی گات — صفا کہہ کیا جن نے مخمل کی بات
بہر حال جس دم وہ رشک و پری — ہوئی مستعد بہرِ بازی گری

چنانچہ اس نٹنی نے بانس پر چڑھ کر تماشا دکھایا اور حاضرین سے خراجِ تحسین وصول کیا :۔

سماں یہ تھا واں ہر قدم آشکار — کہ جوں شعلہ رقصاں ہو بالائے شرار
ہے جیسے کہ رقصندگاں کا سبھاؤ — بجاتی تھی گھنگھرو بتاتی تھی بھاؤ

اس کے بعد نٹ کے کرتب دکھانے کی باری آئی اس نے بھی نئے نئے شعبدے دکھائے :۔

رکھے تھا یہ سر نوکِ خنجر پہ یوں — کہ ہو اوس کی بوند کانٹے پہ جوں

یہاں قائم نے قصے میں اخلاقی پہلو پیدا کیے ہیں اور اسی ضمن میں بعض تمثیلات سے کام لیا ہے۔ نٹ کو بادشاہ نے بہت سے انعام و اکرام سے نوازا اور اس کے کمالِ فن کی تعریف و تحسین کی۔ اب نٹ کہنے لگا کہ حضور مجھے اجازت مرحمت فرمائیں تو میرا ارادہ تجم سے جنگ کے لیے جانے کا ہے اس نے میرے باپ دادا کو بے قصور ہلاک کیا تھا میں اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں اگر میں واپس آ گیا تو خیر ورنہ میری نٹنی حضور کے پاس بطور امانت رہے گی۔

کہا شہ نے کا سے مردِ بیہودہ گو — یہ کیا بات بیہودہ کہتا ہے تو
کہیں بھی تری بات کا کچھ ہے ڈھنگ — کرے کس طرح تجم سے انسان جنگ
پہ نٹ نے وہیں کر کے شہ کو سلام — کمر کس کے ہتھیار باندھے تمام
اُڑا اور ہوا اس کے اُڑنے کا شور — اُڑے جس طرح مرغِ وحشی بہ زور

لگی کہنے نٹنی کہ اے بادشاہ! ہوا گرم واں عرصۂ رزم گاہ
جو چلتا نہیں چرخ پر تیغ و تیر تو کیوں حالِ دوراں میں آیا تغیر
اسی طور سے تھی یہ واں گفتگو کہ ٹپکا کچھ اک آسماں سے لہو
جو نٹنی نے دیکھا وہ آنکھوں سے خون گیا اس سے یکبار صبر و سکون
کہا اے وائے زخمی ہوا وہ جواں کہ مانگے تھا جس سے فلک الاماں

غرض نٹنی نے آہ و فریاد شروع کی۔ بادشاہ اور حاضرین کو یقین ہو گیا کہ نٹ آسمان پر جم سے جنگ کرتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔ اس نٹنی نے وہ تازہ خون اپنے چہرے پر مل لیا اور بین کر کے رونے لگی۔ آسمان سے ایک ایک کر کے نٹ کے اعضا بھی گرے جنہیں فراہم کر کے اس کی ارتھی تیار کی گئی۔ نٹنی نے ارتھی کے ساتھ ستی ہونے کا ارادہ کیا تو بادشاہ نے اسے سمجھایا کہ کیوں ناحق اپنی جان گنواتی ہے۔ لیکن وہ باز نہیں آئی جب بادشاہ نے اسے فرطِ شوق سے بے قرار اور آتشِ عشق کو ملتہب پایا تو اسے اجازت دینے پر مجبور ہو گیا چناں چہ نٹنی نے حمام کر کے لباسِ فاخرہ پہنا اور سنگار کیا، تمام زیور پہنے اور خوب سج بن کر نکلی۔ اپنے شوہر کے اعضاء کو جمع کر کے جوڑا، ارتھی تیار کی، ارتھی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر چلی۔ خلقت کا بڑا انبوہ ساتھ ساتھ ہو لیا۔ صحرا میں ایک جگہ پہنچ کر عود و صندل کی لکڑیاں فراہم کیں اور جب چتا تیار ہو گئی تو اس میں نٹنی بیٹھ گئی اور نٹ کے مُردے سے باتیں کرنے لگی۔

کہ آخر ہے اب وقتِ تنگ چشم کھول!
لبِ لعل سے اپنے عاشق سے بول

آخر چتا میں آگ لگائی گئی اور دونوں جلنے لگے۔ تھوڑی دیر میں جل کر راکھ ہو گئے۔ سب لوگ وہاں سے بڑی حسرت لے کر واپس ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد سے بادشاہ کو سخت حیرت اور تشویش لاحق رہی۔ کھانا پینا اور سونا بھی حرام ہو گیا۔ اسی غم میں گھلنے لگا۔ طبیبوں نے دوا دارو میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا مگر بادشاہ کے دل سے اس واقعے کا غم محو نہ ہوتا تھا۔ ساری رنگ رلیاں بھول گیا۔

اعیانِ دولت نے ایک دن صلاح کی کہ بادشاہ کی دل جوئی کے لیے پھر ایک بزمِ جشن منعقد کریں شاید اسی سے غم غلط ہو بڑے کرّ و فر کے ساتھ جشن کا انتظام ہوا اور دور دراز شہروں سے نامی گرامی بازی گر اپنے ہنر کا مظاہرہ کرنے کے لیے جمع ہوئے عین جشن کی حالت میں وہ نٹ جو پہلے آسمان پر جنگ کرتے ہوئے ہلاک ہو چکا تھا اور اس کی لاش ستی کر دی گئی تھی اچانک پھر آدھمکا لوگوں کو سخت حیرت ہوئی اور یہ سمجھے کہ یہ نٹ نہیں اس کی خبیث روح ہے جو متشکل ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ نٹ نے بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور کے اقبال سے میں نے جم کو شرق سے غرب تک ہرا دیا ہے اور اس کی ساری فوج کو مار بھگایا۔ اب میں حاضر ہو گیا ہوں میری لونڈی مجھے مرحمت فرما دی جاوے۔ بادشاہ نے کہا۔

کہا شاہ نے کا اے مردِ صاحب ہنر خدا سے ڈر اتنی ڈھٹائی نہ کر!
وہ زن ساتھ تیرے بصد درد و غم اسی روز جل کر ہوئی تھی بھسم

یہ بات میں ہی نہیں کہتا ایک عالم اس کا چشم دید گواہ ہے۔ نٹ نے کہا کہ مجھ سے یہ "بازی گری" کرنے کی کیا ضرورت ہے اگر وہ عورت

آپ کو پسند آگئی ہے تو صاف کہہ دیا جائے۔ جھوٹ بول کر ایمان خراب کرنے سے کیا فائدہ ہے۔

غرض بعد ہنگامہ ٹھہری یہ رائے	کہ نٹ دیکھ لے چل کے خلوت سرائے

نٹ بادشاہ کے محل میں پہنچا اور اس نے وہاں جاکر آواز دی کہ بادشاہ نے تجھے کہاں بند کر دیا ہے؟ جہاں ہو آواز دے۔

دیا نٹ کو پردے سے زن نے جواب	کہ لی تیں خبر خوب میری شتاب
رہی اتنی مدت میں عیش نکل ساتھ	کہوں کیا کہ ناگفتنی ہے وہ بات

یہ جواب سُن کر نٹ نے پردہ اٹھایا تو وہ عورت اسی طرح زیب و زینت سے آراستہ پیراستہ نکلی۔

کہا نٹ نے کا سے بادشاہا ہیں	امانت پہ تیری ہزار آفریں
کہ اس قحبۂ گندہ کس کے لیے	یہ سب شاہِ عالم نے حیلے کیے

بھلا بادشاہ کو میری امانت میں خیانت کی کیا ضرورت تھی اگر یہ نٹنی حضور کو پسند تھی تو میں اس سے دست بردار ہو جاتا۔ جب نٹ نے ایسی ہی حیرت انگیز اور ظرافت آمیز باتیں کیں تو بادشاہ کو انبساط ہوا اور اس کے دل سے غم کا اثر دور ہوا۔

یہ مثنوی یہاں تمام ہو جاتی ہے۔ اب اس کے آخر میں قائم نے کچھ اپنی کیفیت لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں "پراگندہ روزی پراگندہ دل" ہو رہے تھے اور شعر و سخن سے بھی کچھ زیادہ قلبی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ یہ اشعار ان کے سوانح نویس کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں:۔

کہاں تک یہ افسانہ ہائے کہن	کہ اب حال پر اپنے ختم سخن
کہ ہے ان دنوں دل پہ یہ اضطرار	کہ ہے زندگی موت سے ناگوار
جس انداز سے دل میں کھٹکے ہے سانس	کھٹکے وہ خلش کب جراحت میں پھانس
لیا ہے یہ سب فقر و فاقہ نے گھیر	کہ خوش ہوں اگر آؤں جینے سے سیر
سو دن کو دو دن فکر روزی میں جان	تو جز اشک کے آب و دانہ کہاں
کبھو جی کو غم سے رہائی نہیں	خوشی سے گویا آشنائی نہیں
یہ شعر و سخن سے ہے دل کو ملال	کہ گزریں ہیں اس فکر کو ماہ و سال
مگر غم نے ایسا ہی دل خوں کیا	تو کوئی مصرع آہ موزوں کیا
ہو جس شخص پر زیست یاں تک محال!	بھلا جمع کیوں کر ہو اس کا خیال
وہ جانے جسے اس میں کچھ ہو شعور	کہ اس کام کو ہے فراغت ضرور
سو اس حال میں ایک مشفق نے رات	کہی مجھ سے از راہِ شفقت یہ بات
کہ لے کاغذ و خامہ اور سوم کر	یہ قصہ ہے نادر اسے نظم کر
مرتب ہوا جب بچندیں شتاب	دیا "حیرت افزا" میں اس کو خطاب
سو خدمت میں تیری ہے لب بہ سوال	کہ ہوں میں کرم پیشہ اہلِ کمال

کسی خورد کا عیب دیکھیں ہیں گر　　بزرگی سے جانیں ہیں اس کو ہنر
ہوا ہے یہ سنہ میں نامہ رقم　　ہے بارہ سو ہجری بیاں سات کم

اس کے آخر میں لکھا ہوا ہے: "تمام شد مثنوی حیرت افزا تصنیف بیاں قائم صاحب سلمہٗ اللہ تعالیٰ" اس کے آخری شعر سے یہ علم ہوتا ہے کہ ۱۱۹۳ھ میں یہ مثنوی لکھی گئی اور قائم نے اسے ایک نشست میں لکھ لیا تھا۔ قائم کے اس بیان پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ قادر الکلام اور زود گو شاعر تھے اور یہ قصہ انھوں نے تفنن طبع کے لیے لکھا تھا۔

فنی محاسن کے اعتبار سے یہ مثنوی اس عہد کی مثنویوں میں ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں بیان پیچیدہ نہیں رواں اور سلیس ہے۔ بعض حصے خصوصاً شہزادی کا سراپا اور اس کا نٹ کی موت پر فریاد و زاری کرنا بہت اچھے نظم ہوئے ہیں۔ قصے کے اعتبار سے یہ خالص ہندستانی قصہ ہے مگر اس کے نوک پلک اور سنوارے جاتے تو تکنیک کا حسن بھی پیدا ہو جاتا۔ اس کا خاتمہ تحیر پیدا نہیں کرتا حالانکہ قصہ میں تحیر موجود ہے لیکن نظم میں اس کا اظہار اچھی طرح نہیں ہو سکا ہے۔ بعض حصے غیر ضروری طور پر طویل بھی ہو گئے ہیں لیکن تناسب کی یہ کمی ایسا نقص ہے جس میں یہ مثنوی واحد نہیں ہے اس دور کی تقریباً سبھی مثنویوں میں یہ سقم ملتا ہے۔ یہ بات بھی خاص طور سے غور طلب ہے کہ مثنوی حیرت افزا میر حسن کی سحر البیان سے پہلے تصنیف ہوئی ہے اور یہ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ شمالی ہندستان میں مثنویوں کے لیے فنی میدان بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں پوری طرح ہموار ہو چکا تھا اور اس کا اظہار پہلی بار سحر البیان ہی میں نہیں ہوا ہے۔[1]

میر ناصر علی کا صلائے عام

عابد رضا بیدار

اپنی بعض منفرد خصوصیات کے لحاظ سے بعض اعتبارات سے یہ اپنے عہد کا سب سے زیادہ باوقار رسالہ تھا۔ ۱۹۰۸ء سے اکتوبر ۱۹۳۲ء تک (مئی ۱۹۱۰ء سے مارچ ۱۹۲۳ء تک یہ بند رہا) اس کے دو ڈھائی سو پرچوں کی ورق گردانی کیجئے۔ دوران میں بہت کچھ ملا اور اسی میں کہیں نہ کہیں ہر پرچے میں بے حد پیاسا میر ناصر علی ملا۔ دلوں میں اپنی شہرت اور عظمت کا ایک تاج محل بنا دینے کی کتنی پیاس تھی اس شخص کے دل میں! شاید یہ پیاس ہر صحافی کی فطرت ہوتی ہے اور اس خواب کی تعبیر بہت کم کا مقدر ہوتی ہے۔ یہ خواب خلوص مانگتے ہیں، اتنا خلوص جس میں یہ خواب اتنے گہرے میں ڈوبیں کہ پھر لاشعور میں بھی کبھی نہ ابھر سکیں —— پھر اس خلوص کے پجاری اس کی ایک ایک سطر کے ایک ایک حرف کو اپنی رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کا جزو بنا لیتے ہیں۔

مجھے اس میں شبہ ہے کہ میر ناصر علی میں خلوص کی یہ گہرائی موجود تھی! شاید اسی لیے اپنے پرچے میں پیہم اپنی تشہیر کرتے رہنے کے باوجود، ریاض، مہدی، نیاز، گرامی، شرر اور دوسرے ہم عصر مشاہیر کے نجی خطوط کی اشاعت جس کا ایک ذریعہ تھی، زمانے نے حس کی قوت سے شاید میر صاحب قطعاً بے خبر تھے میر صاحب کو ان کے بعد دو چار سال بھی یاد رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ زمانہ کتنا سچا، کھرا اور بڑا نقاد ہے اس کا اندازہ ہم میں سے بھی بہتوں کو نہیں ہوگا۔ میر صاحب تو پھر ایک ایسے ماحول کے پروردہ تھے اور ایسے لوگوں کی دوستی انھیں حاصل تھی کہ وہ یہ باور کرنے پر قطعاً مجبور ہو گئے ہوں گے کہ سچ مچ اردو کی آبرو انہی کے دم قدم سے قائم ہے اور رہے گی ——!

"میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں۔" مہدی نے انھیں لکھا۔

"غالب اپنی طرز کے موجد تھے یہ اپنی طرز کے۔" ریاض خیر آبادی نے کہا۔

"صلائے عام کا شباب تھا اور میرا بھی۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میں اس کا پرستار تھا اور وہ میرا معبودِ خیال۔ قلم سے لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن دل سے لکھنے والا صرف ایک میر ناصر علی تھا۔" نیاز نے خراجِ تحسین پیش کیا۔

سیماب نے ان کے انتقال پر لکھا:

آہ وہ اُردو میں وارفتہ نگاری اب کہاں
حسن کی مے میں حدیثِ بیقراری اب کہاں

اے جہان آباد کی آوازِ آخر الوداع!

گرامی نے کہا۔

مزہ واکن کہ بود نازشِ دہلی امروز
میر ناصر علی، آں مرتبہ دان دہلی

غرض کس کس نے کیا کیا نہیں کہا اور کبھی فرصت ہو تو رسالے عام کا فائل دیکھیے جس میں ان لوگوں کے علاوہ اختر شیرانی، تاجور، یکتا، وحشت کلکتوی، صفدر مرزاپوری، شاہ دلگیر، شوق قدوائی، یگانہ، طباطبائی، مرزا سلطان احمد، حکیم برہم اور دوسرے ہم عصر مشاہیر کے بیسیوں خطوط ملیں گے، ہر ایک کی زبان پر میر ناصر علی کا نام ہے جن کے دم سے اُردو کی آبرو قائم ہے۔

مجھے بھی ان کی دو ایک تحریروں میں بڑا لطف آیا۔ خاص کر ان کے ادارئیے جو انشائیہ کا بڑا حسین نمونہ پیش کرتے ہیں لیکن مسلسل ایک رنگ دیکھتے دیکھتے طبیعت اُکتا جاتی ہے۔ اس دور کے لوگوں کے لیے یہ یقیناً اسی تعریف کے مستحق رہے۔ خالص ادب برائے ادب کی اُردو میں اگر کوئی مثال نہ مل سکے تو میں کم سے کم میر ناصر علی کو قطعیت کے ساتھ پیش کر سکتا ہوں۔ تخیل کی بے روک ٹوک اڑان اور وارفتہ نگاری یہ سب ان کی تحریر کی خصوصیت اور اس میں کبھی کبھی مزا آ سکتا ہے لیکن اندرونی جان قطعی مفقود ہے۔ اس کا سبب ایسے سمجھئے کہ میر صاحب کے خطوں سے میں دو اقتباس پیش کرتا ہوں، اس سبب کی طرف بھی اشارہ ہو جائے گا، میر صاحب کا طرزِ فکر بھی سامنے آ جائے گا اور ان کا منفرد انداز بھی۔ انصار ناصری نے یہ خط "نقوش شخصیات نمبر" میں نقل کیے ہیں:

"
بیٹا!

میری آرزو یہ ہے کہ کتب خانے والا امکان تکلف سے آراستہ ہو جائے اور میں دن رات وہیں پڑا رہوں۔ نہ اگر ساتھ چائے پینے آجاؤ تو کیا کہنا مگر کوئی معمولی ذکر کسی کا نہ ہو۔ کھانا جو بھوک لگے پکا پکایا مل جائے اور لڑکیوں میں کوئی آکر کھلا جائے۔ کوئی نایاب کتاب یا چیز نظر آئے تو مجھے اتنا مقدور ہو کہ فوراً خرید لوں۔ رات کو بے فکر سوؤں اور صبح خوش اٹھوں کوئی مسئلہ فلاسفی کا جو سمجھ میں نہ آتا ہو اسے سمجھ لوں اور دوسروں کو سمجھا سکوں۔ دنیا کی جتنی کتابیں دل و دماغ کو خوش کر سکیں سب میرے پاس ہوں۔ جاڑے میں انگیٹھی ہو اور گرمیوں میں برف برسات میں کمرے کے اندر بیٹھا ہوں اور وہ ٹپکتا نہ ہو۔ رات کو جلانے کے واسطے خوبصورت CANDLE STICK کی روشنی ہو ——— اور جو کتاب مجھے پسند ہو وہ میرے سامنے ہو۔
تم اتنا سامان کر دو تو ———

I WILL DIE HAPPY

بیٹا!

...... میں نے ولایت تو درکنار سمندر، جہاز، کلکتہ، بمبئی، مدراس وغیرہ بھی نہیں دیکھے مجھے تمام دنیا میں ہندوستان، ہندوستان میں دلی، دلی میں فراش خانہ، فراش خانہ میں اپنا گھر

اور اس گھر میں یہ کوٹھڑی پسند ہے جس میں انگیٹھی جل رہی ہے اور بجلی روشن ہے۔ میں انگیٹھی سے چمٹا بیٹھا ہوں۔ اخبار، رسالوں اور کتابوں کا ڈھیر ہے۔ ایک کتاب سے جی ہٹا تو دوسری اٹھالی اور سب سے گھبرا گیا تو گدے پر پڑ رہا۔ ......"

ان اقتباسوں سے میں یہ سمجھا ہوں کہ میر صاحب کے لیے زندگی کی ساری وسعت سمٹ کے ان کے قلم، ان کی کتابوں اور ان کے گھر میں آ گئی تھی۔ یہ اخیر زمانے کی بات ہے۔ شروع میں بھی کوئی خاص فرق نہ تھا۔ زندگی کا مفہوم میر صاحب کے یہاں ان کی اپنی زندگی تھا دوسروں کی نہیں اور ایسا کرنے میں میر صاحب ایک بہت بڑے طبقہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ میر صاحب اکیلے نہیں، ایک علامت ہیں اور ان میں اس علامت کا پورا پورا اظہار بھی ہوا ہے۔ یہ بات بھی کتنی غنیمت ہے کہ میر صاحب نے اپنی انفرادیت کو تسکین دینے کے لیے اُردو نثر کی ترویج کی طرف توجہ دی اور نثر کو نیا اسلوب دیا۔ اُردو صحافت کو ایک خاصے کا رسالہ دیا اور اس کے ذریعہ اپنے ہم رنگ ادیبوں کی ایک کھیپ تیار کر دی۔ حالی و سر سید کے عہد میں خود مرکزیت کی ایسی علامت قابل ملامت ضرور ٹھہرتی اگر اس میں معصومیت اور بے ضرر خود مرکزیت کے نتیجہ میں دوسرے رومانوی ساتھیوں کی طرح میر صاحب محض مسرت زائی کو اُردو ادب کی ایک مستقل قدر نہ منا جاتے۔ محض مسرت زائی کی بھی ایک اہمیت ہے۔ اپنی جگہ اس کا ایک درجہ ہے گو مقابلتاً بہت اونچا نہ سہی۔

خان بہادر میر ناصر علی کی پیدائش ۱۸۴۷ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ ایک معزز خاندانِ سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے دادا ریاست بھوپال کی ریذیڈنسی میں میر منشی رہے اور آپ کے نانا فوج میں صوبہ دار بہادر تھے۔ آپ کے والد مولوی ناصر الدین ابو المنصور دہلی کے مشہور ادیب تھے اور آپ کے بھائی میر نصرت علی زمانہ سابق میں ایک نامور اخبار نکالتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں آپ دہلی گورنمنٹ کالج سے امتحان دے کر نان پارہ ضلع بہرائچ میں مدرس اوّل مقرر ہوئے لیکن سال بھر کے بعد آپ کی خدمات محکمہ نمک شمالی ہند میں منتقل ہوئیں اور اس محکمے میں تقریباً چالیس سال تک نہایت نیک نامی کے ساتھ اپنے فرائضِ منصبی انجام دیتے رہے۔ پنشن پانے کے بعد بھی گزشتہ چار پانچ سال سے گورنمنٹ پنجاب نے آپ کو ریاست پاٹودی ضلع گوڑگاؤں میں دیوان کے عہدے پر تعینات فرمایا ہے۔ آغاز عمر آپ کا لکھنؤ میں اور باقی عمر دہلی اور نواح دہلی میں بسر ہوئی۔

پہلے تیرھویں صدی، زمانہ، افسانۂ ایام، ناصری وغیرہ رسالے نکالتے رہے اور آخر میں صلائے عام آپ کی کوششوں سے شائع ہونے لگا۔[1]

۱۸۷۶ء (بقول دیگرے: ۱۲۹۶ھ) میں "آگرہ اخبار" کے دفتر سے "تیرھویں صدی" شائع ہوا۔ یہ "تہذیب الاخلاق" کے جواب میں نکلا تھا۔[2]

---

[1] "اُردو فائنل ریڈر" مؤلفہ آر۔ پی ڈیوہرسٹ، آئی سی ایس، ۱۹۱۷ء : صفحہ ۱۵۵، ۱۵۶ (بحوالہ صلائے عام، جولائی ۱۹۱۷ء)

[2] کرزن گزٹ، فروری ۱۲ء (صلائے عام مارچ ۱۲ء)

آئیے میر صاحب کے صحافتی کارناموں کی کہانی آپ کو میر صاحب کی زبانی سنواؤں:۔

”میں نے اپنا جی بہلانے کے لیے دو ایک رسالے نکالے، ایک کی نسبت سرسید احمد خاں بہادر سے مشورہ کیا۔ جواب ملا کہ ”کسی سے کہنے کی بات نہیں ہے مگر رسالہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو چلنا مشکل ہے۔“ اخبار تو کچھ چلے ہیں لیکن رسالوں کو کسی فقیر کی ایسی بددعا لگی ہے کہ آج تک کوئی مجھے چلتا نظر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ منشی نولکشور جیسے حوصلے کے صاحب مطابع نے اس طرف توجہ کی تو اودھ اخبار تو چل گیا مگر دو ایک رسالے جو منشی صاحب مرحوم نے نکالے ان میں کوئی بھی چل نہ سکا۔

اردو رسالوں کو ہندوستان کی آب و ہوا راس نہیں۔ اخبار تو لشتم پشتم خلافت یا کانگریس کے نام سے چل جاتے ہیں رسالوں کا چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کا دماغ شور و شغب سے مناسبت رکھتا ہو تو ہو مگر جی لگا کر شوق سے فرصت میں بیٹھ کر علمی مسائل پر غور کرنے میں عاری ہے۔ یہ شامت اردو زبان کے لیے مخصوص ہے ورنہ انگریزی و بنگالی و مرہٹی زبانوں میں یہ نحوست نہیں۔ مجھے تعجب ہے کہ جو بات ہندوستانیوں سے کہنے کی ہو وہ بھی انگریزی میں بیان کی جاتی ہے۔“

(صلائے عام اپریل ۲۲ء)

”...... شروع ہی میں آ پھنسا ”آگرہ اخبار“ میں مضمون لکھا کرتا تھا...... ”تہذیب الاخلاق“ نکلا تو ”آگرہ اخبار“ نے ”تیرھویں صدی“ کا مقبول عام ماہوار رسالہ شائع کیا جس نے نیچرل پارٹی والوں کے دلوں میں ایسی چٹکیاں لیں جن کا مزا آج تک دلوں کو آ رہا ہے...... جب وہ صدی ختم ہوئی تو پرچے کا نام ”زمانہ“ رکھا کہ قیامت تک کو کافی ہو۔ جب تہذیب الاخلاق بند ہوا تو زمانہ بھی ٹھہر گیا۔ اب پھر نکلا تو زمانہ بھی اس کے ساتھ ہوا۔ یہ عبارت رسالہ زمانہ سے نقل کی گئی ہے جسے عرصہ ہوا کہ مطبع آگرہ اخبار سے حضرت خواجہ محمد یوسف صاحب مرحوم کے اہتمام سے نکلتا تھا۔ دونوں رسالے تیرھویں صدی اور زمانہ آپ ہی کے اہتمام سے آگرہ سے عرصے تک نکلتے رہے۔“ (اکتوبر ۲۹ء)

”...... ”تیرھویں صدی“ کی نثر کا ذمہ میں نے لیا اور اصحاب جو نظم و نثر لکھتے تھے ان کی مد مضامین غیر کے نام سے علیحدہ قرار دی گئی۔ شرط یہ ہوئی کہ مشکل سے مشکل مضمون اساتذہ کی زبان میں ادا کیے جائیں اور بیگانہ خیال بھی بیگانہ نہ معلوم ہوں......

صاحب آگرہ اخبار نے بہت اصرار کیا کہ تیرھویں صدی کا اخیر ہے یہ نام بدلنا پڑے گا

میں نے لکھا کہ یہی فکر نائن ٹینتھ سینچری کو ہوگی کہ انیسویں صدی ختم ہونے والی ہے۔ میں نے
تیرھویں صدی کے اختتام پر زمانہ' تجویز کیا کہ اب قیامت تک فرصت ہوگئی.....''
(مضمون دہلی و لکھنؤ' صلائے عام' جون ۱۵ء)

میر صاحب کا زمانہ چار پانچ سال تک چلتا رہا۔ ۱۸۸۸ء سے پہلے کچھ عرصہ کے لیے ایک رسالہ 'افسانہ ایام' خود نکالا اور اپنے بھائی کے مطبع نصرت مطابع سے شائع کرتے رہے۔ ۱۸۸۸ء میں اس کا جانشین 'ناصری' ہوا اور پھر ۱۹۰۸ء میں ستمبر سے 'صلائے عام' جاری ہوا۔ یہ مسلسل اپریل ۱۹۱۸ء تک شائع ہوتا رہا۔ پانچ سال کے وقفہ کے بعد ۱۹۲۳ء میں اس کی نئی زندگی شروع ہوئی جو اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جا کر ختم ہوئی۔ اگلے سال ۱۲ر جنوری ۱۹۳۳ء کو اس کا خالق اپنے خالق سے جا ملا۔

صلائے عام کیا تھا یہ بھی میر صاحب ہی سے سُنیے :۔

''—— جغرافیہ کی اصطلاح میں 'صلائے عام' کے حدود اربعہ یہ سمجھیں کہ نقشہ
کی طرح چار سمتوں میں اس کے ایک سرے پر لٹریچر' داہنے کو نیکی' بائیں کو نازک خیالی
اور پائیں کو تحقیق و معاملات ہیں۔ (صلائے عام' جون ۱۲ء)

صلائے عام کا پہلا پرچہ ستمبر ۱۹۰۸ء میں نکلا۔

اس پہلے پرچے پر جو چالیس صفحات پر مشتمل تھا مہینہ کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ دوسرے پر رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ درج تھا۔ تیسرے پر شوال المکرم ۱۳۲۶ھ اور چوتھے پر دسمبر ۱۹۰۸ء۔ ان چار پرچوں میں 'دلی کا حال' کے عنوان سے ذکاء اللہ کا مضمون اہم ہے پرانی اور نئی دلی کا تقابل کیا گیا ہے اور بڑے دلچسپ انداز پر پچھلی تہذیب کا تذکرہ کیا جیسے انھوں نے خود دیکھا تھا۔

پہلے پرچے میں رسالہ نکالنے کی وجہ جواز یہ دی گئی ہے کہ اُردو نثر کو ترقی ملنی چاہیے۔ سب نظم کی طرف لگے ہوئے ہیں —— صلائے عام یہ خدمت کرنے نکلا ہے۔

صلائے عام کے ۱۹۳۱ء تک کے پرچے مجھے ملے ہیں۔ میر صاحب کی بے جان ادبیت سے اکتاہٹ کے باوجود اُردو نثر کی ترقی کے لیے ان کی لگن اور ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کے ان کے بے مثال انداز نے صلائے عام کے فائل کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس میں بڑے معرکۃ الآرا مضامین نکلے ہیں اگر میں نہ دیکھتا تو ان سے ہمیشہ محروم رہتا۔ اس میں ایسی تحریریں نکلی ہیں جو اُردو کے کسی بھی دوسرے پرچے میں نہیں ملیں گی۔ میر ناصر علی کے اپنے انشائیے اس کی خاص چیز ہیں جن میں سے بہترین کے عنوان میں نے نوٹ کیے ہیں انہی کے زیر اثر میر صاحب کے گروپ کے دوسرے رومانویوں کے انشائیے ہیں ان میں سے بھی اچھے اچھے میں نے اشاریے میں نوٹ کیے ہیں۔ اس کے بعد اہم ادبی مضامین کا اشاریہ ہے۔ پھر اہم تاریخی مضامین کا اشاریہ ہے۔ ان مضامین میں تحقیقی پر جہاں جہاں لکھا ہے اس کی دستاویزی اہمیت ہے (غالب کے بارے میں مضامین کا اشاریہ عام ادبی مضامین سے الگ کیا ہے)

غزلیں اور نظمیں صلائے عام میں بہت ہی کم نکلیں اور ان میں سے وہ صرف وہ جو شاعر یا موضوع کسی اعتبار سے اہم تھیں انھیں میں نے اشاریے میں لے لیا ہے۔ پھر جن کتابوں اور رسالوں پر ریویو نکلے انھیں بھی میں نے الگ الگ نوٹ کیا ہے۔ ان میں سے اکثر کتابیں بھی مر چکی ہیں اور رسالے بھی۔ صلائے عام کے بہانے ان کا تذکرہ بھی آ جائے تو اچھا ہے۔ اخیر میں ان خطوط میں سے اہم تر کا

اشاریہ ہے جو اس زمانے کے مشہور ادیبوں نے میر صاحب کو لکھے اور جو صلائے عام میں شائع ہوئے اور پھر چند تصویر بتاں یعنی چند حسینوں کے خطوط۔

میر ناصر علی کے انشائیے :۔

خوبصورتی (فروری ۱۹۰۹ء)، میر لو (جون)، مسلمان اور پالٹکس (جولائی)، تصوف (اگست و ستمبر)، خطاب با جانان (اکتوبر)، عید (اکتوبر)، ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال (اگست ۱۹۰۹ء) / حسن مقال (جنوری ۱۹۱۰ء)، عقل و عقیدہ (جنوری)، غم زندگانی (مارچ)، بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ: عورت (اپریل)، سائنس ایمان لانے کی چیز نہیں (اپریل)، حکایت خضر و اسکندر (اپریل)، دنیا دار محن ہے یا مقام عیش (اپریل)، عورت کی خوبیاں (جولائی)، بیدردی (جولائی)، آزادی عقائد (ستمبر)، حسن عالم اسباب (اکتوبر)، قومی خصلتیں (اکتوبر ۱۹۱۰ء) / مجموعہ پریشاں (اپریل ۱۹۱۱ء)، آشفتہ خیالیاں (مئی)، دنیا میں رنج زیادہ ہے یا خوشی (جون)، نازک خیالی و پاکیزہ بیانی (اگست)، ہمہ اوست و ہمہ از وست (ستمبر ۱۹۱۱ء) / پاکیزہ خیالیاں از روئے فلاسفی (فروری ۱۹۱۲ء)، اجتماع ضدین (مئی)، ثابت قدمی کی عملی مثال [مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ "یہ طرز انگریزی میں ایک بڑے نامور خوش بیان کی ہے۔ صلائے عام میں اکثر نامور لکھنے والوں کا چربہ اتارا جاتا ہے۔ یہ طرز بھی نمونہ کے طور پر نذر ناظرین ہے"] (مئی)، صبر و استقلال (ستمبر)، حریطۂ خیال بتعلق خیالات (ستمبر)، دنیا میں خوش ہونا ایسا مشکل نہیں (اکتوبر)، شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن (نومبر ۱۹۱۲ء) / لباس مسلماناں (جنوری ۱۹۱۳ء)، کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا (اگست)، مضمون پریشاں (جون ۱۹۱۳ء) / گیتا نجلی کی سی نازک خیالیاں (اکتوبر ۱۹۱۴ء)، محشر خیال (فروری ۱۹۱۵ء)، اطمینان باطن: از روئے تحقیق و فلاسفی (فروری) / گیتا نجلی کی سی نازک خیالیاں (جنوری ۱۹۱۷ء) / پھر کیا چیز ہے (جنوری ۱۹۲۳ء) / عورتوں کا ذکر (جنوری ۱۹۲۴ء) / سیاست و مولویت (۱۹۲۵ء)

دوسروں کے انشائیے :۔

ہلال ماہ محرم: ماخوذ از فتنہ (فروری ۱۹۰۹ء)، دل: مرزا سلطان احمد (اگست و ستمبر ۱۹۰۹ء) / خوف تمنا۔ از دلگیر اکبر آبادی (جنوری ۱۹۱۰ء)، علم غیب، از اشہری (مارچ ۱۹۱۰ء)، زبان بے زبانی: از نیاز فتحپوری (اپریل)، میگزرد تاریخی افسانہ از شہاب الدین لوقیہ (اپریل)، روح: از نیاز (جون)، تصویر ادا: از نیاز (جولائی)، دل ناداں: از نیاز (ستمبر)، فقیر کا تکیہ دیا قر علی داستان (اگست)، عید کی کروٹ، پرانی اور نئی عید: میر علی داستاں گو (اکتوبر ۱۹۱۰ء) / اگر میں آزاد ہوتا: نیاز (جنوری ۱۹۱۱ء)، لباس: شمس العلماء محمد امین (جنوری)، شادی: مرزا عرفان علی بیگ (اپریل)، جشن شاہجہان، دلی کی زبان ہے: میر باقر علی، دہلی (ستمبر)، محرم، از مرزا عرفان علی بیگ (ستمبر)، محرم: محمد امین (اکتوبر)، جشن شاہ اودھ: عشرت لکھنوی (نومبر ۱۹۱۱ء) / گوہر: مرزا عرفان (جون ۱۹۱۲ء)، کفن: مرزا عرفان (ستمبر)، شغل: مرزا عرفان (اکتوبر)، تبسم: صفدر مرزاپوری (نومبر ۱۹۱۲ء) / عقل و عقیدہ (اپریل ۱۹۱۴ء) / غفلت کے اسرار: سید احمد دہلوی (جنوری ۱۹۱۶ء)، پامان طریقت کی بڑ: طالب دہلوی (فروری ۱۹۱۶ء) / خوبصورتی: مرزا عرفان بیگ (اگست ۱۹۱۷ء) / فتنہ: از عرفان بیگ (ستمبر ۱۹۲۳ء) / جھانپلزم، علی گڑھ میگزین سے شکریہ کے ساتھ (ستمبر ۱۹۲۴ء)، قنوطیت: رسالہ تحفہ حیدرآباد سے

ماخوذ (ستمبر ۱۹۲۴ء) / بر سبیل انکار: از خواجہ منظور حسین، منقول از جامعہ (ستمبر و اکتوبر ۱۹۲۶ء) / فرمانداے لوہاروکا اشتعال (ستمبر و اکتوبر ۱۹۲۶ء)

زبان وادب :-

آج کل کی اُردو کا لٹریچر: ذیل کے ناموں پر مشتمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اس زمانے کے معروف اور لکھنے والوں کے ناموں کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ (مارچ ۱۹۰۹ء)

شعر: جلال، جلیل، ریاض، حفیظ جونپوری، کوثر خیرآبادی، مضطر، شاد عظیم آبادی، سائل، محشر، ظہیر، حضور نظام آصف، مہاراجہ شاد۔

نثر: نذیر احمد، ذکاء اللہ، مرزا سلطان احمد، حکیم محمد علی، امجد علی اشہری، ایڈیٹر دکن ریویو حیدرآباد (ظفر علی خان)، ایڈیٹر ریاض الاخبار، ایڈیٹر فتنہ (حکیم برہم)، اودھ پنچ (سجاد حسین)، مخزن دہلی (شیخ محمد اکرام وغیرہ)، دبدبۂ آصفی، فصیح الملک (احسن مارہروی وغیرہ) عصر جدید (خواجہ غلام الثقلین وغیرہ)، زبان (دہلی) زمانہ (دیا نرائن نگم وغیرہ) اصلاح سخن (وجاہت جھنجھانوی وغیرہ)

افسانۂ زبان اردو (مئی ۱۹۰۹ء) دہلی اور تحفظ اُردو: از عرفان علی بیگ (اگست)، اُردو اہلِ ہنود کی زبان ہے (اکتوبر) از مرزا اکبر علی خان۔ صلاح الدین، خدا بخش کا مضمون کتب خانہ خدا بخش پر ماخوذ از ماڈرن ریویو (اکتوبر) اُردو لٹریچر میں کتابوں کی کمی (اکتوبر ۱۹۰۹ء) لٹریچر کی خوبیاں (نومبر ۱۹۰۹ء)، انشا پردازی کا دورِ جدید مع مکتوب مہدی افادی (نومبر ۱۹۰۹ء)

مہدی افادی کی کھلی چٹھی بنام میر ناصر علی: دائرہ ادبیہ ماخوذ از مشرق (نومبر ۱۹۰۹ء) مہدی کے دائرہ ادبیہ والے مضمون کی تحسین (نومبر ۱۹۰۹ء)

ہندوستانی لٹریچر از صلاح الدین خدا بخش ماخوذ از ہندوستانی ریویو (جنوری ۱۹۱۰ء) نئی اور پرانی اُردو: آغا رفیق بلند شہری (جنوری) لٹریچر کا فلسفہ: از نیاز فتح پوری (مارچ) اہلِ زبان کون ہیں: از شاد میرٹھی (مئی) دائرہ ادبیہ مصنفہ مہدی حسن اور آہ دلگیر از تنقید علی گڑھ (اپریل) ادب کا عنصر لطیف از دلگیر (اکتوبر) رسالہ ادیب میں شبلی کا جو خط چھپا ہے اس کا اقتباس دیا ہے اور تنقید کی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی: ادیب میں شبلی کی جو تعریف چھپی ہے اس کا رد (اکتوبر ۱۹۱۰ء) تازہ جذبات اکبر: ایک ملاقات اور اس کا تاثر از دلگیر اکبرآبادی (جنوری ۱۹۱۰ء) رسالہ الناظر میں شبلی کے کلام پر بڑی درشت تنقید نکلی اس پر تحسینی نوٹ (مارچ ۱۹۱۰ء)

ہندی شاعری از شاد میرٹھی (جنوری ۱۹۱۱ء) اُردو ہندی (اپریل) اُردو زبان منقول از اودھ اخبار (اپریل) اُردو کسے کہتے ہیں (ستمبر ۱۹۱۱ء) تقریظ، ریویو، تنقید (جنوری ۱۹۱۲ء) فارسی کی نازک خیالیاں (جنوری) عزیز مرزا کی وفات پر نوٹ (مارچ) فن اخبار نویسی (اپریل) خواہانِ اُردو سے التماس۔ طباطبائی (جون) توبۃ النصوح: تنقید (ستمبر) زبانِ خوش لہجہ: فارسی (دسمبر ۱۹۱۲ء) تمت۔ تمہ۔ تمہید (دسمبر ۱۹۱۲ء) شرح گلستان مصنفہ بہادر شاہ ظفر مطبوعہ ۱۲۵۹ھ (اگست ۱۹۱۳ء) طوطی نامہ نخشبی کے (دسمبر) اُردو کو انگریزی زبان کی ضرورت ہے (اگست) متروکات اُردو: عشرت لکھنوی (مئی) راماین مسیحی منظوم بہ عہد جہانگیر (فروری ۱۹۱۳ء) / ضرورت فرہنگ اصطلاحات خاص (فروری ۱۹۱۴ء) انگریزی اردو ناول: محمد ابراہیم خاں تجلی (ستمبر ۱۹۱۴ء) تحقیق لفظ قوال (فروری ۱۹۱۵ء) لغات موسیقی (فروری) حفظ مراتب: القاب و آداب (فروری) مولانا حالی و علامہ شبلی (اپریل)

قاف : انگریزی حرف " C " کے لیے حرف ق آنا چاہیے ——— کیونکہ آتا رہا ہے جیسے "کیس" کے لیے 'قضیہ'، "کینڈل" کے لیے 'قندیل'، "کٹ" کے لیے 'قط'، "کیسل" کے 'قصر'، "کوڈ" کے لیے 'قواعد'، "کپتن" کے لیے 'قائد' "کورسک" کے لیے 'قزاق' اور "کاٹن" کے لیے 'قطن' (فروری ۱۹۱۵ء)۔

دلّی و لکھنؤ (جون ۱۹۱۵ء) اُردو زبان تمام زبانوں سے زیادہ مشکل ہے: شوکت میرٹھی (اگست) احسانِ زبان اردو دادسمبر۱۵ء) محاورۂ جاوید (جون ۱۹۱۵ء) انگریزی الفاظ (اگست ۱۹۱۵ء)

شعرائے عرب کا نیچرل کلام: شوکت میرٹھی (جنوری ۱۹۱۶ء) اثر و شوق: طبا طبائی (مئی ۱۹۱۶ء) دیباچہ: مرزا سلطان احمد (جون) خواجہ آتش علیہ الرحمۃ: مرزا واجد حسین یاس (جولائی، اکتوبر) احسن لکھنوی شاگرد سودا کا ایک قلمی دیوان: مرزا یاس (جولائی) خوبی اضافت (اگست) ادائے بیان: مرزا سلطان احمد (ستمبر) علم عروض: آر۔ پی۔ ڈیلو ہرسٹ (نومبر ۱۹۱۶ء) / مثنوی حسن و عشق مصنفہ راسخ عظیم آبادی مرسلۂ مرزا یاس (فروری ۱۹۱۷ء) [یہ مثنوی جناب ممتاز احمد (پٹنہ) کے نفیس 'مثنویات راسخ' میں نہیں آئی ہے اور تقریباً پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے] مثنوی گلزارِ نسیم آتش کی تصنیف ہے (جولائی ۱۹۱۷ء) / محمد قلی سلیم کا قلمی دیوان (اپریل ۱۹۱۸ء) تنقید شعر العجم مصنفہ سید محمد حسین جعفری پر توصیفی نوٹ (اپریل ۱۹۱۸ء) / مثنوی بمقابلہ ڈراما (جنوری ۱۹۲۲ء) کلامِ برہمن (فروری ۱۹۲۲ء) شاعر و فلاسفی: مرزا سلطان احمد (فروری) لکھنؤ کے مشاعرے: مرزا یاس (مئی) گلہائے ریاض یا گلکدۂ ریاض از میر ضیا دہلوی (جولائی ۱۹۲۲ء) [ریاض نے پہلے 'گلکدہ' نکالا پھر علی الترتیب 'ریاض الاخبار' اور 'فتنہ و عطرِ فتنہ'] زبان کا مرتبہ، خاص کر اپنی زبان کا (جولائی) انشا پردازی (جولائی) زبانِ اُردو کیونکر ترقی کر سکتی ہے (جولائی) اُردو و ذریعۂ اتحاد ہے: ماخوذ از رسالہ مسلح مضمون مولوی نصرت علی دہلوی برادرِ بزرگ میر ناصر علی (اگست) بیانِ واقع، مصنفہ ملا عبدالکریم کشمیری نسخۂ قلمی مملوکۂ میر ناصر علی (ستمبر ۱۹۲۳ء) / اُردو اخبار نویسی (اپریل ۱۹۲۴ء) رائے انند رام مخلص دہلوی (اگست) چندر بھان برہمن (اکتوبر) امثال اور کہاوتیں (نومبر) اُردو بمقابلہ ہندی (۱۹۲۴ء) شعرائے کشمیر (اپریل ۱۹۲۵ء) لسان الملک حضرت ریاض: رگھوپت سہائے صاحب ایم-ایل بی رئیس گورکھپور [یعنی فراق] (جون ۱۹۲۵ء) [ایڈیٹر کے تحسینی نوٹ کے ساتھ 'زمانہ' اور 'اخبار مشرق' سے منقول]

عجیب توارد [اصلاحِ سخن، اکتوبر ۱۹۰۷ء میں عبدالرحمٰن راسخ دہلوی ۱۹۰۷ء کے حالات اور کلام کے ذیل میں یہ غزل بھی تھی ۔
رازِ توحید زمانے نے ترا کیا جانا ..... الخ یہ غزل منیر شکوہ آبادی کے دیوان 'تنویر الاشعار' میں موجود ہے] (جون ۱۹۲۵ء)

نغمۂ عندلیب [منشی گوبند سنگھ شاہجہان آبادی کے لکھے ہوئے فسانہ 'نغمۂ عندلیب' کا تعارف، اس کا طرز 'فسانۂ عجائب' سے ملتا ہے جو اس کے بعد کی تصنیف ہے گویا رجب علی بیگ سرور نے گوبند سنگھ کی تقلید کی ہے اس اعتبار سے یہ مضمون اہم ہے اس لیے مزید کہ اس میں خاصے اقتباسات دے دیے ہیں (ستمبر) لاہور سے اُردو انسائیکلوپیڈیا کے مرتب ہونے کی خبر (اکتوبر) اُردو زبان کے متروکات اور مشمولات (نومبر) دلّی کے دوکانداروں کی شاعری (نومبر ۱۹۲۵ء)

فنِ انشا پردازی (فروری ۱۹۲۶ء) [اس میں گلستان، اخلاقِ ناصری، ظفر نامہ شرف ایزدی، انشائے ابوالفضل، ہفت اقلیم، تاریخ فرشتہ، جہانگیر نامۂ معتمد خاں ——— پھر افضل خاں، اسلام خاں، سعداللہ خاں، میر جلال ایرانی، شیخ حمید الدین ناگوری، شیخ محمد وارث، قاضی محمد افضل، شیخ عبدالرحیم خیر آبادی، لالہ بینی داس، شیخ ہیبت اللہ ——— پھر چندر بھان برہمن، شیخ طالع یار عرف اودیراج، اورنگ زیب، نعمت خاں عالی، ابوالفتح قابل خاں، مرزا محمد کاظم، ملا عبدالخالق پنجابی، منشی کبیر چند دہلوی، میر ساماں سیل سنگھ، شیخ عنایت اللہ، شیخ محمد صالح کنبوہ،

اللہ داد افغان ملتانی، عاقل خاں، امانت خاں، میر محمد رضا منصب دار ——— پھر لالہ مادھو رام اور "بلبل خانے" والے انند رام مخلص ——— پھر رقعاتِ امان اللہ جنھیں پڑھنے والا حافظ و برآن دہلوی کے سوا کوئی نہ ملا ——— پھر طاہر وحید، شبنم شاداب، مقاماتِ حمیدی ——— پھر بیدل، ٹیک چند بہار، خان آرزو، صہبائی، قتیل اور غالب کے نام دیے ہیں]

چکبست کی وفات پر نوٹ (مارچ ۱۹۲۶ء) اصغر کی "نشاطِ روح" پر اثر لکھنوی کی تنقید کا جواب (جون، جولائی ۱۹۲۶ء) مہاراجہ چندو لال: عبدالرؤف عشرت (اگست ۱۹۲۷ء) انتخاب کلامِ قدیر لکھنوی، سابق معزم لکھنوی (ستمبر) عزیز صفی پوری، سید اشرف علی (نومبر ۱۹۲۷ء) افسانوں کا ماخذ: ہندستان (مارچ ۱۹۲۸ء) رسالہ پیمانہ (ساغر نظامی) میں پیر صاحب کی تعریف۔ پیر صاحب کی طرف سے مسرت کا اظہار کہ پیمانہ کا دفتر دہلی آگیا (مارچ ۱۹۲۸ء) عزیز صفی پوری: سید اشرف علی (مارچ ۱۹۲۸ء) فیضی کی مثنوی نل دمن (اپریل) مرزا معز خان علی بیگ، مولوی بشیر الدین احمد خلف نذیر احمد اور مرزا حیرت کی وفات پر نوٹ (اپریل) مولوی سبحان اللہ پر نوٹ اور اس سلسلہ میں شبلی پر سخت تنقید (اپریل) عزیز صفی پوری (جون ۱۹۲۸ء) پیارے صاحب رشید: آثر صفی پوری (جون) وسعت زبانِ اردو: انوار حسین سالک: منقول از سہیل (جون) [نئے لغات اور الفاظ پہ اہم مضمون] مختلف فیہ الفاظ: خواجہ عبدالرؤف عشرت (ستمبر) جناب بھگونت سہائے راحت اور مولانا غنیمت (نومبر) [راحت نے "نیرنگِ عشق" کا ترجمہ "نگارستانِ راحت" کے نام سے مثنوی میں کیا] ادب کے ہاتھوں اقلیدس کی گت: فدا علی خاں رام پوری۔ منقول از "جادو" ڈھاکہ نومبر (نومبر) عزیز صفی پوری: آثر صفی پوری (دسمبر ۱۹۲۸ء) اخلاقِ ناسخ: سائل دہلوی (اکتوبر ۱۹۲۹ء) حضرت ریاض: خلیل الرحمٰن خلیل: منقول از رسالہ اعجاز (دسمبر ۱۹۳۰ء)

غالب :-

"واقعاتِ انیس" (جنوری ۱۹۰۹ء) [غالب اور انیس کی ملاقات کے سلسلہ میں اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے اس پر مدیر کا نوٹ۔ دبدبۂ سکندری، رام پور میں اس کتاب کے سلسلہ میں حالی کی بھی ایک آدھ تحریر چھپی ہے اس وقت موجود نہیں]

"واقعاتِ انیس" کے بارے میں نواب سعید الدین احمد خاں طالب تلمیذِ غالب کا خط بنام مہدی حسن احسن مؤلف واقعاتِ انیس، (فروری ۱۹۰۹ء) [انیس اور غالب کی ملاقات کا واقعہ صحیح نہیں ہے]

مرزا اسداللہ خاں غالب: صلاح الدین خدا بخش کی انگریزی تصنیف "حیاتِ غالب" جو عنقریب چھپنے والی ہے اس کا دیباچہ "ہندستانی ریویو" میں چھپا ہے، اس کا تذکرہ اور خلاصہ (مارچ ۱۹۱۰ء)

غالب کا حال: رسالہ ادیب، جولائی نمبر میں اس کی تحسین و توصیف (اگست ۱۹۱۲ء) غالب کی نظم: خواجہ اثر مندرج "بدائعِ سخن" آغاز کنم (دسمبر ۱۹۱۲ء) غالب کا غیر مطبوعہ قصیدہ اور "معاصر نقاد": رسالہ نقاد نے غیر مطبوعہ قصیدہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر یہی کلام غالب ہے تو اس کا غیر مطبوعہ رہنا بہتر تھا (ستمبر ۱۹۱۴ء) دلی از زبانِ غالب دہلوی: مجروح غالب (اسلامی منقول از الناظر (ستمبر ۱۹۱۴ء) غزل و قصیدہ مجروح تلمیذ غالب (فروری ۱۹۱۵ء) مذہب رندانہ: گرامی کی غزل نامید نفش (مئی ۱۹۲۴ء) حالی غالب جانشین جمالی بھوپالی (نومبر ۱۹۱۵ء) حضرت غالب علیہ الرحمۃ کا نازک کلام: شوکت میرٹھی (دسمبر ۱۹۱۵ء) غالب کے دو شعروں کا حل

شوکت میرٹھی (جنوری ۱۹۱۶ء) نمونۂ نثرِ غالب، عالمانہ طرز میں: سراج المعرفت کی تقریظ (مارچ ۱۹۱۷ء) مرثیہ تصنیف مرزا نوشہ:۔
ں اے نفس بادِ سحر شعلہ فشاں ہو (اپریل ۱۹۱۷ء) غالب کے کلام کے حاسد: شوکت میرٹھی (اگست ۱۹۱۷ء) کوہ کندن و موش برآوردنا،
رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۲۲ء میں شائع شدہ نظم طباطبائی کے غالب پر مضمون کے سلسلے میں: بشیر الدین احمد (جنوری ۱۹۲۳ء) غالب کے
اُردو کلام کی نسبت رائیں: مرزا محمد علی خاں (جون ۱۹۲۲ء) اسد اللہ الغالب: حکیم احمد علی خان آغا دہلوی (جنوری، فروری، اپریل ۱۹۲۹ء)۔

تاریخ و آثار:۔

سکہ (دسمبر ۱۹۰۸ء) ندوۃ العلما (مارچ ۱۹۱۰ء) دہلی، ۱۰۰۲ھ کا ایک کتبہ جس کا ذکر آثار الصنادید میں نہیں (مئی ۱۹۱۰ء)
پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی جس کی بنیاد اکتوبر ۱۹۱۰ء کو شملہ میں پڑی (اکتوبر ۱۹۱۰ء) منٹو محمڈن انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے سلسلہ میں
راجہ صاحب محمود آباد (اکتوبر ۱۹۱۰ء) عمر خیام از روئے علمِ کلام (جنوری ۱۹۱۱ء) غدر سے پہلے کی دلی (جنوری ۱۹۱۱ء) شاہانِ مغلیہ
کے فرمان ۱۶۹۰ء (مئی) اشیائے خوردنی کا نرخ ۱۸۰۴ء تا ۱۸۱۳ء (مئی) ناہمواریٔ غلام قادر: ایک فارسی خط بنام نواب شرف الدین
حسن خاں جرائے تعاقب روہیلہ (اگست) رفع شک متعلق بہ بابرنامہ (ستمبر ۱۹۱۱ء) قلعہ معلّٰی کا عجائب خانہ: کیٹلاگ (جنوری ۱۹۱۲ء)
علائے عام اور سال کا آغاز اور انجام: اخبار نویسوں کو مشورہ کہ ۱۲ر دسمبر سے سال شروع کرنا چاہیے کہ دلی کی بیاد نخی اس تاریخ سے شروع
جنوری ۱۹۱۲ء) موت کے متعلق قدیم مصریوں کا خیال (مارچ ۱۹۱۲ء) کتبوں کی تحقیق (مئی) قطب مینار کے اسلامی عمارت ہونے کا
ثبوت (جون) سکرٹری ایم اے او کالج: نواب محمد اسحٰق خاں کا انتخاب (اگست) شاہِ عالم کے وقت کی دلی (نومبر) سلاطینِ مغلیہ کے
دفتر کی تحقیق (دسمبر ۱۲ء۔ جنوری، فروری، مئی ۱۳ء۔ جون ۱۶ء۔ اگست ۱۷ء) سکرٹری ایم اے او کالج کی تقرری (فروری ۱۹۱۳ء)——
اورنگ زیب اپنے رقعات میں (جون ۱۳ء) نواب آصف جاہ آصفی (اگست ۱۳ء) واجد علی شاہ (دسمبر ۱۳ء) ایک قدیم بیاض
مورخہ ۱۰۸۹ھ (اپریل ۱۳ء) سومنات یا سومناتھ (فروری ۱۴ء) قطب صاحب کی لاٹ (فروری ۱۴ء) نظام سقہ اور بھولی بھٹیاری
(اپریل ۱۵ء) شاہجہان آباد (نومبر، دسمبر ۱۵ء) قلعہ آگرہ کی دیواریں ختم ہونے کی وجہ (جنوری ۱۶ء) دلی کا نقشہ مغل عہد میں (اپریل ۱۶ء)
مختار الدولہ محمود خاں ثابت جنگ جرنیل افواج بانیٔ ریاست ٹونک (اپریل ۱۶ء) جہانگیر تزکِ جہانگیری میں (اپریل ۱۷ء) سو برس پہلے
پنجاب کا جغرافیہ: عبدالکریم علوی کی تاریخ سے (جون ۱۷ء) واجد علی شاہ (جولائی ۱۷ء) تاریخ فنِ خوشنویسی (جولائی ۱۷ء) شاہی مراتب
فروری ۲۲ء) لوئس بورکین کے خود نوشت حالات جسے بی طامسن نے فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا: بیگم سمرو، شاہ عالم وغیرہ
کے بارے میں بعض نئی باتیں (ستمبر ۲۲ء) اکبر کی مذہبی تحقیق: فادر مانسریٹ کے روزنامچہ سے جس کا لاطینی سے انگریزی میں ترجمہ ہوا
ستمبر ۲۲ء) اسی نوے برس پہلے کی دلی: دہلی اُردو اخبار ۱۸۳۷۔۳۸ء کے فائل سے ماخوذ (مئی ۲۴ء) یادِ رفتگان متعلق بہ شاہجہان آباد
: دلی کے محلوں کے بارے میں بعض اشعار اور معلومات: مثلاً ؎

مائخ: چاوڑی قاف ہے یا غلط بریں ہے رائج! — بھگے طوروں کے بیلوں کے پسے ملتے ہیں

؎ پہلے جو زخم تھے سینے میں وہ ناسور ہوئے — یہی ناسور کوئی روز میں اندا رے ہیں

آخری شعر پر میر ناصر علی کا دلچسپ نوٹ کہ "دلی کے اندر سارے کنوئیں سب بھر دیے گئے گو نا سور کا بھرنا مشکل ہے۔ (جون ۲۴ء)
ایر امان اللہ خاں کا خطبہ فارسی میں (جنوری ۲۶ء) شمرو بیگم: منقول از حرم یبلی بعیت (اپریل) ہندوستان کے بانکے: منقول از وگداز (ستمبر اکتوبر ۲۶ء) ساٹھ ستر برس پہلے کی دلی: مضمون مصنفہ رائے جیون لال، منقول از روئداد دلی سوسائٹی (جنوری ۲۷ء) مرزا برجیس قدر (اپریل۔ مئی ۲۷ء) مہاراجہ چندولال: خواجہ عبدالرؤف عشرت (اگست ۲۷ء) اُردوئے معلّٰی: پھول والوں کی سیر: ماخوذ از سہیلی (مئی ۲۸ء) بہادر شاہ بادشاہ دہلی (مئی) سید احمد شہید کی تحریک (ستمبر) سلاطین مغلیہ کی معاشرت (اکتوبر) بہادر شاہ ظفر اور رُم پہیے: ایک قلمی مثنوی کسی لالہ صاحب کی لکھی ہوئی' نبردنامہ نام' اس پر (اکتوبر) عید پیچھے ٹر (مئی ۲۸ء)، لال قلعہ کی ایک جھلک: ناصر نذیر فراق (جون' دسمبر ۲۸ء) نذر و نثار۔ نثار چھوٹے سکے ہوتے تھے' نچھاور اسی کا بگاڑ ہے (جون ۲۴ء)
سکندر نامہ کا سکندر اعظم (جولائی ۲۴ء) کلکتہ کی بنیاد: از سفر نامہ قلمی ۱۱۸۳ھ (جولائی) فرمانِ اکبری بجے پور میوزیم (اگست ۱۹۲۴ء) بیاض خطوط مراد بخش بن شاہجہان بادشاہ: قلمی مملوکہ میر ناصر علی (دسمبر ۲۴ء) [دارا کو 'ملحد' لکھتا ہے' اورنگ زیب کو 'بھائی' کر کے خطاب کرتا ہے اور بعض اور ہندی الفاظ استعمال کرتا ہے مثلاً دورا ہا' ڈاک' چوکی وغیرہ]
شاہ عالم کی ہجو میں' مثنوی دو دو آہ مصنفہ لچھمن سنگھ لبنیوری (دسمبر ۲۴ء)
حالاتِ غدر پر انگریز شاعر شور کی مثنوی (جنوری ۲۵ء) سلونو کا تہوار (فروری ۲۵ء) شمرو بیگم (اکتوبر ۲۵ء)

نظمیں :-

عزیز لکھنوی (اکتوبر ۱۹۰۹ء' اپریل ۱۱ء) ——— نیاز فتح پوری (اپریل ۱۹۱۰ء' جون' اگست' ستمبر ۱۹۱۰ء' اپریل' جون' اگست ۱۹۱۱ء) ——— گرامی (جنوری ۱۹۱۱ء' جنوری ۱۹۱۲ء) ——— سیماب (اکتوبر ۱۹۱۰ء' ہر چیز پہ بہار تھی ہر شے پہ حسن تھا الخ ورستمبر ۱۹۱۵ء)

کتابیں :-

جن پر "صلائے عام" میں تبصرے یا اشتہار نکلے:
کرشمۂ نجوم' مترجمہ پنڈت نارائن پرشاد بیتاب (فروری ۱۹۰۹ء) حیات خدابخش خاں مصنفہ صلاح الدین خدابخش (انگریزی) (مارچ) اشتہار کتاب حیاتِ انیس: از سید منظر علی پھپھوند' اٹاوہ (جون ۱۹۰۹ء) تذکرۂ گلزارِ سخن مصنفہ جگن ناتھ پرشاد فیض (مارچ ۱۹۱۰ء) دشمنِ جاں' ناول: مصنفہ مولوی عبدالقادر' حیدر آباد (مارچ ۱۹۱۰ء) فلسفۂ اسلام: مصنفہ محمد علی خاں رئیس اودھ (مارچ) دیوان رضا علی وحشت (اپریل) کلامِ فوق (اپریل) فریب وفا' ڈراما: مصنفہ سیماب اکبر آبادی جس کا انتساب میر ناصر علی کے نام ہے (ستمبر) تاجِ سخن' مجموعۂ کلام جلیل مانکپوری (اکتوبر ۱۹۱۰ء) الحانون: مصنفہ مرزا عرفان علی بیگ (اپریل ۱۱ء) اساس الاخلاق: مصنفہ مرزا سلطان احمد خاں (جون) شرح غالب: مصنفہ طباطبائی (اکتوبر ۱۱ء) مختاراتِ اشعار' انتخاب اشعارِ میر: منتخبہ عماد الملک۔ جلد اوّل (اکتوبر ۱۱ء) الدین والکون علم کلام میں مبسٹس کرامت حسین کی تصنیف (مارچ ۱۲ء) گیتا نجلی مترجمہ نیاز فتح پوری (فروری ۱۴ء) مرقع ادب: مرتبہ صفدر مرزا پوری اسسٹنٹ ایڈیٹر الناظر' (اگست) گلدستہ پنج: مرتبہ کشن پرشاد کول (اکتوبر ۱۵ء) محل خانۂ شاہی: مصنفہ خنجر لکھنوی (جولائی ۱۷ء) مقتدی خاں شیروانی

کا شائع کردہ رسالہ "ابلیس" کا خطبۂ صدارت جو پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر آل انڈیا شیاطین کانفرنس میں پڑھا گیا۔ کراماً کاتبین کے قلم سے (جنوری ۱۸ء) مذاکرات "ناظم جہاں" محکمہ آثار قدیمہ (مئی ۲۶ء) اشتہار "بانگِ درا کا دوسرا ایڈیشن طبع ہونے والا ہے" از حکیم طاہر الدین لاہور (مئی ۲۶ء) آدابِ شاعری: مصنفہ عالی رفاعی (جون، جولائی ۲۶ء) مخانۂ جاوید جلد ۳ (فروری ۲۷ء)

اخبار اور رسالے

اصلاحِ سخن، لاہور جنوری سے جاری (دسمبر ۱۹۰۸ء) جریدۂ اسلام پنجاب، ایڈیٹر نیاز محمد (فروری ۱۹۰۹ء) تنویر المشرق، کلکتہ (فروری ۱۹۰۹ء) ماہنامہ معیار لکھنؤ (مئی) رسالہ مجدد (مئی) کشمیری میگزین (مئی ۱۹۰۹ء) ادیب، ایڈیٹر نوبت رائے نظر (مارچ ۱۹۱۰ء) دلگداز، لکھنؤ (ستمبر) اشتہار، رسالہ لسان العصر جو مارچ ۱۹۱۰ء سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مضامین شمولہ مارچ تا جون ۱۹۱۰ء کی فہرست:-

۱- اصلاح و توسیع کونسل از اڈیٹر- ۲- ہندوستان میں انتظام، از سید امیر علی- ۳- جنگ کی آئندہ حالت از چین بلاک- ۴- تبت کی گزشتہ حالت از منشی تیرتھ رام- ۵- تبت کی موجودہ پیچیدگیاں- ۶- اہرامِ مصری از مرزا محمد ہادی- ۷- تحقیقات عالم المزاج- ۸- فلسفۂ ذہنی پر ایک نظر از اڈیٹر- ۹- دمدار ستارہ از ایڈیٹر- ۱۰- مصر کی تہذیب کی اصل- ۱۱- محنت اور ذہانت از محمد مسلم عظیم آبادی ۱۲- تہذیب کا اثر شاعری پر، مترجمہ محمد مسلم عظیم آبادی- ۱۳- ولی سے قبل کے شعرائے اردو، از حکیم شمس اللہ قادری۔

(جولائی ۱۹۱۰ء)

رسالہ مضامین پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی، شمارہ ۱، انگریزی (فروری ۱۲ء) رسالہ ضیاء الاسلام جلد ۷ نمبر ۵ (فروری) علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے اجراء پر نوٹ (اپریل ۱۳ء) رسالہ مورخ، مدراس (اگست) عصر جدید (بار دوم) (جنوری ۱۵ء) تذکرۃ الشعراء، حسرت موہانی (جنوری ۱۵ء) گلچیں، ریاض خیر آبادی کا گلدستہ (اپریل ۱۵ء) نظارہ (اپریل ۱۷ء) نگار (جنوری ۲۲ء) عبرت النجیب آباد (جنوری) رہبرِ ہند (جنوری) ترقی، حیدرآباد (جون) آگرہ سے تسنیم کے اجراء کے ارادے پر، انجم آفندی کا مکتوب (جولائی) اشتہار، رسالہ آئینہ الہ آباد (اکتوبر ۲۳ء) ڈسٹرکٹ گزٹ، گونڈہ (دسمبر ۲۳ء) اخبار ریاست، دہلی (اکتوبر ۲۴ء) نوبہار، علی گڑھ۔ افسر میرٹھی (نومبر ۲۴ء) رسالہ ستارہ علی گڑھ، ایڈیٹر ضیا زبیری (نومبر ۲۴ء) رسالہ تحفۂ دکن (جنوری ۲۵ء) عندلیب منور جہ اجراء فروری ۲۵ء (مارچ) شاہجہاں (جولائی) ہزار داستان (جولائی) جواں مرگ رسائل: ستارہ علی گڑھ۔ عندلیب، خوجہ اور ریاض عظیم آبادی کے اکلوتے پرچے صحیفہ کا ذکر (جولائی ۲۵ء) اردو رسالوں کی ڈائرکٹری (ستمبر) گلدستہ تحفۂ خوشتر، گورکھپور، ایڈیٹر وسیم خیرآبادی (ستمبر) اخبار شطرنج، لکھنؤ۔ مصور (نومبر) جادو، ڈھاکہ (نومبر) انتخاب، لاہور (نومبر) کوکب ہند، آگرہ (دسمبر ۲۵ء) جامعہ، دہلی (دسمبر ۲۵ء) نورجہاں (دسمبر ۲۵ء) بچوں کا رسالہ "پریم" لاہور (جنوری ۲۶ء) حرم، ہیلی بھیت (اپریل) بہارستان، اختر شیرانی (جون ۲۶ء) گلچیں اور نقاد کے بند ہونے پر اظہارِ افسوس (مارچ ۲۷ء) حسنِ ادب، عبدالرؤف عشرت (اگست ۲۷ء) مبصر لکھنؤ (فروری ۲۹ء) رسالہ پیمانہ (ساغر نظامی) کا دفتر دلی آگیا (مارچ ۲۹ء) رسالہ چاند، ہندی کا اردو ایڈیشن (اپریل ۳۱ء)——

مکتوبات: "صلائے عام" میں جن مشاہیر کے خطوط چھپے:-

آفتاب احمد خاں (اگست ۱۹۱۱ء) آغا رفیق بلند شہری (مارچ ۱۹۱۰ء) اختر شیرانی (مارچ ۲۶ء، فروری ۲۷ء) ارشد تھانوی

(جنوری ۱۱ء) انجم آفندی اکبر آبادی — تسنیم کے اجراء کا ذکر (جولائی ۲۴ء) ایک گمنام خاتون بسلسلۂ نیاز فتح پوری (اپریل ۱۱ء) بحر لکھنوی (فروری ۲۷ء) برہم الحکیم (اپریل ۱۹۱۰ء) بسمل ہوشیار پوری (فروری ۲۷ء) بسمل، عبدالودود (جنوری ۱۱ء) بشیرالدین احمد دہلوی (فروری ۱۲ء) تخجر، فدا علی (اپریل، ستمبر ۱۹۱۰ء، جولائی ۱۹۱۷ء) دلگیر (اکتوبر، نومبر ۱۹۰۹ء۔ مارچ، مئی ۱۹۱۰ء) ریاض (اکتوبر ۱۹۱۱ء، نومبر ۲۳ء، فروری ۲۷ء) سائل (فروری ۱۹۱۰ء) سلطان احمد مرزا (مئی ۱۹۰۹ء، اگست ۱۹۱۱ء، جولائی ۱۹۱۶ء) سیماب (جنوری، فروری ۱۹۱۰ء، اگست ۱۹۱۱ء) صفدر مرزا پوری (ستمبر ۱۹۱۰ء، نومبر ۱۹۱۲ء، جولائی ۱۹۱۵ء، جنوری ۱۹۲۵ء، اگست ۱۹۲۶ء) طباطبائی (مئی، نومبر ۱۹۰۹ء، اکتوبر ۱۹۱۰ء، جنوری ۱۹۱۱ء، مئی ۱۹۲۳ء) عبدالودود، قاضی (مارچ ۱۹۲۳ء) عزیز لکھنوی (مئی ۱۹۰۹ء، جنوری ۱۹۱۰ء) عزیز مرزا (مئی ۱۹۱۱ء) غلام یزدانی (جولائی ۱۶ء) فرید، قاضی محمد (جولائی ۱۹۲۳ء) قیصر، سید محمد یوسف ایڈیٹر المجاب، بھوپال (اپریل ۱۹۱۰ء) گرامی (ستمبر ۱۹۱۱ء، جنوری، فروری ۱۹۱۲ء) لطیف الدین احمد (مئی ۱۱ء) محشر لکھنوی (مئی ۱۹۰۹ء، اپریل ۱۹۱۰ء، جنوری ۱۹۱۱ء) محوی صدیقی (مارچ ۱۲ء) مہدی (اکتوبر، نومبر ۱۹۰۹ء، فروری، جولائی ۱۹۱۰ء) نیاز (جون، اگست ۱۹۱۰ء، مئی ۱۹۱۱ء) وحشت (جون ۱۰ء) یگانہ (اپریل ۱۹۲۳ء)

ضمیمے :-

ضمیمہ ۱

مکتوب ریاض خیر آبادی

"صلائے عام" گورکھپور میں نظر سے گزرا۔ بار بار آپ کا ذکر آیا۔ آپ کی لٹریچر پہ کمنی ہے کہ آپ جوان طبع ہیں۔ میں لحد کو لیے جنت کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے مُردہ مجھ کر غالباً آپ نے صلائے عام سے محروم رکھا۔ خط لکھا تو ضرور ہوا کہ کوئی غزل بھی نذر کروں۔

(اکتوبر ۱۹۲۳ء)

مکتوب ریاض خیر آبادی

عالی جناب!

گرامی نامہ ملا۔ صلائے عام ملے۔ آپ ملے، خدا ملا۔ آپ کو مجھ پر رشک ہے مجھے آپ پر (میں نے جناب یاس کو لکھا تھا کہ جو بات آپ نے شعر میں پیدا کی ہے، میں نے چاہا کہ مجھے نثر میں نصیب ہو مگر نہ ہوئی" میرناصر علی) فرق اتنا ہے کہ آپ کے رشک میں تصنع ہے، صرف مجھے خوش کرنے کو یہ لکھ دیا۔ آپ کا فقرہ تیر کے نشتر کا حکم رکھتا ہے، اس سے زیادہ آپ کیا چاہتے ہیں.......... صلائے عام کا جھگڑا آپ سے چھوٹنے کا نہیں۔ صلائے عام کی ضرورت سے آپ کو انشاء اللہ ابھی اور برسوں زندہ رہنا پڑے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ صلائے عام کا لکھنے والا مر سکتا ہی نہیں اور جب مر گئے تو کسی کو کہنا پڑے ہے کہ جس طرح خضر نے اپنے پیچھے عمر جاوداں کا روگ لگایا، وہ اپنے پیچھے صلائے عام کا روگ لگا گئے۔ روگ لگانے کو تو سو موجود مگر یہ کسی کے بس کا بھی ہو......"

(جنوری ۱۹۲۶ء)

ضمیمہ ۲

مکتوب اختر شیرانی

میر صاحب قبلہ!

آداب و نیاز۔ مدت سے محروم التفات ہوں۔ ہرچند کہ اپنی خاموشی کا اعتراف ہے لیکن ساتھ ہی آپ کی بزرگانہ توجہات کا گلہ سنج بھی ہوں ۔ آپ ہی کچھ خیال فرمائیں ۔ بندگانِ محبت کی وحشت سرائیاں، بہر حال جواز و عدم جواز شکایت سے بے نیاز ہوتی ہیں اور رہیں ؎

مرا بہ سادہ دلی ہائے من تواں بخشید
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

پھر خطا بھی کیسی کہ الٹی شکایت کے رنگ میں ؏

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

بات یہ ہے کہ یہ سب نازِ نیاز مندی کی شرارتوں کا نتیجہ ہے ورنہ میرا کیا منہ تھا کہ خواہ مخواہ کی شکوہ طرازی کے جرم بے ادبی کو روا رکھتا اور پھر آپ کے حضور میں! میری توبہ ہے۔

اب سنیئے کہ 'بہارستان' کی ایک خاص اشاعت کے لیے حضور کی تصویر اور مختصر حالاتِ زندگی کی ضرورت ہے، نیز ایک مضمون کی بھی جو تصویر کے ساتھ شائع ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ مضمون اُردو نثر اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہو تو زیادہ موزوں ہوگا۔ کیونکہ آپ جہاں نثر میں ایک لطیف رنگ یا طرز کے مالک ہیں وہاں اس کے مختلف دوراوران کی حیثیت سے بھی بجائے خود باخبر ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ نثر کی ارتقائی کیفیات کی داستان کو آپ سے بہتر نہ تو کوئی سمجھتا ہے اور نہ سمجھا سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان تینوں چیزوں کی فراہمی میں آپ کی نوازشیں مجھے محروم رکھنا گوارا نہ فرمائیں گی۔ خدا نہ کرے!

آپ کا۔ آپ کی محبت کا: اختر!

(جنوری ۱۹۲۹ء)

مکتوب اختر شیرانی

فدایت شوم! کیا بتاؤں کتنی بار جی چاہا کہ عریضہ لکھوں مگر خدا ہی جانے کیوں نہ لکھ سکا۔ یوں تو لکھنے کا سبب بھی معلوم نہ تھا اور سچ پوچھیے تو اب بھی معلوم نہیں مگر اتنا یقین ہے کہ اس پر مجھے افسوس نہ تھا اور نہ ہے کیونکہ آپ کی خدمت میں حاضری ایک فخر سے کم نہیں۔ ہاں نہ لکھنے کی وجہ افسوس کے قابل تھی اور اب اس سے زیادہ رنج کا باعث ہے۔ کس لیے کہ اب بے حجابی کی حالت میں اس کا نام بدقسمتی ہے ؏

اب تو ہیں یہ ندامتیں، صبر کیا تھا ہائے کیوں

آپ کے ادب العالیہ کے شیدائیوں کی فہرست ہو تو اس میں ایک نام میرا بھی داخل کر لیجیے——

ع یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا۔ بشرطیکہ 'زخم' کی اہمیت کے لیے 'زخم رسیدہ' کی جواں سالی 'ناقابلِ التفات نہ سمجھی جائے۔ کیونکہ ذوقِ ارادت کی یہ لن ترانیاں، بہر تقدیر نوائے ارنی سے بے نیاز نہیں۔ اس سے اندازہ کریجیے کہ نیاز نامہ کا مقصد اظہارِ عقیدت و احترام کے سوا کچھ نہیں اور نہ پہلے تھا۔ رہا آپ کی انشائے لطیف پر اظہارِ خیال یہ حقیقتاً مجھ سے بہتر اہلِ ذوق کا کام ہے۔ ایک گستاخانہ جرأت کے ساتھ کچھ لکھا بھی جائے تو ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

ہاں یہ تمنا ضرور ہے کہ آپ کے جواہرِ افکار جس انتشار کی حالت میں ہیں اس سے انھیں نکالیے تو ہمارے ذوقِ ادب پر بڑا ہی احسان ہو۔ بکھرے ہوئے پھولوں پر جو نظریں پڑتی ہیں ان میں جمعیتِ خاطر کا رنگ نہیں ہوتا حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ نگاہوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے کی پریشانی سے بچا کر ایک ہی محور پر جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہم میں سے بہتوں کو اس کا ارمان ہے لیکن اس دنیا میں جس بات کا زیادہ ارمان ہوتا ہے وہی نہیں ہوتی۔ آپ اپنی تحریروں کی یکجائی کی طرف سے جو بے پروائی برت رہے ہیں اس کی تہ میں شاید یہی فلسفہ کام کر رہا ہے۔

راقم: اے نسیمِ سحری بندگیٔ ما برساں
کہ فراموش مکن وقتِ دعائے سحری

اختر شیرانی! (مارچ ۲۶ء)

ضمیمہ ۳

مکتوب قاضی عبدالودود

اس رسالہ کا عارضی التوا، اُردو زبان کی بڑی بدنصیبی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اُردو دانوں میں صحیح ادبی ذوق ابھی تک مفقود ہے۔ آپ کی پاکیزہ، کوثر سے دھلی ہوئی زبان، آپ کی فلسفیانہ و شاعرانہ نازک خیالیاں اور آپ کا بے نظیر اسلوب بیان، ان سب خوبیوں کو رسالہ کی ہردلعزیزی اور قبولِ عام کا ضامن ہونا تھا لیکن دنیائے اُردو کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ آپ کے ہم وطن غالب کو اپنے زمانے میں کس کس کے طعنے نہ سننے پڑے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا اور آج ساری دنیا اس کے کمالات کی معترف ہے یہی حال آپ کی نثر کا بھی ہونے والا ہے۔ آنے والی نسلیں ہرگز اس سے وہ بے التفاتی نہیں کر سکتیں جو موجودہ نسل کر رہی ہے۔ آپ اپنے کام میں مصروف رہیں اور صلائے عام کو بالاستقلال نکالتے رہیں۔

(مارچ ۲۳ء)

مکتوب قاضی عبدالودود

فروری کا صلائے عام نظر سے گزرا۔ آپ کی زبان، آپ کے اسلوبِ بیان اور نیز آپ کے پاکیزہ خیالات کے متعلق مجھ ہیچمدان کا کچھ لکھنا اگر سوئے ادب نہ ہوتا تو میں ایک ایک فقرہ کی داد دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے مضامین تعریف و توصیف سے بے نیاز ہیں اور اردو کی عزت آپ کے دم سے قائم ہے۔ برہمن کا کلام شائع

فرما کے آپ نے اہلِ ذوق پر خاص احسان کیا ہے۔ برہمن باوجود ہندو ہونے کے عمدہ شعرائے شاہجہانی میں ہے۔ اللہ اللہ! ایک زمانہ تھا کہ ہندو فارسی میں اہلِ زبان کی طرح دادِ خوش کلامی دیتے تھے اور آج اُردو سے وہ نفرت ہے کہ اگر بس چلے تو ہندوستان سے اسے خارج کر دیں۔ میں بھی آج ایک ہندو شاعر کا منتخب کلام فارسی ایک قدیم قلمی بیاض سے جو تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل کی لکھی ہوئی ہے نقل کر کے ابلاغ خدمت کرتا ہوں۔ ان کا ترجمہ میں نے تذکرہ مصحفی میں دیکھا ہے مگر اس وقت موجود نہیں کہ ان کے کچھ حالات لکھ سکوں۔ دہلی کے ایک اور باکمال قدرت اللہ قدرت مرحوم کا کلام فارسی بھی بھیجتا ہوں۔ قدرت، مرزا جعفر علی حسرت اور شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔ اُردو کے مسند اساتذہ میں ہیں لیکن فارسی کلام میں بھی پختگی موجود ہے۔ مولانا روم نے ایک شعر کا جواب کیا خوب دیا ہے۔ میں دونوں نقل کرتا ہوں:

مولانا روم ؎

میگفت چشم مستش باکاکل سیاہش ۔۔۔ من می دہم فلاں را، تو در ربا کلاہش

قدرت ؎

میگفت چشم ابرو با زلف چوں کمندش ۔۔۔ من می کشم فلاں را تو دست و پا بہ بندش

میرا یہ مطلب نہیں کہ قدرت کا شعر مولانا کے شعر کے برابر ہے لیکن اس ہندی نژاد شاعر کی جرأت تو دیکھو۔[1]

(مارچ ۱۹۲۲ء)

ضمیمہ ۴

دلی، اُردو اخبار ۱۸۳۷-۱۸۳۸ء کی رُو سے

(مئی اور جون ۱۹۲۴ء کے شماروں میں "اسی نوے برس پہلے کی دلی" کے عنوان سے اُردو اخبار دہلی کے ۱۸۳۷-۳۸ء کے فائل مطالعہ سے جو کچھ حالات اخذ کیے جا سکتے تھے وہ ایک مضمون کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ بیچ بیچ میں غیر ضروری باتیں آ گئی ہیں جنھیں میں نے چھوڑ دیا ہے، باقی مضمون کو جوں کا توں نقل کر لیا ہے۔ اب نہ اُردو اخبار ملتا ہے نہ وہ دلی والے جو سینہ بسینہ قدیم دلی کو محفوظ رکھتے آتے تھے اس لیے ان بیانات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ صلائے عام کے ذکر میں میر ناصر علی کی پیدائش سے بھی دس سال پہلے کی دلی کا ذکر جو دیکھتے دیکھتے ان کے سامنے اُجڑی اور پھر مٹی چلی گئی —— نامناسب نہ ہوگا۔ یہ اس مضمون کا اہم ترین ضمیمہ سمجھا جانا چاہیے)

..... یہ اکبر بادشاہ (اکبر شاہ ثانی) کا عہدِ آخر اور بہادر شاہ بادشاہ کی تخت نشینی کا آغاز ہے..... فارسی کا رواج سرکاری دفتروں میں پہلے اس درجہ کا تھا کہ جس طرح اب اُردو فارسی کے کاغذات انگریزی میں ترجمہ ہو کر پیش ہوتے ہیں پہلے انگریزی کاغذات کا فارسی میں ترجمہ ہونا لازمی تھا۔ انگریزی زبان کا بہت کم رواج تھا۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کسی کو پسند نہ تھی، نہ انگریزی لباس و طعام

---

[1] اخیر میں رائے صاحب سنگھ خاموش دہلوی کے دس پندرہ فارسی شعر نقل کیے ہیں۔

سے انس تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان دنوں فارسی کا رواج انگریزی دفتروں سے کم ہو چلا تھا۔ فارسی کی جگہ اُردو کی تائید ہوئی۔

عدالتوں میں صدر عدالت، صدر امین، صدر الصدور اور منصف مقدمات کے فیصلے کرتے تھے۔ قیدیوں کو صرف تین پیسے روز خوراک کے ملتے تھے، اور مرد و عورت یکجا قید رہتے تھے۔ عدالت میں سزا یافتہ کی گواہی مقبول نہیں ہوتی تھی۔ دو چار بڑے شہروں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ہندستانی ڈاک تھی۔ جب سرکاری محکمہ ڈاک کا مقرر ہوا تو ہندستانی ڈاک والوں نے واویلا مچائی کہ ہمیں سرکاری ڈاک پسند نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فاصلے میں موافق چٹھیوں کا محصول کم و بیش تھا اور رجسٹری و پارسل و بیمہ کا پتا نہ تھا۔ ڈاکٹری یعنی انگریزی طبابت کی طرف لوگوں کو توجہ ہوئی کہ انگریزی علاج زیادہ مفید اور زود اثر ہے یہاں تک کہ بادشاہ کی بیماری میں صلاح دی گئی کہ انگریزی علاج کیا جائے مگر یہ صلاح چلی نہیں کیونکہ بادشاہ کو فقیری اور درویشی کی طرف زیادہ رغبت تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ بہادر شاہ اور اکبر شاہ دونوں کو امورِ سلطنت سے زیادہ پیری مریدی کا شوق تھا۔

۱۴ جولائی ۱۸۳۷ء کے پرچہ میں شکایت ہے کہ قانون کی بے حد پابندی سے رعایا کو زیادہ آرام نہیں حالانکہ ان دنوں قانون بہت کم تھے، تعزیرات ہند ابھی مکمل نہ ہوا تھا۔ تعزیرات ہند کی شانِ نزول ۵ جنوری ۱۸۳۸ء کے اخبار میں اس طرح درج ہے۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (میکالے صاحب نے) ۱۶ جون ۱۸۳۴ء سے ۳۰ نومبر ۱۸۳۷ء تک یعنی ۳ برس ۵ مہینے ۱۴ دن کے واسطے بطور تنخواہ کے تین لاکھ پینتالیس ہزار پانچسو پچیس روپے پائے اور کل ۴۹۲ قانون بنائے جو چھاپے جاویں تو قریب ۹۶ کالم اس اخبار کے ہوں چھپائی کا خرچ علیحدہ رہا۔ علاوہ ان صاحب کے کہ یہی ایک ممبر مجلس قوانین کے تھے اور کئی صاحب اور عملہ فعلہ تنخواہ پاتے رہے ہیں۔"

۱۸۳۷ء میں حکم ہوا کہ سرکاری حساب کتاب میں ہندی مہینوں کی جگہ انگریزی مہینے اور تاریخیں لکھی جائیں۔ قانون ۱۱ ۱۸۳۶ء میں صاحب لوگوں پر نالش کرنے کی اجازت ہوئی کہ صدر امینوں کی عدالت میں پیش ہوا کرے۔ اس پر صاحب لوگوں نے بہت ناراضی ظاہر کی لیکن وہ ناراضی بے کار گئی۔ کرنیل چرچل صاحب بہادر بریگیڈیر پر ایک ہندستانی نے بیس ہزار روپے کی نالش کی۔

"یہ پہلی دفعہ ہے کہ تعمیل اس قانون کی جو نیا جاری ہوا ہے، ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ انگریز اور ہندستانی میں کچھ تمیز نہ رہی۔"

(اخبار، مورخہ ۴ جولائی ۱۸۳۷ء)

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس شہر کا مدار ایامِ مفسدہ سے پہلے قلعہ معلٰی پر تھا اس لیے قلعہ معلٰی کی خبریں سب سے زیادہ مقدم سمجھی جاتی تھیں شاہ عالم کے بعد بہادر شاہ تک سرکار انگریزی سلطنتِ مغلیہ کی زندگی کا باعث رہی۔ جو رقم بادشاہ کے خرچ اخراجات کے لیے ملتی تھی اس سے قلعہ کے سلاطین اور ملازم لوگوں کے علاوہ اہلِ شہر کو بھی بہت فائدہ تھا۔ ملازموں اور غیر ملازموں کو برائے نام بھی جو کچھ ملتا تھا اس کی ہر شخص کی نگاہ میں بڑی عزت تھی۔ دو ڈیڑھ روپے ماہوار کے لیے دس بیس روپے خرچ ہو جاتے تھے مگر نام بڑا تھا کہ قلعہ سے تنخواہ پاتے ہیں ——— !

قلعہ کی خبریں گویا شہر کی خبریں تھیں اور شہر کی خبریں گویا ملک کی۔ اکبر شاہ کے وقت کی خبروں کا خلاصہ اکثر اس طرح دیکھا گیا کہ:

"الماس خواجہ سرا پیش ہوا۔ خواجہ سرا نے سات اشرفیاں نذر گزرانیں۔ خواجہ سرا کو پانچ پارچہ اور دو رقم جواہرات کا خلعت مرحمت ہوا۔ حضور والا نے غسلِ صحت فرمایا ——— غسلِ صحت میں پانچ روپے خاص تراشوں (خلیفہ حجام) کو ایک اشرفی حمامی کو اور کدار طوائف کو ایک دوشالہ اور "محفل افروز بائی" کا خطاب عطا ہوا۔ انور محل بیگم صاحبہ کے ہاں سے بڑی صاحب وصاحبان کو ایک ایک بٹوہ مسالہ کا بھرا ہوا ملا۔ مرزا زمان شاہ نے عرض کی کہ ایک شخص خدمت کپتانی کے تین سو روپے نذرانہ دیتا ہے۔ ارشاد ہوا، سمجھ کر جواب دیا جائے گا۔ راجہ سوہن لال سے فرمایا کہ یہ زیور گروی رکھ لو۔ راجہ جی نے انکار کیا۔ بیگمات شاہی کی شکایت پر جوالا پرشاد کپتان پر خفگی ہوئی۔ قلعہ میں بادشاہ قلی (چیلے) کا اختیار زیادہ تھا۔ ناظر اور چیلوں کی زیادہ چلتی تھی کہ اہلکاروں کے کاموں میں بھانجی مارا کرتے تھے۔ امام بخش خواجہ سرا کی سفارش سے اکثر آدمیوں کے کام بن جاتے تھے..... قلعہ معلیٰ کے اندر محلات میں عالیہ بیگم صاحبہ اور فاطمہ بیگم صاحبہ کارکن تھیں۔"

۹ر جولائی ۱۸۳۷ء کے پرچے میں شہر کی کوچہ بندی سے شہر والوں کی تکلیف کا ذکر ہے......

شہر کے امرا میں مہاراج ہندو راؤ کی بہت شہرت تھی۔ ان کے ہاں رقص وسرود کے جلسے زیادہ رہتے تھے جن میں صاحبان انگریز اور ہندستانی رؤسا شریک ہوا کرتے تھے۔ پچاس ساٹھ برس پہلے ہندو راؤ کی تصویریں قلمی بہت دیکھنے میں آتی تھیں۔ ہندو راؤ نہایت خلیق باوضع سردار تھا......

۹ر جون ۱۸۳۷ء میں منشی عمو خان صاحب ریاست الور کے منتظم ہو کر بھیجے گئے۔ منشی صاحب محکمۂ دیوانی شاہ جہاں آباد کے سررشتہ دار تھے۔ ان کی وجہ سے دلی کے اور لوگ بھی الور میں ملازم ہو گئے......

اکبر شاہ کے مرنے کا حال اس طرح لکھا ہے کہ:۔

"..... بادشاہ کو مرضِ استسقا ہو گیا۔ تبدیل آب و ہوا کے لیے درگاہ قطب شاہ میں تشریف لے گئے۔ حکیموں نے بہت علاج کیے...... آخر شب جمعہ کو بعد نمازِ مغرب (۹ر اکتوبر ۱۸۳۷ء) انتقال ہوا۔ مرتے وقت صرف راجہ سوہن لال، محمد میر خاں جو فقیری میں دم مارتے تھے اور وہ چیلے جن کو قلعہ میں آنے کی اجازت تھی، حضور کے پاس تھے۔ حضور نے محمد میر خاں سے ارشاد فرمایا تھا کہ مرتے وقت تبرکات میری چھاتی پر رکھ دینا۔ بادشاہ کی عمر ۸۲ سال کی تھی۔ شہر والوں کو بادشاہ کے مرنے کا بہت افسوس ہوا۔ بادشاہ نہایت نیک مزاج تھے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کسی کی کسی حالت سے دل شکنی منظور نہ تھی اور حسب قول صاحب "اخبار دہلی" "باوصف بادشاہی کے طبیعت فقیری کی طرف بہت مائل تھی حقیقت یہ ہے کہ اس کوچے سے بہت خبردار تھے۔"

بعد انتقال شاہ مرحوم مرزا ابوظفر بڑے بیٹے جو ولی عہد تھے رات ہی کو تخت سلطنت پہ جلوہ افروز ہوئے اور رو ن کو جامع مسجد تشریف لے گئے جہاں نمازِ شکرانہ ادا کی۔

ان کا لقب ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی تھا۔ بادشاہ کی شہرت عوام میں بادشاہی سے زیادہ شعر گوئی میں تھی۔ ......
خطِ طغریٰ کی مشق میں بادشاہ کا جواب نہ تھا۔ آغازِ تخت نشینی میں بادشاہ نے دو چار کام کی باتوں کی طرف توجہ فرمائی۔ حکم دیا کہ سات برس کی عمر سے زیادہ کا کوئی لڑکا محل میں جانے نہ پائے۔ قلعہ میں مکانات صاف کیے جائیں۔ مکانات جدید جو نقار خانے وغیرہ کے محاذی میں اکثر رعایا نے بنا لیے تھے مسمار کیے جاویں۔ کچھ مکانات جو قریب نقار خانے کے دروازے کے واقع ہیں گرا دیے جائیں۔ صرف شاہجہاں بادشاہ کے وقت کے کوٹھے قائم رہیں۔ ...... چیلوں میں سوائے ممتاز علی کے اور کوئی چیلہ آنے نہ پائے۔ خرچ میں تخفیف کی تاکید ہوئی۔ بیگمات کے پاس ضرورت سے زیادہ جو عملے تھے موقوف کیے گئے۔ صاحبِ دہلی اخبار نے لکھا ہے کہ :

> "حضور والا کا مزاج جز رسی کی طرف بہت مائل ہے یہاں تک کہ جناب عالیہ کے امام باڑے کا جو اسباب نقرہ اور طلا کا تھا حکم ہوا کہ سب تڑوا کر ظرف بنائے جاویں ایسی باتوں سے تمام قلعہ والے بلکہ جو کوئی سنتا ہے سخت ناراض ہے۔"
>
> "حضور والا کوٹھوں کی موجودات میں بہت مشغول رہتے ہیں اور سنا گیا کہ بعض کوٹھوں میں بہت نقدی اور جنس نکلی کہ بادشاہ مرحوم کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ ...... جواہرات اور اکثر اسباب طلائی بہت نکلا۔"
>
> "مختار کو حکم ہوا سواروں کا احوال بخشی سے، اور احوال پیادوں کا کپتان سے دریافت ہو کر کس قدر کہاں تعین ہیں۔"
>
> "داروغہ فراشخانہ (اور دوسرے) نمک خوارانِ شاہی نے خوب نمک حلالی کی۔ حق تو یہ ہے کہ تار تار کر کے لوٹا۔"
>
> "پانچ پانچ سو روپے درماہہ مرزا بابر کے بیٹوں اور گیارہ گیارہ سو روپے مرزا سلیم کے بیٹوں کو شاہ مغفور کے وقت میں مقرر تھا۔ اب دو دو سو روپے جو تجویز ہوا اس پر وہ لوگ ناراض ہیں۔"

مختار نے عرض کی کہ مدار المہام سابق، دعویٰ دولا کھ کا شاہ مغفور پر رکھتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ عالمِ بے ہوشی کی نوشت جائز نہیں ہے۔ فی الواقع ظاہر ہے اور مشہور ہے کہ ایامِ بیماری میں اکثر لوگوں نے جو چاہا سو لکھوا لیا۔ ہر چند شاہ مغفور کا صحت میں بھی یہ حال تھا کہ جو لوگ چاہتے تھے لکھوا لیتے تھے لیکن عالمِ بیماری میں تو لوگ کھل کھیلتے تھے۔ جس کا قابو بنا سو لے اُڑا۔

یہ حال کفایت شعاری کا پڑھ چکے ہیں جو ۲ اکتوبر ۱۸۳۷ء سے لے کر ۲ نومبر ۱۸۳۷ء تک درج کیا گیا۔ اسی اخبار میں یہ بھی درج ہے کہ :

> "مختار کو حکم ہوا کہ تنخواہ کسی غریب کی موقوف نہیں کی جائے۔ ایسا چاہیے کہ کسی کو تکلیف

نہ ہو بلکہ بار بار یہی احکام زبانِ مبارک سے ارشاد ہوئے اور اکثر تنخواہوں میں بھی اضافہ ہوا۔"

یہ باتیں واقعی انتظام کے لیے مناسب تھیں۔

یکم دسمبر ۱۸۳۷ء کے پرچے میں ہے کہ:

"جناب عزیزالنسا بیگم نکاحی خاص کو خطاب تاج محل کا عنایت ہوا اور خدمت حکم احکام اندرونِ محل کی سلطان بیگم بڑی صاحبزادی کو مرحمت ہوئی۔"

۸ دسمبر ۱۸۳۸ء کے پرچے میں ہے کہ:

"بموجب حکم بادشاہ سب تاج محل کو نذر دیں اور میاں کالے صاحب کو حکم دیا گیا کہ نکاح تاج محل کا حضور سے پڑھ دو۔ میاں کالے صاحب نے نکاح پڑھ دیا اور تاج محل کو مربہ بنایا۔"

"اس وقت کے اخباروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہادر شاہ کو گورنمنٹ انگریزی کی وجہ سے سلطنت کے لوازم حاصل تھے مگر ان کا وقت زیادہ تر معمولی کاموں میں بسر ہوتا تھا۔ محل میں بیگمات کے خانگی جھگڑے لگے رہتے تھے۔ شعر و سخن کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ قلعہ میں جناب عالیہ کا امام باڑہ تھا اور ایک دفعہ یہ افواہ ہوئی کہ دہلی سے لکھنؤ کو علمِ بادشاہ کی طرف سے بھیجا گیا تھا اس پر عوام میں بہت بحث رہی کہ بادشاہ کی طبیعت عقائد اثنا عشری کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ دونوں طرف سے کتابیں لکھی گئیں........

(صلائے عام: مئی، جون ۱۹۲۴ء)

بہار میں شادی کی رسمیں

شکیلہ اختر

ہر جگہ کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ وہاں کے رہنے والے اپنی اپنی انفرادیت ہی سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں کہ فلاں بنگالی ہے۔ فلاں یوپی کا ہے۔ فلاں پنجابی اور فلاں سرحدی ہے ——— مگر زبان، لباس اور رہن سہن کے فرق کے ساتھ ہر علاقے کی شادی کی رسموں میں کچھ نہ کچھ یکسانیت کے باوجود اپنا اپنا ایک الگ بن بھی ہے ———

بہار میں شادی کی تاریخ مقرر ہو جانے کے بعد برات آنے سے ایک ہفتہ پہلے لڑکی کو مائیوں (جسے بہار میں مانجھا کہا جاتا ہے) بٹھا دیتے ہیں۔ مانجھا بٹھانے کی رسم اس طرح سے ہوتی ہے کہ کُسُم کے پھول میں رنگی ہوئی ململ کی زرد ساری اور ململ ہی کا زرد ڈھیلے آستین کا بلوز اور اسی طرح کا زرد پٹی کوٹ ایک نئی سینی میں سجا کر رکھتے ہیں، دوسری سینی میں سر میں دینے کا کوئی خوشبودار تیل اور نئی کنگھی رکھی جاتی ہے، دو تین کٹوریوں میں خوشبودار اور سرسوں کا تیل دھرا رہتا ہے اور ایک نئی لگنی میں خوشبودار اُبٹن گھلا رہتا ہے۔ یہ ساری چیزیں بڑی آب و تاب سے مجلس میں رکھی جاتی ہیں۔ ہونے والی شادی کا وہ پہلا دن بڑا خوبصورت ہوتا ہے، لڑکی کو صبح ہی نہلا دیتے ہیں، ساری بستی، اپنے رشتہ داروں اور ملنے ملانے والوں کے یہاں ایک دن پہلے ہی سے نوید بانٹ دیا جاتا ہے کہ لڑکی مانجھا بیٹھے گی، نوید بانٹنے کا کام عام طور پر حجامن (نائی کی بیویاں) ہی کرتی ہیں۔

بہار میں امیر اور غریب سب ہی گھرانوں میں ایک عام رسم یہ ہے کہ لڑکا لڑکی کی شادی میں چاندی کے ورق سے چھپے ہوئے کپڑے خاص خاص وقتوں کے لیے استعمال کرتے ہیں یہاں تک کہ شادی کے وقت جو بستر بچھایا جاتا ہے، دلہن کے شہانہ کپڑے، بکسوں اور صندوقوں کے غلاف، دراوردریچوں کے پردے، نہالچہ، اوٹ کے پردے، غرض شادی کے وقت کے سارے کپڑے سُرخ اور چھپے ہوئے رہتے ہیں۔

لڑکی کو مانجھا بٹھانے کے لیے اس کے کمرے سے مجلس میں کوئی رشتہ دار عورت گود میں اٹھا کر لاتی ہے، لڑکی سُرخ چھپی ہوئی چادر میں چھپی اُس عورت کی گود میں ایک بیل کی طرح لپٹی ہوئی، اس کی گردن پر اپنا سر جھکائے آنکھیں بند کیے رہتی ہے۔ بیچ مجلس میں سُرخ نہالچے پر دُلہن کو بٹھا دیا جاتا ہے اور وہ بیچاری اپنے ایک گھٹنے پر اپنے سر کو جھکائے آنکھیں بند کیے بیٹھی رہتی ہے۔

گانے کی جھنکار اور ڈھولک کی مدھر آواز دلوں میں بڑی پیاری گدگدیاں پیدا کر دیتی ہے۔ ویسے تو مہینوں پہلے سے گیتوں کی لہکار گونجنے لگتی ہے مگر مانجھے کا دن بیاہ کا پہلا دن سمجھا جاتا ہے، مرثنیں اپنی پارٹی کے ساتھ مانجھے والے دن سے ہی آدھمکتی ہیں

اور ہر ہر موقعے کے گانے لہک لہک کے گاتی رہتی ہیں۔

مانجھے کے روز مجلس میں سب سے پہلے لڑکی کے بال کھول دیے جاتے ہیں کوئی لڑکی ڈھنکی چھپی دلہن کے بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کرنے لگتی ہے اور دوسری لڑکی ایک سرخ چھپے ہوئے رومال سے دلہن کی پیشانی کو اس طرح سے ڈھکے دیتی ہے کہ دولہن کی صورت کسی کو دکھائی نہ دے۔ پھر باری باری سات سہاگنیں ذرا ذرا سا اُبٹن لے کر پہلے اپنے گالوں پر لگاتی ہیں اس کے بعد دُلہن کے چہرے پر ہلکے سے اُبٹن والی انگلی لگا دیتی ہیں ——— جب یہ سات سہاگنوں والی رسم ختم ہو جاتی ہے تب گھر کی کوئی رشتہ دار عورت اسی لمبی چوڑی چادر کا ایک حصہ اپنے اوپر ڈال کر دلہن کے چہرے اور ہاتھ پیروں میں پوری طرح سے اُبٹن لگا کر پھر تیل سے چھڑا دیتی ہے اور اس درمیان میں مراثنیں، رشتہ دار اور مہمان عورتیں ٹوٹنے، جوگ اور سہلے گیتوں سے ایک رونق پھیلائے رکھتی ہیں۔ لڑکی کو پھر کمرے میں لے جا کر زرد رنگ کا جوڑا پہنا دیتے ہیں، اس دن سے بال کھلے ہی رہتے ہیں۔ زیور اور چوڑیاں بھی اتار دیتے ہیں۔ کھلے بالوں والی لڑکی زرد لباس اور اُبٹن کی خوشبو سے بسی ہوئی بڑی پیاری نظر آتی ہے۔ جس برتن میں اُبٹن کھولا جاتا ہے وہ بھی بھی کو نیگ میں مل جاتا ہے، اس دن سے برات آنے تک دن بھر میں کئی دفعہ حجامن لڑکی کو اُبٹن لگا جاتی ہے۔ مانجھے کے اندر لڑکی پر بڑا پیارا سلونا حسن کھل اٹھتا ہے پیلی پیلی سی دلہن، سچ مچ جیسے سونے میں دمکنے لگتی ہے۔ پہلے مانجھے کے اندر کسی مرد کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی مگر اب تو اسی پیلے پیلے رنگ کے بستر پر بھائی اور بہنوئی کچھ ایسا لوٹ پوٹ کر باہر نکلتے ہیں کہ ان کے کپڑوں پر بھی مانجھے خانے کی زردی چڑھ جاتی ہے۔

برات آنے سے دو دن پہلے "رت جگا" ہوتا ہے پہلے تو اس رسم کو بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے، رات بھر سچ مچ میں جاگ کر رسم اور گلگلے بنانے تھے پھر درگاہوں اور مسجدوں پر چڑھاوے کے لیے بھیجتے تھے مگر اب اس کا رواج کم ہو گیا ہے، صرف شگون کے لیے تھوڑا سا بنا لیتے ہیں۔

برات آنے سے ایک دن پہلے شامیانے کی رسم ہوتی ہے، گھر کے اندر آنگن یا چھت پر شامیانہ لگایا جاتا ہے اس وقت بڑے جھنکار کے گانے ہوتے ہیں، گھر کے سارے مرد اس وقت اندر آتے ہیں اور رشتے کی سالیاں، سرہج چھپ چھپ کر بڑی پیاری ہولیاں کھیلتی ہیں، اُبٹن کا کھیل بھی اس وقت کھیلا جاتا ہے، شامیانہ لگاتے وقت ایک خاص رسم یہ ہوتی ہے کہ لڑکی یا لڑکے کی پھوپھی شامیانے کی ایک ڈوری پکڑ کر اپنا نیگ مانگتی ہے اور اس وقت تک ڈوری نہیں چھوڑتی ہے جب تک کہ حیثیت کے مطابق اس کو نیگ نہ مل جائے۔

شامیانہ والا دن بڑا معروف ہوتا ہے، اسی دن جہیز کی فہرست بنائی جاتی ہے، گھر کے سارے ملازم اور رعیتوں کو شامیانے تلے نیا جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ دلہن کے سارے جہیز کو کمروں میں سجا کر رکھتے ہیں اور برات کے ساتھ آنے والی سمدھنوں اور سمدھیوں کے آگے لگائے جانے والے تھالوں اور ہاروں کو سجایا جاتا ہے۔ سمدھی اور سمدھیوں کو دیے جانے والے تھال اپنی حیثیت کے مطابق چاندی، تانبے اور سٹیل کے ہوتے ہیں جن کو نیچے بند باسے بھر کر طبق میوے اور گوٹے کے طروں سے سجا کر بڑا خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ تھالوں کی تعداد سات عدد سے لے کر سو سوا سو تک ہوتی ہے۔ پھر میوے اور مکھانوں کے ہار ہوتے ہیں۔ یہ بھی دو تین سو کی تعداد میں دیے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی چینی اور گڑ کے باریک ملیدے اور چرے کی کئی ٹیفیاں

بھی خاص طور پر دی جاتی ہیں۔ یہ ایسی چیزیں خاص سمدھی اور سمدھنیوں کی ہوتی ہیں جنھیں برادری میں بڑی اہمیت کے ساتھ بانٹا جاتا ہے۔

شامیانے والی رات کو رشتہ داروں کے جوڑے لڑکے یا لڑکی کو "مانجھا پہنانے" کو آتے ہیں، دوستوں اور ملنے ملانے والوں کے یہاں سے بھی کپڑے آتے ہیں۔ جب جوڑوں کی سینیاں گھر پر آکر اکٹھی ہو جاتی ہیں تب خادماؤں کے سروں پر ایک قطار سے وہ سینیاں رکھی جاتی ہیں اور شہنائی باجوں اور گیس کی روشنیوں کے درمیان گاتی بجاتی عورتیں جوڑے لیے کچھ دور تک گشت لگا کر واپس دولہن کے کمرے میں آجاتی ہیں اور پھر باری باری سے بزرگوں اور رشتہ داروں اور دوستوں کے کپڑے سامنے جھکائے، آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی دولہن کے سر پر رکھی جاتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ "تیرے دادا گھر کا ہے مانجھا" "تیرے چچا گھر کا ہے مانجھا" "جوڑا پہنو شہانی بیٹی مانجھا" اس کو مانجھا پہنانے کی رسم کہتے ہیں۔ مانجھا پہنانے والی رات تقریباً ہنستے کھیلتے گاتے بجاتے گزار دی جاتی ہے ——— اندر اور باہر ہر جگہ رونق ہی رونق ہوتی ہے۔ باہر مردانے میں آنے والی صبح کے لیے بڑی تیاریاں ہوتی رہتی ہیں۔ رات ہی سے ایک طرف شامیانے کے نیچے کئی باورچی برات والوں کے لیے قسم قسم کے عمدہ کھانے پکانے کے اہتمام میں لگے رہتے ہیں۔ زمیندار گھرانوں یا جن کی حیثیت اچھی ہوتی ہے ان کے یہاں تو برات آنے سے کئی دن قبل ہی باورچی خانہ باہر چلا جاتا ہے اس طرح سے گھر کی عورتوں کو شادی بیاہ کے مخصوص کاموں کے لیے کافی سہولت ہو جاتی ہے۔ آخر وہ معصوم اور سلونی رات دھیرے دھیرے ختم ہو جاتی ہے۔ مرانیں صبح کے پیارے گانوں سے برات آنے والے دن کا افتتاح کرتی ہیں۔ پھر بڑی چاہی والی صبح شروع ہو جاتی ہے۔ برات کے دن زمیندار یا اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں دوپہر کے وقت ساری بستی میں عمدہ قسم کا کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔ کھانا بانٹنے پر بھی گھر پر آئے ہوئے بستی بھر کے مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ یہ بات شہر کے اندر نہیں ہوتی، شہروں میں تو بس گھر پر آئے ہوئے مہمانوں کو ہی کھانا کھلاتے ہیں۔

بہار میں یہ عام دستور ہے کہ اپنی لڑکی کو جیسا بھی جہیز دیں مگر براتیوں کو کھانا ناشتہ بہت ہی عمدہ قسم کا دیتے ہیں اور کئی کئی وقتوں کا دیتے ہیں۔ لڑکی والوں کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ جہیز تو ہم اپنی بیٹی اور داماد کو دیتے ہیں مگر ہمارے اصل مہمان تو ہمارے براتی ہی ہوتے ہیں اور ہم ان کی جتنی بھی خدمت کریں وہ کم ہی ہے۔

برات والے دن کا آغاز بڑے ہنگاموں سے ہوتا ہے، کہیں فرش لگ رہے ہیں، کہیں شامیانے لگائے اور سجائے جاتے ہیں، جھنڈیاں اور زنجیریں ہر طرف لہرائی جاتی ہیں۔ گھر کے اندر دولہا دولہن کے لیے ایک کمرے کو خوب آراستہ کیا جاتا ہے، دولہن کے کمرے کی ساری چیزیں سُرخ ساٹن کے کپڑوں کی طبق سے چھپی ہوتی ہیں۔ در اور دریچے کے پردے تک سُرخ رنگ کے اور چھاپ سے لٹکتے ہوئے ہوتے ہیں۔ کمرے کو پھولوں، ہاروں، موتیا اور سہاگ کے عطروں سے خوب خوب بسا دیا جاتا ہے۔ اس کمرے کی خوبصورتی کو دیکھ دیکھ کر کنواری لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور شادی شدہ لڑکیوں کو ایک گزری ہوئی پیار میں بسی، بڑی خوبصورت سی رات یاد آجاتی ہے۔

اگر لڑکی کا نکاح پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے تو شادی کا دن ذرا ہلکا ہلکا سا نظر آتا ہے اور شادی کے ہنگامے آدھی رات تک ختم ہوتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں اور جو کہیں نکاح بھی اسی دن ہونے والا ہوتا ہے تب تو ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے، ادھر دولہن کی رونمائی ہو رہی ہوتی ہے اور ادھر آفتاب کی کرنیں بکھرنے لگتی ہیں۔ شادی والے دن میں سب سے پہلے دلہن کو نہلانے کی تیاری ہوتی ہے

اس کے بعد گھر کی عورتیں اپنے سروں پر کورے لوٹے، گھڑے لیے جوگ اور ٹونے کے گیت گاتی ہوئی (ایک خیالی پوکھر سے پانی لانے جاتی ہیں جو اسی موقعے کے لیے خاص طور پر بڑے ارمانوں سے کسی روایتی جگہ پر کھودا جاتا ہے) نلکے یا کنویں پر سے پانی لانے جاتی ہیں اور واپسی میں ایک قطار سے پانی کے بھرے ہوئے گھڑوں پر سُرخ لمبی سی چادر ڈال دیتی ہیں پھر گاتے بجاتے اسی پانی سے دلہن کو اس کی سہیلیاں نہلاتی ہیں۔ وہ مانجھے والے کپڑے اسی دن اتار دیے جاتے ہیں اور وہ کپڑے نائن لے لیتی ہے۔

لڑکی کا اگر نکاح پہلے سے ہوا ہوتا ہے تو لڑکی نے جو کپڑے نکاح کے روز پہنے تھے وہی جوڑا اس وقت پہنا دیا جاتا ہے اور اگر نکاح ہونا باقی ہے تب بھی نکاح میں پہننے والا جوڑا پہنا دیتے ہیں، یہ کپڑا بھی سُرخ ہوتا ہے جس پر طبق اور چمکی کے چھاپ جگمگاتے رہتے ہیں ——!

لڑکی کو نہلا کر کمرے کے اندر ہی رکھتے ہیں۔ وہ بیچاری اپنی سہیلیوں میں تو کچھ ہنس بول لیتی ہے مگر جہاں گھر کی بھی کوئی بزرگ آئیں وہ بیر بہوٹی کی طرح سمٹ کر پھر اپنی آنکھوں کو بند کر لیتی ہے۔ لڑکی کو نہلا کر مہندی لگانے کی رسم ہوتی ہے۔ سات سہاگنیں مل کر مہندی پیستی ہیں پھر لڑکی کی داہنی ہتھیلی پر سات سہاگنیں پہلے تھوڑی تھوڑی مہندی لگا کر شگون دے دیتی ہیں تب کہیں دلہن کے ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگائی جاتی ہے۔ مہندی لگانے کے وقت کے گانے بھی بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ لڑکی بیچاری سر جھکائے آنکھیں بند کیے پلنگ کے کنارے پاؤں لٹکائے بیٹھی رہتی ہے اور اس کے ہاتھ اور پیروں میں مہندی لگی رہتی ہے۔ اگر لڑکی کا نکاح پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے تب اسی وقت اس کی ناک میں سچے موتی پرویا ہوا سونے کا بڑا سا نتھ ڈال کر لبوں پر مسّی کی ہلکی سی دھڑی بٹھا دیتے ہیں اور جو نکاح نہیں ہوا ہوتا تو لڑکی کے ناک میں نتھ اور لبوں پر مسّی نہیں لگاتے، جب نکاح ہو جانے کی خبر آ جاتی ہے تب ناک میں نتھ ڈال کر مسّی لگا دیتے ہیں۔

عام طور پر شام ہوتے ہوتے برات آنے کی دھوم مچ جاتی ہے، پہلے تو برات عام طور پر دو دن ٹھہرا کرتی تھی مگر اب بہ دستور ختم ہو رہا ہے۔ لڑکی کے گھر بیویوں تو پہلے ہی سے باجوں کی ٹولیاں بیٹھی رہتی ہیں اور گیتوں کی جھنکار عروج پر ہوتی ہے مگر برات کے ساتھ جو شہنائی، باجے اور بینڈ اور روشن چوکیاں ہوتی ہیں ان کی لہک اور دھوم دھڑکے کا کیا کہنا ——— بہار میں شادی بیاہ کے موقعے پر جو لوک گیت گائے جاتے ہیں ان کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ٹونے، جوگ، شہانے اور جھومر۔ ٹونے گا کر دلہا کو دلہن کا پا مرید بناتے ہیں۔ ٹونے ہمیشہ طاق گائے جاتے ہیں، پانچ، سات، گیارہ یا اکیس، ٹونے کے بعد شہانہ گایا جاتا ہے، یہ دلہن اور دلہا کی خوبصورتی زیور اور کپڑوں کے گیہنے ہوتے ہیں، اس کے بعد جوگ گایا جاتا ہے، یہ گانا بھی ٹونے ہی کی طرح جادو اور سحر والا ہوتا ہے۔ اس میں بنگال کے جادو کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے اور دولہا بیچارا بنگال کے جادو سے زندگی بھر اپنی بیوی کے آگے بھیڑ بنا رہتا ہے۔ آخر میں، جھومر کے گیت گائے جاتے ہیں۔ جھومر کے گانے بہت ہی پیارے اور محبت میں ڈوبے ہوتے ہیں ———

جیسے :

میں جو ہوتی راجہ، بن کی کوئلیا ———
کوہک رہتی راجہ تیرے بنگلے میں
نجر لاگی راجہ تیرے بنگلے میں

شیام سندر، گگریا کیسے بھروں رے؟
کیسے بھروں، کیسے بھروں، کیسے بھروں رے؟
شیام سندر، گگریا کیسے بھروں رے؟
اس پنگھٹ پر سیاں کا ڈیرا، وہ تو مانگے سہرا!
کیسے بھروں رے؟
شیام سندر، گگریا کیسے بھروں رے؟

بہار میں برات کو ٹھہرانے کا قریب ہی دوسرے مکان میں انتظام کیا جاتا ہے تاکہ وہ آزادانہ طور پر آرام سے رہ سکیں۔ ان کی ضرورت کی ساری چیزیں اس جگہ مہیا کر دی جاتی ہیں اور کئی ملازموں کے ساتھ گھر کے کافی رشتہ دار براتی والوں کے پاس ان کی خاطر میں لگے رہتے ہیں۔ برات آنے پر سب سے پہلے خادمائیں طشتوں پر شربت سجا کر باجے ڈھول کے ساتھ گاتی بجاتی براتیوں کے پاس لے جاتی ہیں ـــــ شربت پلاتے وقت خادمائیں اور مراثنیں گالیاں گاتی رہتی ہیں اور برات کی خاطر تواضع کرنے والے نوجوان براتیوں کو شربت پیش کرتے جاتے ہیں۔ گالیاں تقریباً دونوں ہی طرف سے ہوتی ہیں، جوان اور اچھی شکل کی خادماؤں کو براتی طرح طرح کے فقروں سے پریشان کیے ڈالتے ہیں۔ اس کو شربت پلائی کی رسم کہتے ہیں۔ سمدھی کی طرف سے شربت پلائی کے روپے حسب حیثیت طشت پر رکھ دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پُرتکلف ناشتہ کھلایا جاتا ہے۔ قسم قسم کی نعمتیں پیش کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ چائے اور شربت کی ایسی فراوانی ہوتی ہے کہ کسی براتی کو کہیں شکایت کا موقع نہ مل جائے۔

اندر شامیانے کے نیچے بہار میں ایک خاص رسم یہ ہوتی ہے کہ شادی میں دولہا کو سسرال سے کئی جوڑے ٹھنڈے اور گرم کپڑوں کے دیے جاتے ہیں۔ عام طور پر تو لڑکے والوں کو روپے ہی بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی پسند سے کپڑے اور اپنی ضرورت کی چیزیں بنوالیں۔ شادی کے روز دولہا کو پہنایا جانے والا جوڑا چاندی کے طشت پر سجا کر شامیانے کے نیچے فرش پر رکھتے ہیں اور اپنا خاص درزی اس جوڑے میں ایک معمولی سا ٹانکہ لگا دیتا ہے۔ اس رسم کے وقت لڑکی کی طرف والے سارے مرد اندر موجود رہتے ہیں اور اپنی حیثیت کے مطابق درزی کو روپے دیتے جاتے ہیں۔ اس کو قطعہ پارچہ کی رسم کہتے ہیں۔

اندھیرا ہوتے ہی گیس کی روشنی، باجوں کے دھوم دھڑکوں، مراثنوں اور خادماؤں کے ساتھ دلہن کے گھر والے مرد جنھیں عام طور پر سراتی کہا جاتا ہے، پھولوں کے ہاروں اور عطر دانوں کے ساتھ گلاب پاشیاں کرتے براتیوں کے پاس جاتے ہیں۔ دولہا کا جوڑا، سہرا بندھی، ہار اور طرّہ طشتوں پر سجا کر ساتھ لیے جاتے ہیں۔ پہلے براتیوں کو ہار پہناتے ہیں پھر گلاب پاشیاں کرتے اور عطر لگاتے ہیں اس کے بعد برات کی مجلس میں دولہا کا خلعت پیش کر دیتے ہیں۔ درزی ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور وہی دولہا کو جوڑا پہناتا ہے۔ دولہا کا جوڑا، چوڑی دار سفید ساٹن کا پاجامہ، عمدہ قسم کی ریشمی قمیص، زری کے کام کی خوبصورت بادشاہوں جیسی شیروانی اور اس پر سے بنارسی زردوزی کے کام کا عبا ہوتا ہے۔ سر پر بنارسی جگمگاتی ہوئی پگڑی رہتی ہے اس پر سے پھولوں اور چاندی کی لڑیوں والا دوہرا سہرا ہوتا ہے۔ گلے میں جگمگاتی ہوئی بدھی اور بڑے خوبصورت خوبصورت ہار اور گجرے ہوتے ہیں۔ پگڑی کے اوپر گوٹے کا خوبصورت طرّہ چمکتا رہتا ہے۔ دولہا کو جب خلعت

پہنادی جاتی ہے تب لڑکے والوں کی طرف سے ساچق بھیجی جاتی ہے۔ برات والے لوگ ساچق کو بڑی خوبصورتی سے سجاتے ہیں سب سے پہلے بینڈ باجوں، شہنائیوں اور قسم قسم کے باجوں کی ٹولیاں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کئی مزدور سہاگ پوڑہ کے بڑے سے چنگیر کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں، پھر تانبے کی نئی سینیوں پر گیارہ یا اکیس کی تعداد میں دلہن کے جوڑے ایک قطار سے ہوتے ہیں سہاگ پوڑہ سے لے کر آخری سینی تک سرخ رنگ کا ایک لمبا سا جگمگاتا ہوا کپڑا ڈھنکا ہوا رہتا ہے، اس کپڑے کو "ڈول جھکنا" کہتے ہیں۔ سینیوں کے بعد تلنے کی ہاون شکنیاں میووں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، پھر کسی میں سُرخ رنگ کے بوروں میں چینی ہوتی ہے اور کئی بوروں میں سُرخ رنگ کے نارے بھی ہوتے ہیں۔ سارے براتیوں کے ساتھ یہ لمبا سا قافلہ گیس یا بجلی کی روشنیوں اور آتش بازیوں کے ساتھ دلہن کے گھر میں جب داخل ہونے لگتا ہے تو دلہن کی طرف کے لوگ پیشوائی کے لیے آگے بڑھتے ہیں، پھر سارے براتیوں پر گلاب پاشیاں کی جاتی ہیں اور سب مل کر دلہن کے گھر کے اندر شامیانے کے تلے آجاتے ہیں۔ سسرال سے اگر چڑھاوے کے زیور آتے تو برات والے زیور کا وہ طشت سرات والوں کے ذمہ لگا دیتے ہیں۔ اس وقت دو طرفی گانا ہوتا ہے۔ دلہا کی طرف کی خادمائیں اپنی طرف کے گیت گاتی ہیں اور لڑکی کی طرف والیاں لہک لہک کر ایسے گیت گاتی ہیں جن میں لڑکی کے سسرال والوں کو بخیل اور کنجوس کہا جاتا ہے جنھوں نے اتنی کم چینی اور نارا دیا ہے، بھلا وہ کیسے برادری میں بانٹا جاسکے گا۔ مرد جب ساچق رکھ کر واپس چلے جاتے ہیں تب عورتیں ساری چیزوں پر ٹوٹ پڑتی ہیں کہ لڑکی کی قسمت سے کیسی کیسی چیزیں آتی ہیں۔ بہار میں سہاگ پوڑہ ایک خاص چیز ہوتا ہے جو رنگین کاغذوں، چمکیلی پنیوں اور شیشوں سے جڑا، سجا سجایا نیچے سے گول اور اوپر جا کر نوکیلا ہو جاتا ہے۔ اوپر کی نوک پہ کوئی مور یا ہرنی ناچتی رہتی ہے، دور سے یہ سہاگ پوڑہ تعزیہ سے ملتا جلتا نظر آتا ہے، اس میں دلہن کے سر کا مصالحہ وغیرہ ہوتا ہے۔ سہاگ پوڑہ جس چنگیر پر ہوتا ہے وہ بہت بڑا سا ہوتا ہے، اس پر ایک یا آدھ من باسمتی چاول، گڑ، کئی جوڑے چوڑیاں، سُرخ نارے، دلہن کے کچھ جوتے اور کاٹھ کی بہت سی کنگھیاں ہوتی ہیں۔ ایک مٹکی میں لٹ بور کا تیل ہوتا ہے اور ایک ٹوکرے میں پان آتا ہے۔ ساچق کے ساتھ ساتھ چاندی کے سنگار کی چیزیں بھی آتی ہیں اور پھول کے ہاروں کی ٹوکریاں بھی سجی ہوئی آتی ہیں۔ دلہن کے سہرے بھی دو ہرے ہوتے ہیں۔ ایک پھول اور موتی کا، دوسرا چاندی کے تاروں والا ہوتا ہے۔

ساچق آتے ہی سمدھنوں کی سواریاں دروازے پر لگ جاتی ہیں۔ سمدھنوں کے آنے سے پہلے ہی بڑی آب و تاب سے ان کے لیے قالین بچھائے جاتے اور مسند لگائے جاتے ہیں۔ لڑکی والیاں سمدھنوں کو گالیاں گا گا کر اتارتی ہیں۔ پھر تو مجلس تک آتے آتے بیچاری سمدھنوں پر کئی ٹوکری گالیاں برسنے لگتی ہیں۔ گھر کی عورتیں، مرائنیں اور پھر خادماؤں کی ٹولیاں ——— گھر کی عورتیں اور مرائنیں تو سمدھنوں سے نبٹتی رہتی ہیں اور خادمائیں، برات کے ساتھ آنے والی خادماؤں کی خاطر تواضع میں لگ جاتی ہیں۔ سمدھیوں کی طرح سمدھنوں کو بھی بڑے آدر مان سے گالیاں گا گا شربت پلایا جاتا ہے۔ لڑکی کے گھر کی عورتیں چھڑیوں پر پھولوں کے ہار لیے کھڑی رہتی ہیں سمدھنوں کو ہار پہنانے کے بعد گھر کی مہمان عورتوں کو ہار پہنایا جاتا ہے۔ پھولوں کے موسم میں جو شادیاں ہوتی ہیں ان میں بڑی بہار چھائی رہتی ہے، جدھر دیکھو بس پھول ہی پھول ———

سمدھنوں کے آنے کے بعد ہی دلہا کو شربت پلائی کے لیے گھر کے اندر بلایا جاتا ہے۔ گھر کی خادمائیں گاتی بجاتی دلہا کو لوٹنے جاتی ہیں۔ باجوں کی ٹولیاں آگے آگے ہوتی ہیں پھر روشنیوں کی قطاروں میں دلہا کی سجی ہوئی موٹر دھیرے دھیرے چلی آتی ہے، براتی اور

سراتیوں کا ایک ہجوم ساتھ ساتھ رہتا ہے موٹر کے دونوں طرف رنگا رنگ کی آتش بازیاں چھوٹتی چلی آتی ہیں۔ قوال قوالیاں گاتے چلے آتے ہیں اور دلہن کی طرف کے لوگ دلہا کی موٹر پر پھولوں کی بارش کرتے آتے ہیں۔ بینڈ باجے والے سب سے آگے ہوتے ہیں جب ان کا بینڈ ختم ہو جاتا ہے تب شہنائی بجانے والے ان کی جگہ پر جاتے ہیں۔ اس طرح سے آہستہ آہستہ برات دلہن کے اندر والے دروازے پر لگ جاتی ہے، باجے والے جب اپنا اپنا نیگ لے چکے ہوتے ہیں اور دلہا کی موٹر دلہن کے دروازے پر لگ جاتی ہے تب دلہن کے چھوٹے چھوٹے بھائی موٹر کا دروازہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دروازے پر ٹھٹھ کی ٹھٹھ عورتیں کھڑی دلہا کے آنے کے سلونے گیت گاتی رہتی ہیں۔ ایسے وقت میں جو گیت گائے جاتے ہیں ان میں دلہا کی ماں اور بہنوں کو بہت گالیاں دی جاتی ہیں جیسے :

"میں نے کہا تھا دولہے رنڈی کا طائفہ لانا ——

آماں نچاتا لایا، میرا نوبہار بندرا

آپا نچاتا لایا، میرا نوبہار بندرا

اُجیالی رین میں آیا میرا نوبہار بندرا

باجوں کا شور گیتوں کی لہکاریں اور قوالوں کی قوالیاں اپنے اپنے عروج پر ہوتی ہیں اور بچارے چھوٹے چھوٹے سالے اپنا نیگ یعنی دروازہ چھکائی لینے کو مچلتے رہتے ہیں، اس وقت براتی اور سراتیوں میں بڑے مزے مزے کی نوک جھونک ہوتی رہتی ہے اور موٹر کے اندر سے سہرے کی لڑیوں میں سے دلہا کا مسکراتا ہوا چہرہ دمکتا رہتا ہے۔ دلہن کے چھوٹے بھائی کافی بڑی رقم مانگتے ہیں اور برات والے کبھی ایک پیسے پر بات ختم کرنی چاہتے ہیں اور کبھی دھیلے پر —— اس پر سالوں کے ساتھ کبھی کبھی سرات کے لوگ بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ برات والے بغیر کوئی رقم دیے دلہا کو اندر بھیجنا چاہتے ہیں اور لڑکی کی طرف کے لوگ دلہا کو اندر جانے ہی نہیں دیتے ہیں۔ آخر بڑی مشکلوں سے سو، پچاس پر بات ختم ہو جاتی ہے، سالے دروازے پر سے ہٹتے ہیں اور غریب دلہا کو اندر آنے کا موقع ملتا ہے۔ دروازے پر دلہا کے گھر کی عورتیں اور لڑکی والیاں دلہا کو ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں، دلہا کی بہن اپنا آنچل بھائی کی پگڑی پر ڈال دیتی ہے، دلہا کے چلنے والے راستے پر سرخ بنات بچھا رہتا ہے، دلہا کے قدموں کے آگے مراثن بانس کے بنے ہوئے سرخ رنگ کے ایک سوپ پر گھی کے سات عدد چراغ جلائے، پانوں کے پتے لیے رہتی ہے جیسے جیسے دلہا قدم اٹھاتا ہے اس کے قدموں سے آگے پان کا ایک پتہ ڈال کر اس پر چراغ رکھ دیا جاتا ہے اور دلہا کو کہا جاتا ہے کہ جھک کر پان اور چراغ اٹھا اٹھا کر سوپ میں پھر واپس رکھتا چلا جائے اس کو نوبات چننے کی رسم کہتے ہیں۔ اسی طرح سے قدم قدم پر جھکتا ہوا دلہا بیچارہ شربت پلائی جانے والی ایک مخصوص چوکی پر لا کر کھڑا کر دیا جاتا ہے دلہن کی بڑی بہن یا بھابی چاندی کے گلاس میں شربت یا دودھ لا کر پلانا چاہتی ہے جس کو وہ بڑی مشکلوں سے بس ذرا سا چکھتا ہے۔ شربت پینے کے بعد دلہا کی اپنی ساس وہی چراغ اور پان والا سوپ کسی سے تھامے آتی ہے، ایک پان کو چراغ سے ذرا سا گرم کر کے پہلے دلہا کے دونوں گال ایک ایک بار سینکتی ہے۔ پھر ایک چراغ کو بجھا کر دلہا کے سر کے گرد صدقہ کر کے دور پھینک دیتی ہے اور دلہا کی بلائیں لے کر اس کے سر کو نیچا جھکا کر چلی آتی ہے اسی طرح سے باری باری سات رشتہ دار عورتیں جاتی ہیں اور گال سینک کر دلہا کا سر جھکا جھکا کر چلی آتی ہیں۔ اس کے بعد دلہا اس موٹر سے واپس چلا جاتا ہے اس کو شربت پلائی کی رسم کہتے ہیں۔

سمدھنوں اور دلہا کی شربت پلائی سے نپٹ کر سات سہاگنیں سہاگ پوڑہ میں سے دلہن کے لیے سر کا مصالحہ نکالتی ہیں جس میں

دلہن کے سر کا مصالحہ پیسا جاتا ہے اس کو بھی سات سہاگنیں ذرا ذرا سا ہاتھ لگا کر شگون دے دیتی ہیں۔ گھر کے اندر جب یہ سب ہوتا رہتا ہے اس وقت مردانے میں شامیانے کے تلے یا کمروں میں براتیوں کے لیے بڑے اہتمام سے کھانا لگایا جاتا ہے۔ سارے براتیوں کو بڑے احترام سے موڑھوں پر بٹھا کر کھانے کے لیے گھر بلاتے ہیں۔ عام طور پر ایک ہی دفعہ ڈیڑھ دو سو پلیٹیں لگائی جاتی ہیں تاکہ براتیوں کے ساتھ مہمان سرانیوں کو بھی اکٹھے ہی کھانا کھلایا جا سکے۔ سارے براتیوں اور لڑکی کے گھر آئے ہوئے مہمانوں کو بڑی عزت کے ساتھ کھانا کھلاتے ہیں۔ اسی طرح سے گھر کے اندر سمدھنوں کے ساتھ مہمان آئی ہوئی عورتوں کو بھی بڑے اہتمام سے کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اس کھانے اور کھلانے میں بہت سا وقت صرف ہوتا ہے۔ پھر بھی گھر کی کچھ عورتیں رات گئے تک اس کھلانے میں اُلجھی رہتی ہیں۔

کھانے کے بعد دلہن کو مجلس میں نکال کر سنوارتے ہیں دلہن بچاری اسی طرح سے سر جھکائے آنکھیں بند کیے مراثنوں کے رحم و کرم پر رہتی ہے، اس وقت تیل، کنگھی ہر چیز سسرال سے آئی ہوئی استعمال کی جاتی ہے۔ بیچ سے مانگ نکال کر داہنی طرف گیارہ پتلی پتلی چوٹیاں کی جاتی ہیں اور بائیں طرف دس ہوتی ہیں کل اکیس چوٹیاں رہنی چاہییں یہ اکیس چوٹیاں اکیس ٹونے کے ساتھ لال ناروں سے گوندھی جاتی ہیں جن کو سر کے پیچھے ڈھائی پان کے پتے رکھ کر جال کی طرح جن کر لال ناروں سے گوندھتے ہیں۔ یہ کا مصالحہ لگا لگا کر بال گوندھا جاتا ہے۔ بال گوندھنے کے بعد دلہن کو کمرے کے اندر لے جا کر سسرال سے آئے ہوئے شہانے کپڑے اور زیور پہناتے ہیں اور دلہن کا سنگار کیا جاتا ہے۔ اس وقت لڑکی کے پاس کمرے میں بس اس کی سہیلیاں ہی رہتی ہیں۔ بہار میں دلہن کے لیے شادی کا جو لباس آتا ہے وہ خاص قسم کا ہوتا ہے۔ سبز ساٹن کا چوڑے پائنچے کا پاجامہ، سُرخ جارجٹ یا ریشمی کا گھٹنوں سے نیچا ڈھیلا ڈھالا کرتا جس کے اندر ایک اور سُرخ ساٹن یا ململ کا کُرتا ہوتا ہے۔ سُرخ جارجٹ کا لمبا چوڑا سا ایک دوپٹہ ہوتا ہے جس کے اوپر ایک اور سُرخ کریپ کا بھی دوپٹہ رہتا ہے۔ یہ سارے کپڑے چاندی کے ورق اور چمکی سے بڑے خوبصورت چھپے ہوئے رہتے ہیں۔ بس کہیں کہیں پر سے کپڑے کا ذرا ذرا رنگ جھلکتا ہوا نظر آ جاتا ہے۔ دلہن کو پھولوں اور خوشبوؤں سے بسا دیتے ہیں۔ لڑکی بن سنور کر جب پوری طرح سے دلہن بن جاتی ہے تب بھائی یا بہنوئی آ کر سورۂ اخلاص پڑھ کر پہلے پھولوں کا سہرا باندھ دیتا ہے اس کے اوپر سے پھر چاندی کی لڑیوں والا سہرا باندھ دیتے ہیں۔ اب دوبارہ دولہا کو باہر سے بلایا جاتا ہے۔ اس دفعہ اس کے آنے میں وہ شان و تمکنت نہیں رہتی پھر بھی اپنے دوستوں اور کافی رشتہ داروں کے ساتھ گاتی بجاتی ہوئی خادماؤں کے ساتھ آتا ہے۔ شامیانے کے تلے چوکی کے فرش کے اوپر ایک خوبصورت سی کرسی پہلے سے بچھا کر رکھی جاتی ہے اور اس کے ٹھیک سامنے دلہن کے لیے مسہری بچھی رہتی ہے جس پر سُرخ چھپا ہوا بستر اور رنگ برنگے ہوتے تکیے بڑے خوبصورت نظر آتے ہیں۔ دولہا کو اسی کرسی پر بٹھایا جاتا ہے اور دلہن کی چھوٹی سالیاں اکیس جگمگاتے ہوئے پانوں کی گلوریاں اس کو کھلانے پر تلی ہوئی رہتی ہیں۔ یہ اکیس پان کے بیڑے اکیس ٹونے گا گا کر لگائے جاتے ہیں اور ان ٹونوں کا مقصد وہی ایک ہوتا ہے کہ دولہا اپنی دلہن کا زندگی بھر غلام بنا رہے ——— اس وقت دولہا اور دلہن دونوں گھروں کی دو ٹولیاں اپنی اپنی طرف کے گیت گائے جاتی ہیں۔ یہ گانے عام طور پر سوال جواب کی طرح ہوتے ہیں۔ ایک طرف سے لڑکے اور اس کے گھر والوں کی تعریف ہوتی رہتی ہے اور دوسری طرف سے لڑکی اور اس کے گھر والوں کو اچھا کہا جاتا ہے۔ دولہا بچارے کو ایک خلقت گھیرے کھڑی رہتی ہے اور گانے تو ایسے عروج پر ہوتے ہیں کہ بس کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں۔ اب بنی سنوری دلہن کو اس کی کوئی رشتہ دار عورت اپنی گود میں اٹھا کر لاتی ہے، سہرے کی جھولتی ہوئی لڑیاں اور ناک میں سونے کا بڑا سا نتھ بچاری دلہن کو بڑا پریشان کیے رہتا ہے۔ دلہن کو گود میں لانے والی عورت دلہن کو دولہا کے قریب لے جا کر دلہن کے داہنے پیر سے دولہا کو ایک ہلکی سی ٹھوکر لگا دیتی ہے، پھر سامنے کی مسہری پر دلہن

کو بٹھا دیا جاتا ہے۔ دلہن کے بیٹھتے ہی دلہا اور دلہن کے بیچ میں اوٹ کے بڑے لمبے چوڑے سُرخ چھپے ہوئے پردے کو دونوں طرف سے عورتیں گھیر کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پردے کے پیچھے مسہری کے اوپر گھر کی خاص خاص عورتیں اور ایک مراثن بیٹھی رہتی ہے۔ وہ مراثن دلہن کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے ملا کر دونوں انگوٹھوں کے سہارے دلہن کی پیشانی کے کناروں پر رکھ دیتی ہے اور سہرے کی لڑیاں دلہن کی پیشانی پر رکھی ہوئی انگلیوں سے کلائیوں تک اس طرح سے بکھیر دی جاتی ہیں کہ دلہن کے چہرے کی ہلکی ہلکی جھلکیاں دلہا کو نظر آتی رہیں پھر ایک مراثن اور ایک گھر کی عورت مل کر پردے کے پیچھے سے دلہن کو کھڑا کر دیتی ہیں۔ اوٹ کا پردہ ذرا نیچا کر دیا جاتا ہے۔ جلوہ دکھانے کے گیت مراثنیں گانے لگتی ہیں اور مراثن مدہوش دلہن کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں آہستہ آہستہ ایسے جھومانے لگتی ہے جیسے مخمور دلہن نشے میں چُور ہو رہی ہو ——— جس وقت پردے کے پیچھے سے دلہن کو کھڑا کر کے جلوہ دکھایا جاتا ہے اس وقت دلہا اپنے ریشمی رومال میں باندھی چاول ذرا سا رکھ کر دلہن کے سر کی طرف پھینکتا ہے۔ جلوہ کے وقت دلہا کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ایک ٹک سے دلہن کی طرف دیکھتا ہے پہلا جلوہ دکھا کر دلہن کو دو منٹ کے لیے پھر بٹھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد پھر دوسرا جلوہ شروع ہوتا ہے، ہر بار دلہا اپنے ریشمی رومال سے چاول پھینکتا ہے، اسی طرح سے سات بار جلوہ دکھایا جاتا ہے۔ شادی میں سب سے خوبصورت یہی رسم ہوتی ہے۔ اگر قسمت سے دلہن کافی خوبصورت ہوئی تو یہ منظر اتنا حسین ہوتا ہے کہ بے اختیار طور کا جلوہ یاد آ جاتا ہے اور اگر معمولی صورت کی دلہن ہوئی جب بھی میک اپ وغیرہ سے جلوہ دکھائی ہوئی بڑی اچھی نظر آتی ہے دلہا بچارہ اس رومان انگیز منظر پر مٹا جاتا ہے۔ سارے اکیس لڈّنے ایک طرف ہوتے ہیں اور یہ "طور کا جلوہ" اکیلا ایک طرف۔ ساتویں بار جلوہ دکھا کر اوٹ کے پردے کو ہٹا دیا جاتا ہے اور دلہا کو دلہن کے قریب مسہری پر بٹھا دیتے ہیں۔ پھر سورۂ اخلاص پڑھ کر آرسی مصحف کی رسم ادا کی جاتی ہے اس کے بعد دلہا کو کہا جاتا ہے کہ اپنی انگوٹھی سے دلہن کی مانگ میں تین دفعہ صندل بھرے۔ جب دلہن کی مانگ میں صندل بھرا جاتا ہے تب دلہن کے سہرے کی لڑیوں کو بڑی خوبصورتی سے تاج کی طرح بنا کر سب سے پہلے دلہن کی صورت دلہا کو دکھائی جاتی ہے، رونمائی میں دلہا اپنی مرضی سے کوئی تحفہ دلہن کو دیتا ہے، اس کے بعد ساری مجلس کو دلہن کی صورت دکھائی جاتی ہے۔ دلہن کی صورت دکھانے سے پہلے دلہن کا داہنا ہاتھ سلام کے لیے ایک عورت اٹھاتی ہے پھر رونمائی کی جاتی ہے۔ جب سارے لوگ دلہن کو دیکھ لیتے ہیں تب سہرے کی لڑیوں کو گرا دیا جاتا ہے، سُرخ جارجٹ کا دوپٹہ گردن تک ہوتا ہے سر اور چہرے پر مہین کریپ کا دوپٹہ دلہن کے حُسن کو حسین تر بنا دیتا ہے۔ لمبے گھونگھٹ کے اندر سے نظر آتی ہوئی دلہن کی جھلک بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ اب دلہا کے آگے سلامی پڑنے کے لیے رومال بچھا دیتے ہیں اور لڑکی کے گھر والے اپنی حیثیتوں کے مطابق سلامی دیتے چلے جاتے ہیں۔ جن کو تحفہ تحائف دینا ہوتا ہے وہ بھی اسی وقت دے دیتے ہیں۔ جب ان سارے بکھیڑوں سے نجات مل جاتی ہے تب دلہن کی چھوٹی بہنیں (بہار میں دلہن سے چھوٹی بہنوں ہی کو سالیاں کہا جاتا ہے، بڑی بہنیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور ان کو "ڈیڑھ سس" کہا جاتا ہے بڑی بہنیں چھوٹی بہن کے شوہر کے سامنے بڑے وقار سے رہتی ہے) اور دلہن کی بھابیاں جو دلہا کی سرہج کہی جاتی ہیں سخت آٹے کے بنے ہوئے گیند لے کر آتی ہیں اور اسی دلہا والی کرسی پر بیٹھ کر اور اس سے الگ کر دلہا کو تاک تاک کر گیند مارتی جاتی ہیں۔ دلہا بچارہ اکیلا اور سالیاں سرہج اتنی، پھر بھی پلّہ برابر ہی رہتا ہے۔ اس کے بعد مراثن ایک لال رنگ کا رومال دلہا کو دے کر کہتی ہے کہ دلہن کے دوپٹے کے کونے سے باندھو، آخری گرہ جب بندھتی ہے تو دلہا اور دلہن اس کو تھام لیتے ہیں اور دلہا سے یہ کہلایا جاتا ہے کہ "جنم جنم کا گٹھ باندھ رہے ہیں" پھر کوئی رشتہ دار عورت دلہن کو گود میں لے لیتی ہے اور دلہا دلہن کی چھوٹی انگلی پکڑے حجلۂ عروسی میں جانے کے لیے جوتا پہننا چاہتا ہے تو جوتے غائب ہوتے ہیں، کسی سالی نے جوتا غائب

کر دیا جاتا ہے اور پھر اپنی مانگی ہوئی رقم پر وہ جوتا واپس کرتی ہے۔ دلہا دلہن کو کمرے میں پہنچا دیا جاتا ہے اور کمرے کا دروازہ عورتیں باہر سے کھینچ کر بڑے رنگین قسم کے رومانی پرور گیت گانے لگتی ہیں۔

تھوڑی دیر میں صبح ہو جاتی ہے۔ گھر کے سارے لوگ تھکے تھکے سے نڈھال نظر آتے ہیں۔ کل دن بھر کی ساری رونقیں پھیکی پھیکی سی دکھائی دیتی ہیں۔ شہنائی باجہ رخصتی کا غمگین دھن بجاتا رہتا ہے اور رات بھر کی ساری خوشی آنکھوں میں ڈبڈباتے ہوئے آنسوؤں کی صورت میں بدل جاتی ہے۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر رخصتی کی دھوم مچ جاتی ہے۔ مراثنیں بابل اور بدائی کے گیت ایسے غمگین سُروں میں گاتی رہتی ہیں کہ کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ جہیز پیک ہو ہو کر جانے لگتا ہے۔ گھر اُجاڑ اُجاڑ سا نظر آنے لگتا ہے۔ دلہن کے آنسوؤں اور سسکیوں سے گھر کے درو دیوار لرزتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

رخصتی کے وقت دلہن کو دلہا کے ساتھ شامیانے تلے فرش پر بٹھا دیا جاتا ہے اور سارے رشتہ دار مردوں کو دلہن کا رخصتی سلام لینے کو بلایا جاتا ہے۔ سارے ہی رشتہ دار دلہن کے پاس شامیانے کے نیچے جمع ہو جاتے ہیں۔ گھر کی کوئی عورت سر جھکائے سسکتی ہوئی دلہن کا ہاتھ اٹھا کر پہلے سارے لوگوں کو سلام کراتی ہے پھر آنسو بہاتی غمگین دلہن کی صورت دکھاتی ہے۔ جس لڑکی نے اس گھر میں جنم لے کر اپنا معصوم بچپنا اپنے عزیزوں کے ساتھ گزارا تھا، جس کی جوانی اسی گھر میں جڑ پکڑی تھی جو اس گھر کی رونق اور جان تھی آج وہ ایک اجنبی کے ساتھ ایک غیر گھرانے اور پردیس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پیاروں سے بچھڑ کر چلی جا رہی ہے۔ اب یہ گھر اس کے لیے پرایا بن رہا ہے، دلہن سسکتی جاتی ہے اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے ٹپکتے جاتے ہیں ——— سارے رشتہ دار مردوں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں، بھائیوں کی توجہیں بے قرار ہو جاتی ہیں۔ سارے رشتہ دار مرد دلہن کی گود میں اپنی حیثیت کے مطابق روپے اور دعائیں دیتے ہوئے افسردہ سے چلے جاتے ہیں۔ ——

ان کے جانے کے بعد گھر کی عورتیں آ کر لڑکی کی گود میں روپے دیتی ہیں، اس کو گودی کہا جاتا ہے اور یہ روپے لڑکی کی نندوں کے ہو جاتے ہیں۔

لڑکی کی رخصتی کا وقت بہت ہی غمناک ہوتا ہے، روتی ہوئی دلہن کی بے قراریوں کو دیکھ کر گھر کی ساری عورتیں بے اختیار رونے لگتی ہیں۔ سسرال والی عورتوں کے بھی آنسو بہتے جاتے ہیں۔ ساری عورتوں کا اپنا غم تازہ ہو جاتا ہے اور کنواری لڑکیاں خوف زدہ سی رو رو کر اپنی آنکھوں کو سرخ کر لیتی ہیں۔ برات والے لوگ دلہن کو رخصت کرنے کی دھوم مچانے لگتے ہیں اور گھر کے لوگ ایک ایک لمحہ کو قیمتی سمجھتے ہوئے دلہن کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔ مراثنیں بڑی افسردہ آواز میں بابل گاتی ہیں:

"بھیا کو دیہو آبا، اونچی رے اٹریا ———!
ہم کو بیاہیو بدیس، سن بابل مورے ۔"

آنکھوں سے آنسوؤں کے تار بہتے جاتے ہیں اور سسکیاں ہچکیوں میں بدل جاتی ہیں۔ کوئی عورت روتی سسکتی ہوئی دلہن کو گود میں اٹھا لیتی ہے اور دولہا کے قریب لا کھڑا کرتی ہے۔ رشتہ داروں کے ہجوم میں مجرم بنا ہوا دولہا دلہن کی چھوٹی انگلی کو پکڑے ہوئے آہستہ آہستہ

دروازے سے باہر نکلتا ہے۔ سجی سجائی موٹر میں دلہن کو بٹھا دیا جاتا ہے، دلہن کے گھر سے ساتھ جانے والی خادمائیں بھی اسی موٹر میں بیٹھتی ہیں اور جو سمدھنیں دلہن کے ساتھ جانا پسند کرتی ہیں وہ بھی اسی موٹر میں بیٹھ جاتی ہیں ——— شہنائی اسی افسردہ دھن میں بجتی رہتی ہے۔ گھر کی عورتیں اسٹارٹ ہوتی ہوئی موٹر پر اپنی اپنی ہتھیلیوں سے باسمتی چاول پھینکتی جاتی ہیں اور روتی ہوئی سسکتی آوازیں گاتی جاتی ہیں ———

"جگ جگ جیے میرا بھیا، بیرن بھیا جی!
بھیا! اماں کا سنگ مت چھوڑیو کہ ہم تو بڑی دور سے جی!"

اور دلہن کی گاڑی آہستہ آہستہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

———————

بڑے ادیب

احمد ندیم قاسمی کی فکرِ شعری

سراج لکھنوی

ندیم صاحب سے غائبانہ طور پر میں ایک عرصے سے واقف ہوں، اس لیے کہ نام و نمود والے شاعر اور ادیب مجھ سے نہیں چھپتے مگر ان کی حسینِ فکر کے خد و خال سے مطالعہ کا موقع مجھے نہ ملا۔ ادھر چار پانچ سال کے عرصے میں صاحب سلامتوں کے تبادلوں کا عمل ضرور آیا مگر بات اس سے آگے بڑھ نہ سکی۔ ۵۶ء میں میرے مکرم دوست سید ناصر حسین صاحب نے پاکستان سے واپسی پر "شعلۂ گل" (ندیم کے مجموعۂ کلام) کی ایک کاپی مجھے دیکھنے کے واسطے مرحمت فرمائی۔ اس سال بھی پاکستان سے واپس آ کر ناصر صاحب نے حضرت ندیم کی مرسلہ بارہ غزلیں مجھے عنایت فرمائیں۔ قبل اس کے کہ اس تازہ کلام پر اپنے ذوق کی تکمیل میں کچھ اظہار خیال کروں، بطور تمہید کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

شعلۂ گل میں جناب عبدالمجید صاحب سالک مرحوم نے "تعارف" کے عنوان سے ندیم اور ان کی شاعری پر اپنی قیمتی رائے سپردِ قلم فرما کر شاعری کی تاریخ کے اس ورق کو روشن کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ندیم کا اسلوبِ اظہار دلبرانہ اور فطری ہے۔ ندیم کا مقصدِ شاعری یہ ہے کہ وہ انسان کی عظمت کے قائل اور معترف ہیں اور کائنات کو انسان کے معجزات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور ظلم و استحصال کے دشمن ہیں۔ ندیم صاحب نے خود اپنی زبان سے انسان کو مسلسل ارتقا اور تسلسلِ تعمیر کے ناموں سے یاد کیا ہے اور یہی ان کی شاعری کا نصب العین ہے۔

ممتاز صاحب نے بھی "ایک نیا منصور" کے عنوان سے ایک بلند پایہ تبصرہ فرمایا ہے جس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

میں نے ۵۶ء میں جب "شعلۂ گل" کو شروع سے آخر تک پڑھا تو مجھے اپنی پسند کا ایک مفکر شاعر میرے ذوقِ سلیم کی تسکین کرتا ہوا نظر آیا۔ چنانچہ جس روپ میں ندیم کو میں نے دیکھا ہے اس کا مختصر خاکہ دیانت داری کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ ندیم کے کلام میں مجھے تازگی، نئے گوشے اور انفرادیت نظر آئی۔ ندیم نے اپنی شاعری کی جولانگاہ کو صرف اپنے استوار قدموں سے آباد کرنے کی سعی کامران کی ہے۔ ندیم نے فطرت سے اعلیٰ دماغ پایا ہے اور رعنائیِ تخیل کے ساتھ وہ ایک بلند فکر کے علمبردار ہیں۔ ان کا مطالعہ زبردست ہے اور الفاظ کا بھرا پرا قیمتی خزانہ ان کے قبضے میں ہے جس کو صرف کرنے میں انھیں کبھی بے مائگی

محسوس نہیں ہوتی - اُن کی تخیل زرخیز، اندازِ بیان دلکش، اور تکمیلِ شعر قابلِ داد ہے - وہ اپنے مافی الضمیر کو کامیابی کے ساتھ بڑی خوب صورتی سے ظاہر کر دیتے ہیں - وہ تڑپتے بھی ہیں اور تڑپاتے بھی ہیں - وہ دھواں بھی ہیں اور شعلہ بھی - ندیم میں خود اعتمادی، بے باکی، دلیری اور یقین ہے اور اس طرح اُن کا کلام اُن کے کردار کا آئینہ بھی ہے - اُن کی ہر شعری تخلیق نہ بادہ زنسے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے -

نظم میں مقصدِ شعر بالشرح سامنے آجاتا ہے اس لیے کہ نظم کا موضوع خود مقصدِ شعر کی ضمانت اور وضاحت ہوتا ہے مگر غزل کا ہر شعر مکمل اور ایک علیحدہ مقصد کا حامل ہوتا ہے - غزل کا دامن اب بہت وسیع ہے - ہر چیز اس میں سما سکتی ہے. یہی وجہ ہے کہ غزل کے بعض شعروں میں بھی ندیم کے محبوب مقصد کا وضاحتی سیلابِ نور غزل کے رنگین پردوں پر بھی پوری قوت کے ساتھ کبھی کبھی اپنی روشنی ڈالتا رہتا ہے ورنہ عام طور سے وہ غزل کو بہت رچ کر اور اس کی نزاکتوں اور لطافتوں کا خیال رکھ کر کہتے ہیں - میرے خیال میں وہ غزل میں بھی نظم کی طرح بہت کامیاب ہیں -

اب میں ندیم کی بارہ غزلوں میں سے چند اشعار پر اظہارِ خیال کی جرأت کرتا ہوں -

ذیل کا شعر، خالص غزل کا شعر ہے - اظہارِ مطلب کے لیے ندیم نے نہایت نرم، ملائم اور سہل الفاظ کا سلیقے کے ساتھ استعمال کیا ہے - شعر میں عطف و اضافت سے بھی کام نہیں لیا - شعر میں لفظ "موڑ" کے استعمال نے جدت پیدا کر دی - خیال کے راستے سیدھے اور ہموار بھی ہوتے ہیں اور پیچ در پیچ بھی - خیال کی گتھیاں رات کی نیند میں آنکھوں آنکھوں سے اُڑا دیتی ہیں - زلفِ شکن در شکن نے خیال کے راستوں میں موڑ پیدا کیے اس لیے خیالوں کے ہر موڑ پر گیسو کی شکن کا یاد آنا یقینی ہے لہذا بمقتضائے عقیدۂ عشق، جس نے یا جس چیز نے الجھن میں مبتلا کیا وہی مشکل کشا بھی ہو سکتی ہے ؎

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

اہلِ دل اور شائستۂ بندگی اپنا کعبہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں - حرم و دیر کا فرق تو صرف نقطۂ نظر کے اختلاف کا نام ہے دیدہ وروں کو دیر میں بھی حرم نظر آ سکتا ہے - ندیم کا حسنِ پرستش، اُن کی رعنائی تخیل اور فکر کی صنم تراشی کس قدر حسین ہے ؎

فقط اک ذوقِ پرستش کی نقوش آرائی
دیر اگر دیر نہ ہوتے تو حرم ہو جاتے

دار و رسن اور طورِ منصور کی داستانیں پرانی ہو چکیں مگر ندیم کے اس شعر کا دوسرا مصرع اردو شاعری میں اضافہ ہے ؎

ہم اگر دار پہ کھینچے بھی تو اے صاحبِ دار
اپنی نا کردہ گناہی کی قسم ہو جاتے

ندیم کا دل ایک آئینہ ہے انسان کی عظمتوں کا - انسان کے عزائم اور اس کی فکرِ رسا نے جو شمعیں وقتاً فوقتاً روشن کر دی ہیں اُن کی تابش اور تنویر ہمیشہ نظر آئے گی - تعجب کی بات نہیں اگر ندیم بہت سے آفتاب اپنے تمام جاہ و جلال کے ساتھ بیک وقت درخشاں اور تاباں دیکھتے ہیں انسان کے تسخیری سلسلوں کی ایک مکمل فہرست ندیم کے سامنے ہے - دھوپ کے

ساتھ سایوں کا ہونا بھی یقینی ہے ۔ ایسی صورت میں اپنے ہی پیکر کے گھنے سایوں کے نظر آنے کا بھی قوی امکان ہے ۔ یہ آفتاب اور سائے دراصل استعارے ہیں عظیم انسانوں سے جن کے کارنامے جبینِ وقت پر ہمیشہ اُبھرتے ہوئے دکھائی دیں گے ۔ ؎

کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں
ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں

تباہ و برباد ہو جانے کے بعد بھی اپنی صلاحیتوں اور کارناموں کو یاد دلاتے ہوئے یہ تنبیہہ کتنی مدلل اور حقیقی ہے ؎

اے سحر آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اُڑا
ہم نے جل جل کے ترے راستے چمکائے ہیں

اس شعر میں "کہا" کی جگہ پر "پکارا" کو ندیم نے ترجیح دی ہے ۔ "کہا" میں صرف ایک سادگی بے مایہ کے سوا اور کچھ نہیں مگر "پکارا" میں ایک پبلیسٹی اور بہ بانگ دہل شیخ کے عقیدوں اور اصطلاحوں کا اعلان ہے جس نے دامنِ تر کی عظمت کو زیادہ وقیع کر دیا ۔

شیخ نے نامہ اعمال پکارا جن کو
ہم گنہگار اُسے دامنِ تر کہتے ہیں

گنہگاروں کے کردار کی مضبوطی اور بلندی دیکھنے اور سمجھنے کی چیز ہے ۔ یہ بلند خیالی اور بلند مرتبہ مدعیانِ پارسائی کو کہاں نصیب ۔ اندھیرے میں بھی روشنی دیکھ لینے کے عادی تو صرف گنہگارانِ محبت ہی ہو سکتے ہیں ؎

طاق پر جس کے کبھی ایک دیا تک نہ جلا
ہم تو اس گھر کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں

جن کی نظروں میں دُنیا اندھیر ہو اُنھیں سحر کے وجود سے یک قلم انکار کرنے ہی میں آسانی ہے ۔ رات کا شدتِ ظلمت سے جل اُٹھنا اور وقفۂ ماتم کو سحر کے نام سے تعبیر کرنا بالکل نئی تخیل ہے ۔ یہی بہت ہے کہ ایسے لوگوں نے رات کے جل اُٹھنے میں جو اپنے نصیب کی روشنی دیکھی اُسی کو سحر فرض کر لیا اور مدتِ سحر کو وقفۂ ماتم کے نام سے یاد کیا ؎

رات جل اُٹھتی ہے جب شدتِ ظلمت سے ندیم
لوگ اس وقفۂ ماتم کو سحر کہتے ہیں

مطلع کے پہلے مصرع میں پرانی بات دہرائی گئی ہے مگر باوقار شکست نے احساسِ شکست اور اُس کے وزن کو ہلکا کر دیا اور مصرع میں ایک خاص ندرت پیدا کر دی ؎

چلے بہشت سے ہم نکہتِ بہار کے ساتھ
شکست کھائی ہے لیکن بڑے وقار کے ساتھ

لیکن شکست کھانے کے بعد "انسان ہی کا بول بالا رہا" کی ایک جامع تفسیر شاعر نے ذیل کے شعر میں پیش کر دی جو حقیقت سے لبریز ہے ؎

اب اِس سے بڑھ کے ہو کیا رابطۂ کائنات و حیات
فضائیں گونجی ہیں انسان کی پکار کے ساتھ

رجحان سے ہماری تنقید کو فائدہ کم، نقصان زیادہ پہنچا۔ جو لوگ مغربی تنقید سے واقفیت رکھتے ہیں اُنھیں اس بات کا اندازہ ہے کہ ہماری جدید اُردو تنقید کس قدر گنجلک اور بے معنی ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی نئی تصنیف "جدید اُردو شاعری" اسی قسم کی تنقید کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے بیان کے مطابق ہماری جدید اُردو شاعری مغرب کی علمی اور ادبی تحریکات کی رہینِ منت ہے اِنھی کے ارشاد کے مطابق ہمارے بہت سے شعرا ان اثرات کا تخلیقی استعمال نہیں کر سکے اس لیے اُن کی شاعری اس لائق نہیں کہ اُس پر کسی قسم کی بحث کی جائے ——— اِسی معیار کے پیشِ نظر ہمیں اُن نقادوں کی بھی تحریروں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھنا چاہیے جو خود مغربی تنقید کے فن اور اُصولوں سے صحیح معنوں میں استفادہ نہ کر سکے ہوں۔ جدید اُردو شاعری پر بھی وہی نقاد لکھ سکتا ہے جسے مغربی تنقید کی پوری پوری سمجھ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اِس کتاب میں یہ دعوےٰ کیا ہے کہ اُنھیں جدید مغربی تنقید کے تمام مدرسہ ہائے فکر پر مکمل عبور حاصل ہے ماشاء اللہ، مگر کتاب کے مطالعہ سے تو صرف اُن کی سطحی معلومات کا پتہ چلتا ہے۔

ادبی تنقید دیگر اصنافِ ادب کی طرح ایک لسانی فن ہے۔ جدید مغربی تنقید نے پچھلے پچیس تیس برس سے ایک نئی زبان اور لہجے کی تخلیق کی۔ اس زبان کی تخلیق میں جدید سائنس بالخصوص علم تجزیۂ معانیات کا بڑا ہاتھ ہے۔ آج تنقید کی زبان نہ صرف ایجاز و اختصار بلکہ سادگی، وضاحت اور صحتِ معنی جیسے اوصاف سے متصف ہے۔ تنقید کی یہ جدید زبان بیک وقت ایک سائنسی اور فنی پیرایۂ اظہار ہے۔ جدید مغربی نقاد آج فقط ادب پاروں کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ وہ کسی قسم کی تقریظ یا تنقیص نہیں لکھتا۔ اُس کے اِس تجزیے میں کسی قسم کی گنجلک اور ابہام بھی نہیں ہوتا۔ نہ وہ فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتا ہے اور نہ وہ پند و نصائح کے دفتر کھولتا ہے۔ جدید نقاد زبان کے روایتی حسن اور صنائع و بدائع سے اُسی حد تک کام لیتا ہے جس حد تک کہ وہ ایجاز و اختصارِ اظہار اور صحتِ مطالب کے حسن کو اُجاگر کر سکتے ہوں ——— جدید اُردو شاعری کی زبان ہمارے تذکروں کی زبان ہے۔ کہیں کہیں جدید اصطلاحات کا استعمال ضرور ہوا ہے مگر تمام تر اندازِ بیان اور اس کا لہجہ جذباتی اور خطیبانہ ہے۔ اس کے علاوہ روزمرہ کا استعمال اس زبان کو اور بھی غیر علمی بنا دیتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی زبان کو ہم تنقید کی زبان نہیں کہہ سکتے۔ وہ اکثر جگہ یا تو خطابت یا جذباتیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ طولِ بیان اُن کا خاصہ ہے ایک ہی بات کو وہ بار بار دھراتے چلے جاتے ہیں۔ یکے بعد دیگرے جملے پہ جملہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اُن کے جملوں میں معنوی ربط مفقود ہوتا ہے۔ لہٰذا اُن کی آرا اور دلائل میں منطقی رشتہ سرے سے غائب ہوتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

> "یہی خصوصیات ہمیں اپنے یہاں کے زوال پسند شاعروں میں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ سب کے سب بلا کے ذہین ہیں۔ لیکن اُن کا نقطۂ نظر صحت مند اور صحت بخش نہیں۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کو فن اور تکنیک کی جدتوں سے روشناس کیا ہے۔ چنانچہ جدید سے جدید تر بننے کی خواہش ہی نے اُن کے فن میں دُور از قیاس اشاریت اور ابہام کی خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے اکثر کی شاعری بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان شاعروں نے اچھی نظمیں نہیں لکھی ہیں۔

> ایسا نہیں ہے۔ میرا جی نے بعض بہت ہی اچھی رومانی نظموں کی تخلیق کی ہے۔ لیکن اُن کی اکثر نظمیں مبہم ہیں۔ اختر الایمان۔ مختار صدیقی اور ضیا جالندھری کی بعض نظمیں بھی حسین ہیں۔ لیکن اب مجموعی اعتبار سے اُن کی شاعری ابہام اور دُور از قیاس راستوں پر چل رہی ہے۔ موجودہ نسل کے ایک خاص طبقے پر ان لوگوں کے اثرات خاصے گہرے ہیں اور ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ یہ رجحان بھی بعض مخصوص اُفتادِ طبع کے افراد میں عام ہوتا جا رہا ہے۔" (صفحہ ۹۷)

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جدید اُردو شاعری مقصدی تنقید ہے چونکہ یہ جدید شاعری کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب ترقی پسند تحریک سے بہت متاثر ہوئے اور اُس وقت سے آج تک اُن کے نزدیک ہر صنفِ سخن کو اسی معیار ہی سے جانچنا چاہیئے۔ وہ اپنی تنقید میں بارہا افادہ اور پراپیگنڈا کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مطالعۂ شعر سماجی ترقی کا دوسرا نام ہے۔ مزید برآں وہ رومانیت اور شعر میں حقیقت سے اُس کے امتزاج کو جدید شاعری کی سب سے بڑی قدر قرار دیتے ہیں ——— بے شک فیض کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ کرشن چندر کی کہانیوں کی مقبولیت کی وجوہ ہیں کہ دونوں بڑے فنکار ہیں ——— مگر ان کے ہاں جو کچھ ہے۔ وہ ضروری نہیں کہ سارے ادب کی پرکھ کے لیے وہی لازمی خصوصیات ہوں ——— یہ بات تو اپنی جگہ پر رہی۔ ہیں اسے ترقی پسند تنقید کہنے کی ذمّے داری بھی نہیں لے سکتا۔ اس تنقید کی ہمارے ہاں بہترین مثال روشنائی ہے۔ جو اپنے مواد۔ تجزیے۔ زبان اور اسلوب کی بنا پر زندہ و جاوید رہیگی ہو سکتا ہے ہمیں سجاد ظہیر کے نظریۂ شعر سے اختلاف ہو مگر ہمیں اس بات کا اقبال کرنا پڑتا ہے کہ اُس کی تنقید جدید مغربی تنقید کی سادگی و پُرکاری کے اوصاف سے متصف ہے۔ اس لحاظ سے روشنائی قابلِ قدر ادبی تنقید ہے۔

مگر جدید اُردو شاعری کے ترقی پسند نقطۂ نظر میں بھی یک جہتی نہیں ملتی۔ نہ ہی ڈاکٹر صاحب کوئی ایسا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں جو تمام جدید نقطہ ہائے نظر کا امتزاج ہو۔ دراصل وہ ایک ایسے نقطۂ نظر کا ساتھ دیتے ہیں جسے عام فہم الفاظ میں دنیاوی نقطۂ نظر کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ غیر ادبی اور عجیب و غریب معیار سامنے رکھتے ہیں یعنی شعر کی بجائے شعر کہنے والے کا خیال زیادہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک خاص قسم کی شاعری سے شغف ہے (جس میں رومانیت اور حقیقت کا امتزاج ہو یا وہ سماج کو آگے بڑھاتی ہو)۔ جہاں بھی اس قسم کے تجربات کا اعادہ ہوگا یا اس قسم کا لہجہ اور اسلوب ملے گا وہ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر ان کا رُخ بچا کر چلنے کا نقطہ نظر ہمارے لیے عجیب و غریب اُلجھن پیدا کر دیتا ہے۔ بہت سے مقامات پہ ہم یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ بالآخر نقاد کہنا کیا چاہتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۸۵ پہ جہاں وہ میرا جی کا ذکر کرتے ہیں:

> "لیکن آخر الذکر شعرا کی اکثر نظمیں ہمیں مبہم معلوم ہوتی ہیں جس میں میرا جی سب سے زیادہ آگے ہے۔ لیکن میرا جی کی شاعری کو اتنی آسانی سے صرف یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی شاعری بے معنی ہے۔ اور وہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بناتا ہے۔ یا بہتر ہے کہ وہ ایسی شاعری سے نثر لکھا کرے وغیرہ وغیرہ

ہمیں اس کا نفسی تجزیہ کرنا ہوگا کہ آخر کیوں اس کی نظموں میں ابہام پیدا ہوتا ہے۔ اس کے یہاں جنسی بے راہ روی نے جو بعض ذہنی الجھنیں پیدا کر دی ہیں اُن کا سراغ لگانا ہوگا۔ کیونکہ علاوہ ان مبہم نظموں کے انھوں نے بعض ایسی نظمیں بھی کہی ہیں جو فنی حیثیت سے بہت بلند اور دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کی نظموں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن خیر یہ تو ایک دوسری بحث ہے ہمیں تو صرف یہاں یہ دیکھنا ہے کہ اُردو شاعری کی تدریجی ترقی میں ابہام بھی آج ایک منزل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعضوں نے اس کے پیش کرنے میں زیادتی سے بھی کام لیا ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے یہ فنکار کی کمزوری ہے اس میں جدید شاعری یا جدت کا کوئی قصور نہیں۔"

صفحہ ۲۲۵ پر دستِ صبا پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

"اس کے موضوعات کچھ ایسے نئے نہیں ہیں۔ لیکن حالات نے انھیں بڑی حد تک جدت سے ہمکنار ضرور کر دیا ہے۔ ان موضوعات میں کچھ ایسی وسعت اور ہمہ گیری بھی نہیں ہے۔ لیکن احساس کی شدت۔ جذبے کے خلوص اور عمل کی خواہش نے اس میں ایک وسعت اور ہمہ گیری ضرور پیدا کر دی ہے۔ اس میں فکر کی وہ گہرائی اور تخیل کی وہ بلند پروازی بھی ایسی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ جس سے شاعری کی محراب میں عظمت کا چراغ روشن ہوتا ہے لیکن مادی نظریۂ حیات حقیقت پسندانہ زاویۂ نظر اور عملی نقطۂ خیال نے نقشِ فریادی کے مقابلے میں اس میں فکر کی گہرائی اور تخیل کی بلند پروازی کسی قدر زیادہ ہی پیدا کر دی ہے"

تمام کتاب اسی اندازِ بیان کی رہینِ منت ہے ——— اسی تضادِ آرا کی ایک اور مثال صفحہ ۲۶۸ پر بھی ملتی ہے:-

"بعض ادیب اور شاعر اپنے مزاج میں ایک شدت اور تیزی رکھتے ہیں دوسرے تھک کر بیٹھ جانے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے شکست خوردہ ذہنیت جدید اُردو شاعری میں موجود ہے۔ اور اس نے حالات کی ترجمانی میں عجیب عجیب صورتیں اختیار کی ہیں۔ راشد کی مثال ہمارے سامنے ہے اس کی ذہنیت شکست خوردہ ذہنیت ہے۔ وہ زندگی سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اور اس کی تلخیوں کو صنفِ نازک کی کیفِ ہم آغوشی اور شرابِ ناب کی لہروں کے سرور میں کھو کر بھلا دینا چاہتا ہے....."

اس جگہ وہ راشد کی شاعری کو زوال پسند اور نقصان دہ قرار دیتے ہیں مگر راشد پر جو باب لکھا ہے اس میں وہ انھیں وجوہ کی بنا پر راشد کی تعریف کرتے ہیں:-

"راشد کی شاعری میں اس جنسی جذبے کی ترجمانی اور عکاسی کا محرک تعیش پسندی کا خیال نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق انسانی زندگی کے بنیادی تقاضوں سے ہے۔ اور راشد نے اس جذبے کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی اسی طرح کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا زاویۂ نظر انسانیت اور انسان دوستی کا زاویۂ نظر ہے۔ اُن کی شاعری کے خاصے بڑے حصے میں جنسی جذبے کی اہمیت کو واضح کیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی اس میں ذہنی تعیش کا پتہ نہیں چلتا۔ برخلاف اس کے یہ ایک مہذب صورت میں نظر آتا ہے۔ اور یہی اس کی صحت مندی کی دلیل ہے" (صفحہ ۴۴۴)۔

اس تمام تضادِ آرا اور گنجلک معانی کے علاوہ "جدید اُردو شاعری" اعادۂ دلائل سے پُر ہے۔ اس کا ہر باب گذشتہ تمام ابواب میں دئے گئے دلائل کو دُہراتا ہے۔ ہر باب کا نصف حصہ پہلے کی گئی بحث کا خلاصہ پیش کرتا ہے جو اکثر متضاد بھی ہوتا ہے،

گنجلک بھی — اور قاری بے چارہ الجھن آمیز بھول بھلیوں میں پھنس کے رہ جاتا ہے۔

مجھے اس بات سے اختلاف نہیں کہ جدید اردو شاعری آزاد اور حالی سے شروع ہوتی ہے نہ ہی ڈاکٹر عبادت بریلوی کی اس بات سے کہ صحیح طور پر جدید اردو شاعری فیض اور راشد ہی سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن وہ صفحہ ۵۶۶ پر تحریر فرماتے ہیں "گزشتہ ۱۹۴۳ء سے جدید اردو شاعری کا زوال شروع ہو جاتا ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہاں وہ نہ صرف خود اپنی تردید کرتے ہیں بلکہ حقائق کی بھی۔ تاہم وہ سنہ ۱۹۴۳ء سے سنہ ۱۹۵۰ء کی شاعری کا نہایت مفصل جائزہ لیتے ہیں۔ انھوں نے اس شاعری کے پس منظر پر طویل بحثیں کی ہیں۔ یہاں پر وہ کسی حد تک حقائق سے واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ جدید شعرا جنسیات پر کیوں اتنی لے دے کرتے ہیں۔ [illegible] بڑے بڑے ماہرین نفسیات (فرائڈ اور اڈلر) کے نام گنواتے ہیں جس سے ان کا استدلال اور بھی مبہم اور گنجلک ہو جاتا ہے۔

گزشتہ دس برس کی شاعری سے ڈاکٹر صاحب بہت ناراض ہیں یہاں پر وہ ایک عظیم مفکر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اور نئے شعرا کی زوال پسندی کا ماتم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نئے شعراء نے حقیقت سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ نہ ہی یہ نئے شعرا رومانوی ہیں نہ ہی ان کی شاعری کسی نئے تجربے کا اظہار کرتی ہے۔ نیا تجربہ تو کیا؟ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ان کے ہاں داخلی تجربے کا بھی فقدان ہے۔ سب سے بڑھ کر ان شعرا کو زبان پر عبور حاصل نہیں نہ ہی انھیں زبان کی کوئی سمجھ ہے۔ کاش ڈاکٹر صاحب نے ٹھنڈے دل سے نئی شاعری کے مجموعوں کو یا رسالوں میں چھپی ہوئی نظموں کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی!

جدید اردو شاعری پٹی ہوئی آرا کا اظہار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کوئی نیا نقطۂ نظر یا کوئی نیا خیال پیش نہیں کیا نہ ہی کوئی نیا مواد جس کی روشنی میں نئی شاعری کو ایک عالمانہ اور صحیح تنقیدی رنگ میں دیکھا جا سکتا۔ نہ کتاب یہ ظاہر کرتی ہے کہ انھیں معلوم شدہ مواد کو سمجھنے اور اس کی تہ تک پہنچنے کی حد تک پوری واقفیت ہے۔ غزل پر جو باب لکھا گیا ہے وہ نہایت فرسودہ اور نامکمل ہے۔ اسی طرح اقبال پر جو تنقید کی گئی ہے وہ بھی اسی کمزوری کی ایک اور دلیل ہے۔ ساری کتاب میں فقط ایک ہی باب قابلِ ذکر ہے۔ وہ ہے حالی کی شاعری پر، مگر تشنگی کا احساس اس باب میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

جدید اردو شاعری، اردو میں اس تمام غلط سلط تنقید کی آخری حد ہے۔ جو اردو نقادوں نے انگریزی کے تتبع میں لکھی ہے۔ امید ہے کہ جو لوگ فنِ تنقید سے پوری اور صحیح واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ پڑھنے والوں کی طرف سے اپنی ذمہ داری محسوس کریں گے۔

بڑے ادیب

اس عنوان کے تحت، ہم بڑے ادیبوں کی
نگارشات کے بارے میں، صحت مندانہ مگر
مخالف و موافق آرا پیش کیا کریں گے۔ (ادارہ)

نئی کتابوں کا تعارف

سفرنامہ مسافرانِ لندن

۱۸۶۸-۶۹ء میں انگریزی حکومت نے ہندوستان کے ہونہار نوجوانوں کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کچھ وظیفے دینے منظور کیے اور ہر صوبے سے لائق طلبہ کو اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے انتخاب کیا۔ اس سلسلے میں یو۔ پی کی حکومت نے سرسید کے فرزند سید محمود کو اس وظیفے کا اہل قرار دیا۔ یہ سرکاری امداد آدھکتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہوئی اور اس بات کا باعث بن گئی کہ سرسید خود بھی بیٹے کے ساتھ ولایت جائیں اور اپنی یہ دیرینہ آرزوئیں پوری کریں۔

۱- وہ انگریزوں کے طرزِ تعلیم اور اصولِ تدریس سے واقفیت بہم پہنچا کر مسلمان بچوں کے لیے ایک اعلیٰ اسلامی درسگاہ قائم کریں۔

۲- انگریزی معاشرت و تہذیب میں جو اچھی باتیں دیکھیں، ان کو اپنے ہاں رائج کریں تاکہ حکمران قوم ان سے نفرت کی بجائے محبت کرنے لگے۔

۳- یو۔ پی کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے یورپین مصنفین اور عیسائی پادریوں کی دیکھا دیکھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے سوانح حیات اور حضور کے کارناموں پر جو تنقیدی کتاب "لائف آف محمد" چار جلدوں میں لکھی تھی اس کا جواب لکھیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک سرسید انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں سے خود وہ کتابیں نہ دیکھ لیتے جو ہندوستان میں ناپید تھیں۔

یہ سفر یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو بنارس سے شروع ہوا اور سرسید نے اپنے سفر کے دلچسپ کوائف خطوں کے ذریعے اور مضامین کے ذریعے اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں چھپوانے شروع کیے مگر اس کا ردِ عمل الٹا ہوا یہاں کے مسلمانوں میں کھلبلی مچ گئی لوگ اپنی پستی اور انگریزوں کی برتری کے واقعات برداشت نہ کر سکے اور یہ افواہ سارے ہندوستان میں پھیل گئی کہ "سرسید ولایت جا کر کرسٹان ہو گیا ہے اور اپنے گمراہ کن مضامین کے ذریعے ہندوستان کے سادہ لوح مسلمانوں کو بھی کرسٹان بنانا چاہتا ہے"۔ اس بنا پر سرسید نے اپنا سفرنامہ چھپوانا بند کر دیا۔ پھر بھی جب کبھی موقعہ ملتا کوئی نہ کوئی بات اہلِ وطن کے کانوں میں ڈال دیتے۔

اس طرح مختلف مضامین اور خطوط کی صورت میں بکھرا ہوا یہ سفرنامہ مدت کے بعد شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے بڑی محنت اور تلاش سے یکجا کیا ہے، اس پر مقدمہ لکھا ہے، چھوٹی چھوٹی ذیلی سرخیاں تجویز کی ہیں، جگہ جگہ مفید حواشی لکھے ہیں۔ فہرست مضامین

تیار کی ہے، بعض الفاظ کے رسم الخط میں جو تبدیلیاں ہو چکی ہیں انھیں پڑھنے والوں کی آسانی کے لیے بدلا ہے، مولانا حالی نے سرسید کے سفرنامے کا جو خلاصہ حیاتِ جاوید میں دیا تھا یا سرسید نے اپنی بعض تقریروں میں اس سفر کی جزئیات پر جو روشنی ڈالی تھی یا بعض خطوں میں کوئی کام کی بات لکھی تھی جو اس سفر سے تعلق رکھتی تھی ان کو ضمیموں کی صورت میں شاملِ کتاب کیا ہے۔ اس طرح یہ سفرنامہ (تقریباً) مکمل بھی ہو گیا ہے اور مفید و دلچسپ بھی ——— چونکہ بکھرے ہوئے خطوں سے اسے سفرنامہ کی حیثیت دی گئی ہے۔ اس لیے اس میں خالصتاً سفرنامہ والی شان نہیں۔ کہیں کہیں سلسلہ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے باوجود فاضل مؤلف کی یہ کوشش بڑی قابلِ قدر ہے۔ ۲۲×۱۸/۸ سائز کے ۲۹۵ صفحات کی یہ کتاب اردو ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت فی جلد تین روپے ہے جو زیادہ نہیں۔ مجلسِ ترقی ادب۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔

حیاتِ سعدی

مولانا حالی اردو زبان میں سوانح نگاری کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید تین قابلِ ذکر سوانح عمریاں لکھیں۔ حیاتِ سعدی کی تالیف سے وہ ۱۸۸۵ء میں فارغ ہوئے اور یہ کتاب ۱۸۸۶ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کے بعد مختلف مقامات کے کتب فروشوں نے دھڑا دھڑ اس کے غلط سلط ایڈیشن چھاپے اور کتاب کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اس عقیدت کی بنا پر جو انھیں مولانا حالی کی ذات سے ہے اس ادبی اور تنقیدی کتاب کے پہلے ایڈیشن کے مطابق اس کا نیا ایڈیشن نہایت صحت اور صفائی کے ساتھ مرتب کیا ہے جو مجلس ترقی ادب لاہور نے نہایت اہتمام کے ساتھ لوہے کے ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ شروع میں مؤلف کے مختصر حالات بھی دیئے ہیں۔ جدید تحقیقات کے پیشِ نظر مولانا حالی کے بعض فیصلوں کو جھٹلایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود حیاتِ سعدی بڑی قابلِ ذکر کتاب ہے۔ کتاب کا حجم ۲۴۴ صفحات اور قیمت دو روپیہ پچاس پیسے ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مجلسِ ترقی ادب۔ نرسنگھ داس گارڈن۔ کلب روڈ۔ لاہور۔

سیرت ابن ہشام

علامہ ابو محمد عبدالمالک بن ہشام کی کتاب سیرت ابن ہشام کو دنیائے اسلام میں خاص شہرت اور مقبولیت حاصل ہے۔ پرانے اور نئے سیرت نگاروں میں ایک بھی ایسا نہیں جس نے اس کتاب سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ کئی دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی اس کے ترجمے ہوئے جو اپنے اپنے زمانے کی ضرورت اور تقاضے پورے کر کے ختم ہو گئے اور نایاب ہیں۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اردو کے تمام ترجموں اور اصل عربی کتاب کو سامنے رکھ کر اس کا ایک جدید ایڈیشن مرتب کیا ہے جس کی چند خصوصیات یہ ہیں:۔

(۱) زبان عام طور پر سادہ و سلیس ہے۔

(۲) مترجم کو جہاں مصنف سے اختلاف ہے، حاشیے میں ظاہر کر دیا گیا ہے اور جہاں زیادہ تفصیل اور تشریح کی گنجائش نہ تھی وہاں ان کتابوں کے نام لکھ دیئے ہیں جن میں اس مسئلے کے متعلق مکمل بحث ہے۔

(۳) اصل عربی کتاب میں جہاں جہاں قرآن کریم کی آیات، ان کی تفسیر اور شعرائے عرب کے بے شمار شعر آتے تھے، مترجم نے

سیرت کی حد تک ایک آدھ آیت رکھ کر باقی آیات کے متعلق لکھ دیا ہے کہ قرآن پاک کی فلاں فلاں سورت ملاحظہ فرمائیں۔ اس سے نفسِ مضمون میں تو کوئی فرق نہیں پڑا، البتہ کتاب میں ایک حد تک اختصار ہو گیا ہے۔

(۴) صحابہ کرام اور مقامات کے ناموں کی صحت کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔

(۵) ابن ہشام ایک واقعہ بیان کرتے کرتے اسے چھوڑ کر فوراً دوسرا واقعہ بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس کو ختم کر کے پھر باقی واقعہ لکھتا ہے۔ اس سے قاری کے ذہن میں سخت اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ مترجم نے اسے بدل کر سارا واقعہ ایک ہی جگہ بیان کرنے کے بعد دوسرا واقعہ شروع کیا ہے۔

غرض جہاں تک مترجم کے امکان میں تھا، انھوں نے اس کتاب کو بہتر صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے اسے قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

کتاب ۱۸×۲۲ سائز کے ۶۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت نہایت باریک اور گنجان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نامۂ مبارک کا عکس بھی زینتِ کتاب ہے جو حضورؐ نے دعوتِ اسلام کی غرض سے مقوقس والیِ مصر کو بھیجا تھا۔ جلد مضبوط اور گرد پوش جاذبِ نظر ہے۔ قیمت دس روپے۔ مقبول اکیڈمی شاہ عالم مارکیٹ لاہور سے مل سکتی ہے۔



درندگی کے دور میں
خونخوار آئین زندگی!

گھنے تاریک جنگل۔ اونچے پتھریلے پہاڑ۔ انوکھے جانور، دیو ہیکل چرندے، خونخوار درندے، خوفناک پرندے، خون آلود ناخن، لہو بھرے جبڑے، موت کے پنجے۔ غیر ذوی العقول، تنازع للبقا، چیخ، چنگھاڑ، لڑائیاں۔

تغیرات، تغیر حالات۔ قبل تاریخ کے جاندار، تغیر ناپذیر۔ حیوانات و نباتات کی ہلاکت، تحلیل و تجزیہ۔ خاک کے ڈھیر، خاک پر ڈھیر۔ تہ پر تہ۔ بے پناہ فشار، دوزخ کی گرمی..... تیل کی تولید۔

انسان کا درود۔ سست نشوونما، دھیمی دھیمی ترقی۔ زیر زمین ذخیرے۔ ذخیروں کے سوتے۔ ترقی کے سرچشمے۔ انسان کی کوشش، ترقی کے چشمے اُبلے۔ روز افزوں ترقی۔ تیل کا زمانہ۔ تند و تیز تقدم۔ صنعت، جدید طریقۂ زراعت۔ خوشحالی۔ یہ سب تیل ہی کا عطیہ ہے۔

برما شیل کا آپکی زندگی سے گہرا تعلق ہے

برما شیل آئل سٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(انگلستان میں قائم شدہ)
کمپنی کے ممبروں کی ذمہ داری محدود

BSP